مکاتیب
ابوالکلام آزاد

Editor's Gift:

مکاتیب ابوالکلام آزاد

مرتبہ

ابو سلمان شاہجہانپوری

(سکریٹری آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی)

اُردو اکیڈمی سندھ

کراچی حیدرآباد لاہور

فہرست

کتابت ـــــــــــــ محمد یعقوب بلوچ
طباعت ـــــــــــــ باب الاسلام پرنٹنگ پریس۔ کراچی
اشاعت ـــــــــــــ فروری ۱۹۶۸
تعداد ـــــــــــــ ایک ہزار

قیمت:
اکیڈمی لائبریری ایڈیشن ۷ روپے
مجلد ۱۰ روپے

دیباچہ

مجموعہ کی خصوصیات اس کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں مرتب کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کا فیصلہ تو خود قارئین کرام فرمائیں گے لیکن اس مجموعہ میں چند ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ مثلاً

اس مجموعہ میں سب سے طویل زمانہ کے مکاتیب ہیں۔ یعنی پہلا مکتوب ۱۹۰۰ء کا ہے اور آخری ۱۹۵۷ء کا ہے۔

سب سے زیادہ لوگوں کے نام مکاتیب ہیں۔

اس لئے طرزِ نگارش کے کئی اسٹائل ملتے ہیں۔

مطالب و مقاصد اور مباحث کے بہت سے دائرے بنتے چلے گئے ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے قلم سے اس مجموعہ میں سب سے زیادہ مکاتیب ہیں۔

چند کے سوا تمام مکتوب الیہم سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

اس مجموعہ کے مطالعہ سے مکاتیب ابوالکلام کے دوسرے مجموعوں کے متعلق ضروری معلومات ہو جاتی ہیں اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس مجموعہ کی کیا حیثیت اور کتنی اہمیت ہے۔

اس مجموعہ کے مطالعہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کے کتنے مکاتیب کس مجموعہ میں اور کس کے نام ہیں۔ نیز یہ کہ مکاتیب مولانا مرحوم کے قلم سے ہیں یا ان کے کسی سکریٹری کے قلم سے۔

اس مجموعہ میں جن اشخاص، کتب و رسائل اور مقامات کا تذکرہ آیا ہے انکا اشاریہ

اعتذار

مولانا ابوالکلام آزاد" کے مکاتیب کا یہ مجموعہ میں نے سنہ ۶۳ء کے اواخر میں مرتب کرکے اشاعت کے لئے دے دیا تھا خیال تھا کہ فروری ۱۹۶۴ء میں حضرت مولانا کی چھٹی برسی کے موقع پر شائع ہو جائے گا لیکن یکے بعد دیگرے موانع پیش آتے رہے اور چار سال کے بعد مولانا کی دسویں برسی کے موقع پر یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جب میں نے یہ مجموعہ مرتب کیا تھا میری علمی زندگی کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ اس وقت میری معلومات بھی محدود تھیں، ترتیب و تدوین کا بھی کوئی سلیقہ نہ تھا اور نہ لکھنے ہی کا ڈھنگ آتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب میں ترتیب و تدوین کا ماہر اور صاحب اسلوب ہو گیا ہوں تاہم اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اس دوران میں، میں اپنے مقصد سے غافل نہیں رہا اور اہل علم سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہا ہوں۔ اس لئے میرا یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ سمجھا جائے کہ اگر یہ مجموعہ میں اب ترتیب دیتا تو اس کی شکل اس سے بہت کچھ مختلف ہوتی۔ بعض باتیں جن پر میں نے زور دیا ہے شاید آج میں ان سے بالکل صرف نظر کر لیتا یا ان پر اتنا زور نہ دیتا۔ زبان و بیان کی بھی وہ اغلاط نہ ہوتیں جن سے چار سال قبل میں اپنے قلم کو محفوظ نہ رکھ سکا تھا۔

اب اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ قارئین کرام سے اس مجموعے کی ترتیب، زبان انداز بیان وغیرہ کی غلطیوں اور کمزوریوں سے صرف نظر کرنے کی التجا کروں۔ اور آئندہ ایڈیشن اس سے عمدہ ترتیب اور بہترین صورت میں پیش کرنے کا یقین دلاؤں۔

ابو سلمان شاہجہانپوری

۲۲ فروری ۱۹۶۸ء

بنیاد کن جذبات و واقعات پر مبنی تھی۔ اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں نے کسی شخص کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جن افکار وخیالات کا حامل تھا، عملی زندگی میں وہ جو مشاغل رکھتا تھا، سیاسی معاملات میں اسکا جو مسلک تھا وہ غلط ہو یا صحیح اس سے آپ اتفاق کریں یا اختلاف۔ میں نے اس کو جیسا پایا، اسی طرح بیان کر دیا۔ اس کے بغیر تذکرے شامل کرنے کا مقصد بھی پورا نہ ہوتا تھا۔

مجموعوں کی حیثیت اور ان کی اہمیت کے بارے میں مرتب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن مکاتیب ابوالکلام کے بارے میں جو معلومات اس مجموعہ میں ملتی ہیں شاید اس سے انکار نہ کیا جا سکے۔ لیکن یہ تمام طالب علمانہ سعی وکاوش ہے اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کیا جانا چاہئے۔

جناب علاؤالدین خالد صاحب (مالک اردو اکیڈمی سندھ، کراچی) کو مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی سے جو تعلق خاطر ہے صرف اس چیز نے انہیں اس مجموعہ کی اشاعت کا سروسامان کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ چیز مرتب کے تعارف اور ہمت افزائی کا باعث بن رہی ہے۔ خالد صاحب کی اس عنایت کے لئے شکر گزار ہوں۔

اس مجموعہ کی ترتیب میں مولانا غلام رسول مہر صاحب کی دعائیں اور ان کے مشورے شامل رہے ہیں۔ انہوں نے بہ کمال شفقت حصہ مکاتیب ملاحظہ فرمایا۔ زبان وبیان کی بہت سی اغلاط درست فرمائیں اور تاریخی تسامحات کی نشاندہی فرمائی۔ مجھے امید ہے کہ زبان وبیان اور تاریخ کی بڑی بڑی اغلاط ضرور دور ہو گئی ہیں۔ مولانا مہر صاحب کی اس عنایت خاص کے لئے دل سے شکر گزار ہوں

ابو سلمان شاہجہانپوری

بنا دیا گیا ہے۔ اس لیے کسی چیز کے تلاش کرنے میں چند لمحوں سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔

آسانی کے لئے اس مجموعہ کو چند حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے

حصہ اوّل:۔ اس میں مولانا مرحوم کے مکاتیب کے مجموعوں کا بشمول مجموعۂ ہذا تعارف کرایا گیا ہے۔

حصہ دوم:۔ یہ حصہ مولاناؒ کے مکاتیب اور چند دیگر تحریرات پر مشتمل ہے۔ ایک مکتوب الیہ کے نام تمام مکاتیب ایک جگہ درج کئے گئے ہیں اور ہر مکتوب الیہ کو اس کے نام مولانا کے پہلے خط کی تاریخ و سن کے تقدم کی بنیاد پر جگہ دی گئی ہے آخر میں دیگر تحریرات ہیں۔

حصہ سوم:۔ اس حصہ میں اس مجموعہ کے مکتوب الیہم کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس سے قبل جو مجموعے چھپ چکے ہیں ان کے مکتوب الیہ معروف شخصیتیں اور ان سے مولانا کے تعلقات و روابط معلوم و مشہور ہیں۔ بعض مجموعوں میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے تعلقات اور ان کی نوعیت کا مفصل تذکرہ ہے اور بعض میں اشارات موجود ہیں۔ لیکن اس مجموعہ کے اکثر مکتوب الیہ ایسے ہیں جو عام طور پر متعارف نہیں۔ مولاناؒ سے ان کے تعلقات اور ان کی نوعیت سے بھی عام طور پر واقفیت نہیں۔ میں نے ہر مکتوب الیہ کے حالات و سوانح اور مولانا مرحوم سے اس کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

بعض حضرات کے حالات کی فراہمی کے لیے مجھے دشوار گزار مراحل طے کرنا پڑے ہیں اور مختلف وادیوں کی خاک چھانی پڑی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ناکام نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ یہ تمام کوششیں اور کاوشیں افادیت سے خالی نہ ہوں گی۔ اس سے یہی معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا آزادؒ کے مخاطب کون لوگ تھے۔ کس طبقے سے تعلق رکھتے تھے علمی اور عملی زندگی میں ان کا کیا مقام تھا۔ مولانا آزاد سے ان کی دلچسپی۔ عقیدت اور تعلق کی

حصہ اوّل

ایک تعارف

غبارِ خاطر

"غبارِ خاطر" نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام مولانا ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ اس کا شمار اگرچہ مولانا آزاد کی اول درجہ کی تصنیفات میں نہیں ہوتا اور علمی اعتبار سے ترجمان القرآن، اور تذکرہ کا ہم پلہ نہیں لیکن ادبی اعتبار سے غبار خاطر اردو کی عظیم تصنیف ہے۔ غبار خاطر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ مولانا کی کسی تصنیف کو حاصل نہ ہو سکی۔ بلکہ اردو کی پوری تاریخ تصنیف و تالیف میں کوئی کتاب ایسی پیش نہیں کی جا سکتی جسے غبار خاطر جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ہو۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۵ ہزار کی تعداد میں "حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی" نے مئی ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایڈیشن ختم ہو گیا دوسرے ہفتہ میں کتاب کمیاب ہو گئی لیکن ملک کے اندر مانگ بدستور باقی تھی۔ اگست میں اس کا دوسرا ایڈیشن بازار میں آگیا۔ انہی ایام میں اس کا ایک ایڈیشن غیر قانونی طور پر حیدر آباد دکن میں شائع کر دیا گیا لیکن یہ ایڈیشن بھی چند ماہ کے اندر ختم ہو گیا۔ غبار خاطر کا تیسرا ایڈیشن ایک خط کے اضافہ کے ساتھ مکتبہ "احرار" لاہور نے شائع کیا۔ تقسیم ملک کے بعد پاک و ہند سے اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

پاک و ہند جیسے کم تعلیم یافتہ ممالک میں جہاں کسی کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن بھی کئی برسوں میں نکلتا ہو کسی کتاب کا چند ماہ کے اندر تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں نکل جانا کتاب کی مقبولیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

فہرست

یہ کہنا مشکل ہے کہ کس قسم کے مکاتیب زیادہ اہم ہیں۔ پہلی قسم کے مکاتیب اگرچہ علمی موضوعات اور فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان میں بھی مولانا کی انفرادیت، انانیت، ذوق و رجحان طبع، عقائد و نظریات، اخلاق و عادات اور ان کی نفسیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات ملتی ہیں۔ دوسری قسم کے مکاتیب میں مولانا مرحوم نے اپنی گرفتاری، قلعہ احمد نگر کی زندگی، وہاں کے حالات، اپنی ابتدائی زندگی، تعلیم و تربیت، خاندان تعلیمی اور گھر کا ماحول، افکار و عقائد اور ذوق و معمولات روز مرّہ پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پہلی قسم کے مکاتیب بھی مولانا آزادؔ کی زندگی سے اتنا قریبی اور گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کے کسی پہلو پر قلم اٹھایا جائے تو ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

غبار خاطر کے مکاتیب میں مستقل یا ضمنی طور پر علمی و ادبی، مذہبی و سیاسی، تاریخی و نظریاتی مباحث اس قدر آگئے ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔ لیکن حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں اصل ابوالکلام کو تلاش کرنا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان علمی و ادبی تاریخی و نظریاتی اور فلسفیانہ مباحث میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے خود اپنے ذوق و افکار کی داستان سرائی کی ہے۔

دیباچہ میں مکاتیب کی حیثیت اور ان کی اشاعت کے پس منظر کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ تمام مکاتیب نج کے خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کئے جائیں گے۔ لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چونکہ ان کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے۔ اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں

غبار خاطر کی رائلٹی کے طور پر حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے تیرہ ہزار تین سو تینتیس روپے پانچ آنے تین پائی مولانا کو ادا کئے گئے تھے۔ پہلا ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ سائز، ۳۴۰ صفحات اور طویل و مختصر کل ۲۴ مکتوبات پر مشتمل تھا۔

ایک خط گرفتاری سے قبل کا ہے جو کلکتہ سے بمبئی جاتے ہوئے دوران سفر میں تحریر کیا تھا۔

انیس مکتوبات ۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء اور ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کی درمیانی مدت کے قلعۂ احمد نگر کی اسارت کے زمانے کے ہیں۔

دو مختصر اور ایک کسی قدر مفصل یعنی تین خط رہائی کے بعد کے ہیں۔

قلعہ احمد نگر کی قید و بند کی زندگی کے تین برس میں بیس صحبیں نواب صدر یار جنگ مرحوم کی خیالی صحبت میں بسر ہوئیں۔ غبار خاطر اس کی یادگار ہے۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں زمانہ قید کے انیس مکتوبات تھے۔ رائلٹی کی رقم کو اگر انیس مکتوبات یا انیس صبحوں پر تقسیم کیا جائے تو سات سو روپے سے زائد ہر صبح کی بزم آرائی کا حاصل ہوتا ہے اور اگر کتاب کی سطروں پر رائلٹی کو تقسیم کیا جائے تو تقریباً ڈھائی روپے فی سطر پڑتے ہے۔ پس یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کی کوئی کتاب اتنی مقبول نہیں ہوئی نہ کسی اردو مصنف نے غبار خاطر جیسی مختصر اور اپنی دوسرے درجے کی تصنیف کی اتنی بڑی قیمت حاصل کی ہو گی۔

اب ہم غبار خاطر کی ادبی اور اس کی معنوی قدر و قیمت کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ موضوع اور مطالب کے لحاظ سے ان مکاتیب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ مکاتیب جو کسی علمی، ادبی مسئلہ یا فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۔ وہ مکاتیب جو مولانا آزاد کی ذات اور ان کے گرد و پیش سے تعلق رکھتے ہیں۔

کے نام مولانا آزادؔ کا خط ان کی نظر سے گزر جاتا تو انھیں ہرگز یہ دھوکا نہ ہوتا۔ مولانا آزادؒ اس خط میں اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالبؔ کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیں گی؟

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و اَلم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری کوئی وادی ایسی نہ تھی جس کی بے شمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دل پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن و ہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامنِ دل مالامال نہ ہوا ہو۔ بحدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معانی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں۔

مازلت انزل فی ودادك منزلاً
تتحیّرا لالباب عند نزولها!

لیکن افسوس! جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا اس نے شاید سر و سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد و محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

کم ابدنا ذاك الزّمان بعدح
فشغلنا بذمّ هٰذا الزّمان"

(نقشِ آزاد۔ صفحہ ۱۵۷-۱۵۸)

جس حالت میں یہ قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے اسی حالت میں
طباعت کے لیے دے دیئے گئے۔ نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

نسخۂ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کہ ایں نسخہ مجزا ماند!

ہم یہاں غبار خاطر کے مقدمہ کی نسبت خاص طور پر چند الفاظ کہنا چاہتے ہیں۔ غبار خاطر کے مکاتیب کی طرح اس کا مقدمہ بھی شائقین ادب کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ مقدمہ پڑھتے ہوئے ابوالکلام کے قلم کا دھوکا ہوتا ہے۔ پورا مقدمہ اسی مخصوص طرز نگارش میں لکھا گیا ہے جو غبار خاطر کی سب سے بڑی ادبی خصوصیت سمجھی گئی ہے۔ لیکن چونکہ مقدمہ کا ایک موضوع حضرت مولانا کی ذات ہے اور اس میں مولانا کے علم و فضل کے متعلق اشارات اور ان کی مختلف و متضاد حیثیتوں کا ذکر عقیدت مندانہ انداز بیان میں کیا گیا ہے اس لیے یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ واقعی اجمل خاں صاحب کے قلم سے ہے۔

ایک فاضل تبصرہ نگار نے مقدمہ کی اسی ادبی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا تھا اور پھر خود ہی ان الفاظ میں مقدمہ کو "کلام ابوالکلام" تسلیم نہ کرنے کی توجیہ پیش کی۔

"بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ دیباچہ میں مولانا کی ذات گرامی کے متعلق جذبۂ عقیدت کا جو وفور ہے اگر وہ نہ ہوتا تو ارباب نظر کو یہ دھوکا ہوتا کہ نام اگرچہ اجمل خاں کا ہے۔ کلام ابوالکلام ہی کا ہے۔" [۱]

فاضل تبصرہ نگار نے مقدمہ کو "کلام ابوالکلام" تسلیم نہ کرنے کی جو توجیہ بیان کی ہے اور جو استدلال پیش کیا ہے وہ منطقی اعتبار سے چاہے جس درجہ قوی ہو اور مضبوط ہو لیکن حقیقت پھر بھی یہی ہے کہ مقدمہ واقعی "کلام ابوالکلام" ہے۔

محترم تبصرہ نگار کی حیرت اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن اگر مولانا غلام رسول مہر صاحب

---

[۱] ممتاز حسن صاحب "قومی زبان" کراچی - بابت ۱۵ / اکتوبر ۱۹۴۹ء

ان کی ایک زندگی میں بہت سی زندگیاں جمع ہو گئی ہیں ؎
وہ اپنی ذات سے اِک انجمن ہیں"

بہرحال اس میں نہ تو کوئی حیرت میں ڈالنے والی چیز ہے نہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ مقدمہ علاءالدین خالدؔ صاحب (یکے از مالکانِ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی) کی فرمائش و اصرار پر لکھا گیا تھا۔ ابتداء میں "غبارِ خاطر" پر مقدمہ لکھنے کا خیال مولانا کو نہ تھا لیکن جب خالدؔ صاحب نے ایسی تحریر کے لئے اصرار کیا جس میں "غبارِ خاطر" کے اسلوبِ نگارش اور اس کی علمی و ادبی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہو نیز آزاد شرو آنی تعلقات کا ذکر کیا گیا ہو۔ مولاناؒ نے ان کی نیازمندانہ عرض و گزارش اور اصرار سے مجبور ہو کر قلم اٹھایا۔ لیکن مقدّمے کے اندازِ بیان و مباحث کے پیشِ نظر اجملؔ خاں کے نام سے۔

علاءالدین خالدؔ صاحب منشی محمد دین صاحب مرحوم کے پوتے ہیں۔ منشی صاحب مرحوم عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ ترجمان القرآن پہلی جلد، طبع اوّل کی کتابت انھیں نے کی تھی۔ ایک طرف تو کتابت کرتے دوسری طرف علوم و معارفِ قرآنی پر مولاناؒ سے گفتگو فرماتے۔ اگرچہ مولانا آزادؒ سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن مولاناؒ کا حد درجہ احترام فرماتے مولانا بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اسی نسبت سے مولانا آزادؒ خالدؔ صاحب کو عزیز رکھتے تھے پھر انھوں نے اپنی نیازمندی اور اخلاص و محبت کی بناء پر مولانا مرحوم کے دل میں جگہ پیدا کرلی۔ مولاناؒ ان سے اپنے عزیزوں جیسا برتاؤ کرتے تھے "غبارِ خاطر" کا مقدّمہ انھیں کے اصرار کا نتیجہ ہے۔ "غبارِ خاطر" کا اشتہار بنانے کی ضرورت پیش آئی اور "غبارِ خاطر" کے اسٹائل میں اشتہار کی عبارت تحریر نہ کر سکے تو مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی مشکل کا حال سنایا۔ مولانا مسکرائے اور قلم اٹھا کر اشتہار کے لئے ایک عبارت لکھ دی اور جس طرح مقدّمہ میں اجملؔ خاں کا قلم مستعار لے کر اپنے متعلق وہ تمام باتیں کہہ گئے تھے جو اجملؔ خاں ان کے متعلق کہہ سکتے تھے اسی طرح اشتہار میں

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ مختلف علوم و فنون میں اپنے مقام کی انفرادیت اور تحریر و انشاء کی گوناگوں خصوصیات سے خوب واقف تھے اس میں نہ مبالغہ ہے، نہ اپنے متعلق محض خوش فہمی نہ کوئی بات خلاف واقعہ ہے بلکہ ان کی شخصیت اور ان کے علم و فضل کا وہ اظہارِ واقعی ہے جس کا مخالف و موافق علماء و فضلاء نے اعتراف کیا ہے۔ بایں حقیقت وحالات اگر مولانا آزادؒ "غبار خاطر" کے مقدمہ میں اپنے متعلق ایک خاص انداز تحریر اختیار کرتے ہیں اور ایک دوسرے شخص کا نام ڈال دیتے ہیں اس لئے کہ موقع اور محل کا تقاضا یہی تھا اور جس کے مستعار قلم سے اپنے متعلق کچھ لکھتے ہیں وہ تمام باتیں اس شخص کے جذبات اور اس کی عقیدت مندیوں کے عین مطابق ہوں تو یہ کیوں کر تعجب خیز ہو سکتا ہے۔ مولانا مہر صاحب کے نام مولاناؒ نے اپنے متعلق حقائق کا اظہار فرمایا ہے اس کی روشنی میں مقدمہ "غبار خاطر" کی اس عبارت کو دیکھیں یا اس قسم کی دوسری عبارات پر نظر ڈالیں تو ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا کہ مولاناؒ نے یہ اپنے متعلق لکھا ہے:

"حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوتی ہے۔ مولانا ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، مفکر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، مدبر بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاسی جد و جہد کے میدان کے سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ عقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے اور علم و ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان عملی سیاسیات کی جد و جہد سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکے ہیں مگر مولاناؒ کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے گویا

اظہار میں ذرا بے احتیاطی ہو تو وہ محض ادعا بن جاتا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ افراط و تفریط کی راہ سے بچ کر جادۂ اعتدال اختیار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے سامنے ایک مثال موجود ہے، جس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن اس کے لئے محض علم و فضل ہی کی نہیں، بلند ترین اخلاقی کمالات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

اس انکشاف کے بعد اگر ہم غبارِ خاطر کے مقدمہ کا عنوان "مولانا آزادؒ خود اپنی نظر میں" قرار دیں تو یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ مقدمہ میں "غبارِ خاطر" کے مکاتیب کی ایک اہم خصوصیت، جس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ... "مولاناؒ کے دماغی پس منظر کی تلاش ہے" اس سلسلے میں فرماتے ہیں:۔

"ان مکاتیب پر نظر ڈالتے ہوئے سب سے زیادہ اہم چیز جو سامنے آتی ہے وہ مولاناؒ کا دماغی پس منظر (بیک گراؤنڈ) ہے۔ اس پس منظر پر افکار و احساسات کی تمام جلوہ طرازیوں نے اپنی جگہ بنائی ہے ...... یہی دماغی پس منظر ہے جس کی نوعیت سے ہر عظیم شخصیت کی عظمت کا اصل مقام دنیا کے آگے نمایاں ہوتا ہے۔ یہی کسوٹی ہے جس پر ہر انسانی عظمت کسی جا سکتی ہے اور یہی معیار ہے جو ہر انسان کی عظمت و پستی کا فیصلہ کر دیتا ہے ان مکاتیب میں مولاناؒ نے خود کوشش کی ہے کہ اپنا دماغی پس منظر دنیا کے آگے رکھ دیں اور اس لئے یہ غیر ضروری ہو گیا ہے کہ اس بارے میں بحث و نظر سے کام لیا جائے۔ میں صرف معاملہ کے اس پہلو پر اہلِ نظر کی توجہ دلانا چاہتا ہوں خود کچھ کہنا نہیں چاہتا۔"

مکاتیب میں تو مولاناؒ نے اپنا دماغی پس منظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور صرف اہلِ نظر کو توجہ دلائی ہے۔ بلاشبہ "غبارِ خاطر" کے مطالعہ کا یہ دلچسپ انداز ہے۔ مکاتیب کے مواد کے رنگ و روغن سے مولاناؒ کی زندگی کا ایک حسین مرقّع تیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مقدمہ میں مولاناؒ نے خود ہی اپنا حسین ترین مرقّع تیار کر دیا ہے۔

پبلشر کا برش مستعار لیا اور اس کے نقطۂ نظر سے "غبار خاطر" کے تعارف اور جس قسم کے رنگ و روغن سے اپنی تصویر کی ضرورت تھی، تیار کر دی۔ مقدمے کی طرح یہ اشتہار بھی ادبی حسن و دل آویزی کی بہترین مثال ہے۔

غرضیکہ اس انکشاف کے بعد "غبار خاطر" کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزادؒ ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ یہ بات باعثِ حیرت و تعجب نہیں کہ مولاناؒ نے خود اپنے علم و فضل اور سیرت و کردار کے بعض کمالات کو اور اپنے طرزِ نگارش کی بعض خصوصیات کو کس طرح موضوع بنایا ہے۔

ابھی تک مقدمہ کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے کہ یہ مولانا ابوالکلامؒ کے سکریٹری محمد اجمل خاں کے قلم سے ہے لیکن اب مقدمہ کے مطالعہ کا نقطۂ نظر بالکل بدل گیا ہے۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی نے مقدمہ میں اور بھی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس تحریر کی معنوی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اب یہ کسی ادیب کا محض مقدمہ، کسی عظیم شخصیت کا تعارف یا اس کو خراجِ عقیدت نہیں رہا بلکہ اب اس کا شمار دنیا کی چند عظیم خود نوشت سوانح میں ہوگا۔

اس مقدمہ سے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ایک اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ کہ مولاناؒ کو دوسرے کا نقطۂ نظر پیش کرنے میں کس درجہ کمال حاصل تھا اور وہ کس طرح اپنی شخصیت کو بھی موضوع بنا سکتے تھے اور اس کمال خوش اسلوبی کے ساتھ کو حیرت ہوتی ہے! اپنی شخصیت کو موضوع بنانا اور خود اپنے علم و فضل کا اظہار، اپنی سیرت و کردار اور اخلاقی کمالات کا بیان بہت مشکل موضوع اور پُرخطر راہ ہے۔ اس راہ سے کامیاب گزر جانا کسی شخص کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ اس راہ میں افراط و تفریط سے شاید ہی کوئی بچا ہو۔ یہاں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ اگر انکسار برتا جاتے تو اپنے علم و فضل و کمالات اور خدمات اور کارناموں سے انکار تک پہنچ جاتے ہیں اور

آتی ہے اور کاوشِ فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔

ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی کا جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔"

اس طرزِ تحریر کی ایک خصوصیت اور بھی ہے، وہ یہ کہ کسی تحریر کے ترجمہ میں یہ طرز اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ مترجم مصنّف کے خیالات کا پابند ہوتا ہے اور جہاں اظہارِ فکر و خیال کی آزادی نہ ہو یہ اسٹائل اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس مخصوص طرز میں لکھی ہوئی چیز کا کسی دوسری زبان میں بھی ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہاں بھی فکر و خیال کی پابندی کے ساتھ اسلوب اور صحتِ ذوق و معیار کی پابندی لازم ہوتی ہے۔ اس قسم کی تحریر کا ترجمہ کیا جائے تو اس کا حُسنِ عبارت اور دلکشی ختم ہو جاتی ہے۔ چونکہ غبارِ خاطر کے اکثر مکاتیب اسی طرز میں لکھے گئے تھے اس لئے مولاناؒ نے اس کے ترجمہ کی اجازت نہیں دی۔ مولاناؒ فرماتے ہیں :-

"چند مکاتیب کے سوا یہ تمام مکاتیب ایک ایسے اسلوب میں لکھے گئے ہیں کہ ان کا کسی دوسری زبان میں صحتِ ذوق و معیار کے ساتھ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کیا جائے گا تو اصل کی ساری خصوصیات مِٹ جائیں گی۔"

غبارِ خاطر (حصّہ دوم)

قلعہ احمد نگر کی اسارت کا سارا زمانہ مولاناؒ نے اپنے افکار کی ترتیب اور تصنیف و تالیف میں بسر کیا۔ مولاناؒ نے اس زمانہ میں کیا لکھا اور کس قدر لکھا اس کا کچھ اندازہ

جس پر آج تک اجمل خاں کے نام کا نقاب پڑا ہوا تھا۔ اگرچہ دیکھنے والے ہیں ۔ نقاب کسی اور ہی کو جلوہ فرما دیکھ رہے تھے۔ آج وہ وقت آگیا ہے کہ دیکھنے والے اس حسین کو دیکھیں اور بے نقاب دیکھیں۔

"غبارِ خاطر" میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ایک خاص اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے۔ یہ ایسا اسلوب ہے جس کی مثال اُردو ادب میں نہیں ملتی اور اگر ملتی ہے تو انھیں کے بعض مضامین میں جو "الہلال" میں شائع ہوتے تھے اس طرز نگارش کا مولاناؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادیا ہے کہ یہ طرز تحریر ہر قسم کے مضامین کے لئے مفید اور دلچسپ نہیں ہوسکتا اسی لئے مولاناؒ نے خود مختلف قسم کے مضامین میں مختلف طرز اختیار کئے ہیں۔ قلعۂ احمد نگر کے مکاتیب کے طرز تحریر اور دیگر خصوصیات کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :-

"اُنھوں نے نثر میں شاعری کی ہے اور جس مطلب کو ادا کیا ہے اس طرح کیا ہے کہ جدّتِ فکر نقش آرائی کر رہی ہے اور وسعتِ تخیّل رنگ و روغن بھر رہی ہے۔ اجتہادِ فکر اور تجدیدِ اسلوب مولاناؒ کی عام اور ہمہ گیر خصوصیت ہے۔ قلم اور زبان کے ہر گوشے میں وہ طرزِ عام سے اپنی روش الگ رکھیں گے اور الفاظ و تراکیب سے لے کر مطالب اور ادائے مطالب کے طرز تک ہر بات میں تقلیدِ عام سے گریزاں اور اپنے مجتہدانہ انداز میں بے میل اور بے لچک نظر آئیں گے۔ اُنھوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحبِ اسلوب رہے ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رَو کے نقشِ قدم پر چلیں۔ چنانچہ ان مکاتیب میں ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی اُبھری چلی

(مکتوب نسیم باغ، مورخہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء)

۲۹ر اگست ۱۹۴۳ء کے مکتوب میں بھی مولاناؒ اپنی اسی مصروفیت اور تمام وقت خامہ فرسائی کا تذکرہ فرماتے ہیں:-

"گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لئے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا صرف دو کتابیں میرے ساتھ گئی تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لئے رکھ لی تھیں اس طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہوگیا اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی، کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمدنگر کے بازار میں کمی نہیں تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے۔

در جنوں بے کار نہ تواں زیستن

آتشم تیز است داماں می زنم

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لئے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں۔"

لیکن یہ خامہ فرسائی کن موضوعات پر تھی اور وہ بعض مصنّفات کیا تھیں؟ کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ دنیائے علم وادب کے سامنے ابھی تک غبار خاطر ہی آئی ہے۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر غیر مشتبہ ہے کہ مولانا آزادؒ نے نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے علاوہ بعض دیگر احباب دائرہ کے نام بھی مکاتیب تحریر کئے تھے اور یہ مکاتیب بھی مکتوب الیہم تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ تمام مکاتیب سیاسی نوعیت کے تھے اور صدیق مکرم کے نام مکاتیب (غبار خاطر) کی ترتیب واشاعت کے وقت انہیں دوسرے مجموعہ کے لئے علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ غبار خاطر میں نواب حضرت شروانی مرحوم

اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر سیّد محمود صاحب سے ایک بار پوچھا گیا کہ قلعۂ احمد نگر میں مولانا کچھ لکھتے بھی تھے؟ اُنھوں نے فرمایا، ہاں! ان کا سارا وقت تصنیف و تالیف میں بسر ہوتا تھا لیکن کیا لکھتے تھے یہ معلوم نہیں۔ رموں کاغذ ان کے لئے منگوایا جاتا تھا۔" اگر ہم کسی دوسری شہادت کو زیرِ بحث نہ لائیں تو صرف "غبارِ خاطر" کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مکتوب نگاری کے ساتھ مولانا بعض مصنّفات کی ترتیب و تسوید میں بھی مصروف رہے اور یہ مصروفیت ۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ یعنی ان کی بیوی حضرت زلیخا بیگم کے سانحۂ ارتحال کے بعد بھی حسبِ معمول جاری رہی اور اس معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد طبع درماندہ، حال بھی رُک گئی اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنّفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیّر کے جاری رہیں۔ تاہم یہ حقیقت حال چھپائی نہیں جا سکتی کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچا لیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا،

دلِ دیوانہ دارم کہ در صحراست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں، مگر اب سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی، جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف بعض مصنّفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا۔ اور کسی تحریر و تسوید کے لئے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔"

اندر تھی برسوں کی مسافت حائل ہو گئی۔

کیف الوصول الی سعاد ودونہا
قلل الجبال وبینہن خیوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ راگست کو حسب معمول صبح تین بجے اُٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا میں نے چائے دم دی۔ فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے۔ اچانک وہ خط جو ۳ راگست کو دہلی میں لکھا تھا، اور کاغذات میں پڑا تھا۔ یاد آگیا بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں۔ اور آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں مگر رُوئے سخن آپ ہی کی طرف رہے چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوب قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی طبع واماندۂ حال دراز نفسی کرتی رہی۔ قیدخانے سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکاتیب کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں تاہم ذوق مخاطبت کی طلب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اُٹھا لیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا کبھی بال کبوتر سے۔ میرے حصے میں عنقا آیا:

ایں رسم وراہ تازہ زحرمانِ عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود!

کے نام آخری مکتوب ۲ر ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے (غبار خاطر، طبع ثالث) لیکن سیاسی مکاتیب کا آخری مکتوب ۲ر مارچ ۱۹۴۵ء کا تھا۔ سیاسی مکاتیب کا سِلسلہ تحریر غبار خاطر کے مکاتیب کے ڈیڑھ سال بعد تک جاری رہا۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سیاسی مکاتیب نہ صرف تعداد میں زیادہ ہوں گے بلکہ اس مجموعہ کی ضخامت بھی "غبار خاطر" سے کہیں زیادہ ہوگی۔

آصف علی مرحوم نے جو قلعہ احمد نگر میں مولاناؒ کے شریک اسارت تھے، علاء الدین خالد صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ تم نواب صدر یار جنگ کے نام مکاتیب لینے کی بجائے دوسرے مکاتیب جو سیاسی نوعیت کے ہیں، مولاناؒ سے حاصل کرو وہ زیادہ اہم ہیں۔ خالد صاحب بھی اس پر آمادہ تھے۔ مولاناؒ نے وہ مسودہ خالد صاحب کو دکھلایا بھی۔ لیکن پھر کہا کہ ان تحریرات کی حیثیت مکاتیب کے علاوہ بھی کچھ ہے اور اس لئے جب تک اس میں بعض مباحث بڑھا نہ دیئے جائیں ان کی اشاعت مناسب نہ ہوگی۔ یہ کہہ کر مولانا نے وہ مسودہ واپس لے لیا اور اس طرح ایک عظیم سیاسی تاریخی سرمایہ سے دُنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی۔

"غبار خاطر" کے مکتوب نسیم باغ مورخہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء سے جہاں قلعہ احمد نگر میں مولانا آزادؒ کی تصنیفی و تالیفی مشاغل پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بات بھی صاف واضح ہوجاتی ہے کہ "غبار خاطر" کا دوسرا حصہ سیاسی مکاتیب پر مشتمل تھا اور جب غیر سیاسی مکاتیب (غبار خاطر) کی اشاعت کا سروسامان کیا گیا تو ان مکاتیب کو علیحدہ کر لیا گیا۔ مذکورہ مکتوب نسیم باغ کے مندرجۂ ذیل اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:۔

"دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعے کے اندر محبوس تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ کے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قید خانے کے

"غبارِ خاطر" حصّہ دوم کا اب کوئی وجود نہیں۔

کاروانِ خیال

"کاروانِ خیال" کی عام شہرت مولانا آزادؒ کے مکاتیب کے مجموعے کی حیثیت سے ہے لیکن واقعتاً یہ مختصر رسالہ مولانا آزادؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، دونوں کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۶ء کے آخر میں شائع ہوا اور اس وقت سے اب تک ہندوستان و پاکستان سے اِس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میرے پیشِ نظر مکتبۂ احباب لاہور کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ اس کے مرتّب اور مقدّمہ نگار مولوی محمد عبد الشاہد خاں شروانی ہیں۔

"کاروانِ خیال" میں ستّرہ مکاتیب حضرت مولانا آزادؒ کے، دس مکاتیب حضرت مولانا شروانیؒ کے اور مولانا آزادؒ کا ایک خط مقدّمہ نگار کے نام بھی ہے اس طرح مولانا کے کُل اٹھارہ مکاتیب ہوتے ہیں۔ یہ مجموعہ اگرچہ "غبارِ خاطر" کے بعد شائع ہوا لیکن اس کے بعض مکاتیب "غبارِ خاطر" سے پہلے کے ہیں۔ "کاروانِ خیال" میں مولانا آزادؒ کے نو مکاتیب از ستمبر ۱۹۴۰ء تا جون ۱۹۴۲ء کے ہیں اور نو مکاتیب قلعہ احمد نگر کی رہائی کے بعد از جون ۱۹۴۵ء تا نومبر ۱۹۴۶ء کے ہیں۔ اس میں سے پانچ مکاتیب "غبارِ خاطر" میں بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ ایک مکتوب جو محمد عبد الشاہد خاں صاحب شروانی کے نام تھا وہ "مکاتیب امام الہند" میں بھی آ گیا ہے۔ اس طرح "کاروانِ خیال" میں مولانا آزادؒ کے صرف بارہ مکاتیب ایسے ہیں جو کسی دوسرے مجموعے میں موجود نہیں ہیں۔

کاروانِ خیال کے مکاتیب، غبارِ خاطر کے مکاتیب سے کسی اعتبار سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان خطوط سے بھی نہ صرف مولانا آزادؒ اور مولانا شروانی کے مخلصانہ تعلقات کا پتہ چلتا ہے بلکہ بہت سے تاریخی واقعات و تذکار سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ ان خطوط کی

اُوپر کے خط کشیدہ جملوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احمد نگر کے مخاطب صرف "صدیق مکرم" ہی نہ تھے بعض دیگر احباب و اعزّہ بھی تھے۔ نیز صدیق مکرم کے نام مکاتیب کی طرح احباب و اعزّہ کے نام مکاتیب بھی جمع ہوتے رہے تھے۔ اسی خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:۔

"آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا ہے ۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے اس مکتوب پر یہ داستان بے ستون و کوہکن ختم ہو جاتی ہے اگرچہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے

شمہ از داستانِ عشق شور انگیز ماست
این حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند!"

پھر اسی مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مکتوبات کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام لکھے گئے ہیں"

مولانا آزادؒ کے مکتوب کے مذکورہ بالا اقتباسات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "غبار خاطر" کا دوسرا حصہ سیاسی مکاتیب پر مشتمل تھا اس حصہ کا آخری مکتوب ۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کا تھا، نیز جب صدیق مکرم نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام مکاتیب شائع ہوئے تو ان کو علیحدہ کر دیا گیا تھا لیکن یہ مکاتیب کیا ہوتے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ محمد اجمل خاں صاحب کا بیان ہے کہ قلعہ احمد نگر کی اسارت کے زمانہ کی یادگار میں "غبار خاطر" اور "ذوالقرنین فی القرآن" کے سوا ہمیں کچھ نہ ملا۔

(دیباچہ ملفوظات آزاد)

اگرچہ یہ ایک تکلیف دِہ حقیقت ہے لیکن ہمیں اس حقیقت کو اب تسلیم کر لینا چاہیئے کہ

کاروانِ خیال کے پہلے مکتوب یعنی ۱۹۴۰ء میں مولانا آزادؒ نے مکتوب الیہ یعنی حضرت نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے از ۱۹۰۵ء تا ۱۹۲۰ء کی مختلف ملاقاتوں اور صحبتوں کی یاد تازہ کی ہے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا، ملاقات میسّر نہ تھی دل کی آرزومندیاں صفحوں پر بکھیر دیں۔ مولاناؒ ہی کے الفاظ سے محظوظ ہولیں تو آگے چلیں۔ غور فرمایئے ایک ایک لفظ میں کیسا خلوص اور کتنا پیار بھرا ہے:-

"یہ ساری دراز نفسی اس لئے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آگئے، ملاقات میسّر نہیں ہے تو دل کی آرزمندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنے لفظ اُمید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنّا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا کہ آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؛ غالباً ۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم[1] کے یہاں دہلی میں۔ میں نظربندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدرآباد سے آئے تھے، دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کردیتی تھی ؎

بیاکہ رونقِ این کارخانہ کم نہ شود
ز زُہد ہمچو توئی، یا بہ فسق ہمچو منی"

یہ خطوط ادبی، تاریخی اور صدیقین کے محبّت و اخلاص کی ایک ایسی بے مثال کہانی ہے، جو شاید کبھی دُنیا میں نہ دُہرائی جائے گی۔

اسی طرح کاروانِ خیال کے دوسرے مکاتیب نہ صرف علمی و ادبی حیثیت سے

---

[1] حکیم محمد اجمل خاں مرحوم مُراد ہیں۔

ایک یہ بڑی خصوصیت ہے اور اس وجہ سے غبارِ خاطر کے مکاتیب پر فوقیت حاصل ہے۔
۔۔۔ کہ ان مکاتیب میں مکتوب الیہ کی شخصیت نہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے نہ ذہن
سے غائب۔ کاروانِ خیال کے ایک خط مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا نے اپنے
سفرِ عراق کی روئیداد اور وہاں کی علمی و ادبی شخصیتوں اور صحبتوں کا پُر لطف انداز
میں تذکرہ چھیڑا ہے۔ اسی خط میں دجلہ کی لہروں پر ایک مجلس طرب کے انعقاد کا ذکر
بھی آگیا ہے۔ دنوں تک یہ بات موضوع بنی رہی کہ آیا یہ واقعہ ہے یا محض افسانہ سرائی؟
یہ غلط فہمی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نوّر اللہ مرقدہٗ کے بعض جملوں سے پیدا ہوئی
تھی۔ آزاد کی کہانی بروایتِ ملیح آبادی میں سن کی غلطی نے اس واقعہ کو اور بھی مشتبہ
بنادیا اگرچہ مولانا کی آخری کتاب "انڈیا ونس فریڈم" سے بھی اس شبہ کا ازالہ ہوگیا۔
لیکن بعض حضرات پھر بھی اسے افسانہ ہی سمجھتے رہے۔ لیکن بالکلیہ یہ غلط فہمی فرانسیسی
مستشرق لوئی مسینو[1] (LOUIS MASSIGNON) کے ایک مضمون
سے جو حضرت مولانا آزاد کی پہلی برسی کے موقع پر ایک کتاب میں شائع ہوا تھا۔
دُور ہوئی۔ جس زمانہ میں مولانا آزاد نے عراق کا سفر کیا تھا لوئی مسینو بغداد میں حاجی
علی آلوسی کے مدرسہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُنھوں نے اپنے مضمون میں لکھا:

"آج سے ٹھیک پچاس برس پہلے کی بات ہے کہ ۱۹۰۸ء میں پہلے پہل
میری ملاقات بغداد میں ہوئی تھی۔ رفیق و شفیق اُستاد حاجی علی آلوسی کے
حضور دونوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اور مسجد مرجان میں ہم پہلو بہ پہلو
تعلیم پاتے تھے۔"[2]

فرانسیسی مستشرق کی اس شہادت نے تمام شبہات کو دُور کر دیا اور اس مسئلہ میں
اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔

---

[1] فروری ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا۔ [2] مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب۔

دیکھا تو کیا عرض کروں، دل پر کیا گزری ایک بار نہیں بار بار پڑھا، ہر بار نیا کیف و سرور حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اس محبت نامہ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء میں الفاظ نہ تھے بلکہ موتی تھے جو سلکِ سطور میں پرو دیئے گئے تھے۔ دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو صفحۂ کاغذ پر تصویر صحبت گزشتہ سے متاثر ہو کر اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

شاید ان ذرّوں میں تصویریں کھنچی ہوں آپ کی
یہ سمجھ کر منتشر اجزائے دل یک جا کیے!!"

اسی مقدمہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مولاناؒ کے سینکڑوں مضامین و خطوط نظر سے گزرے میری علمی تہی مایگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا مضمون بلحاظ فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست میں دوسروں سے فوقیت رکھتا ہے۔ شادی و مسرت کا موقع ہو یا حزن و اَلم کا، عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم کے، تبریک و تہنیت کا محل ہو یا تعزیت و عیادت کا، ہر جگہ اسپِ قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نظروں کے سامنے وسیع میدان ادب ہے۔ رخشِ خامہ کو جدھر مہمیز لگا دی ہوا ہو گیا۔"

نقشِ آزاد

مولانا آزادؒ کے مکاتیب کا تیسرا مجموعہ "نقشِ آزاد" کے عنوان سے مولانا غلام رسول مہر نے ترتیب دیا ہے اور کتاب منزل لاہور نے اواخر ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ میرے پیشِ نظر پہلا ایڈیشن ہے۔ کتاب کے تین حصے، ۱۹۵ خطوط، ایک پیام، ایک اپیل اور مولانا مہر کی تصنیف

اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کی ہم ذوقی، قلبی تعلق اور اخلاص و محبت ہی کی وجہ سے اہمیت نہیں رکھتے بلکہ ان مکاتیب سے بھی مولانا آزادؒ کے اخلاق، عادات، افکار، عقائد، اذواق اور رجحانات وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز تاریخ و تذکار اور ادب و سیاست پر جو ضمنی۔۔۔ اشارات ملتے ہیں وہ مولانا آزادؒ اور ان کے افکار کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لئے بڑی اور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

ابتدا میں مولوی محمد عبدالشاہد خاں صاحب شروانی کے قلم سے ایک مُفید اور پُرزور مقدمہ ہے جو اپنی ایک تاریخی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ مقدمہ کو اُنھوں نے آزادؒ، شروانی تعلقات اور صرف کاروانِ خیال کے خطوط کی علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت و اہمیت کے اظہار و بیان تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اُنھوں نے مقدمہ میں پورے ایک دور کے علم و ادب و ذوق و اخلاق و مروّت اور قدیم و یادگار وضع داریوں کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس مقدمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا جس طرح اپنے "صدیقِ مکرم" کے لئے سراپا اخلاص و محبّت تھے اسی طرح اپنے "عزیزی" (مقدمہ نگار) کے لئے بھی سراپا لُطف و کرم اور مجسمۂ رحمت و شفقت تھے۔ اس طرح مولانا آزادؒ کے اخلاق و کردار کا ایک خاص گوشہ علم کی روشنی میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ نگار کے اپنے بارے میں بھی بعض تاریخی واقعات بلا قصد و ارادہ قلم سے نکل کر تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو جاتے ہیں۔

چند سطریں مقدمہ نگار کے قلم کی ملاحظہ ہوں:

ستمبر ۱۹۴۳ء کے دوسرے ہفتے کا ذکر ہے، میں حسب معمول، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، دامت معالیہ کی خدمت میں حبیب گنج حاضر ہوا تو موصوف نے قدیم شفقت بزرگانہ کے تحت کلکتہ سے آیا ہوا، ایک خط دکھایا۔۔۔۔۔۔ خط

جواہر پارے میرے دامنِ عقیدت میں فراہم ہونے لگے تھے اور لطف و نوازش کا ابرِ گوہر بار اس وقت تک برابر موتی برساتا رہا جب تک اس میں اور مجھ میں موت کی دیوار حائل نہ ہو گئی چالیس سال کی مدت ایک عمر ہے، جو نوادر کے حفظ و نگہبانی میں بسر ہوئی۔ حق یہ ہے کہ حاصلاتِ حیات میں ان سے گراں بہا تر متاع اور کوئی نظر نہیں آتی۔.......

اگرچہ یہ تعداد میں زیادہ نہیں اور اس غرض سے نہ لکھے گئے تھے کہ کبھی اشاعت پذیر ہوں گے۔ تاہم ان میں مولانا کے کمالِ علم و فضل اور یگانگی اسلوب تحریر کے بیسیوں نادر مُرقعے دیکھے جا سکتے ہیں، نیز مرحوم کے سوانحِ حیات اور فضائلِ اخلاق و عادات کا بھی خاصا قیمتی سرمایہ ان میں موجود ہے۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ عرض کرنا غالباً غیر مناسب نہ سمجھا جائے گا کہ اتنے مکاتیب بھی بہت کم اصحاب کے پاس ہوں گے، نیز ۱۹۱۲ء سے مولانا کی حیاتِ مستعار کے آخری دَور تک اس سِلسلۃ الذہب کے امتداد کی مثال بھی شاید ہی مل سکے۔"

"نقشِ آزاد" کا دوسرا حصّہ اِن تحریرات پر مشتمل ہے جو مولانا آزاد نے مہر صاحب کی کتاب "غالب" پر تحریر فرمائی تھیں۔ مجموعہ کا یہ حِصّہ بھی علمی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اِس حصّہ کی تمام تحریرات غالبؔ ہی سے متعلّق ہوں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حِصّہ میں نہ صرف غالبؔ کے بارے میں بعض نئی اور دلچسپ معلُومات حاصِل ہوتی ہیں بلکہ اس دَور کے علمی، ادبی اور مجلسی ماحول اور اس زمانے کی کئی شخصیتوں پر کچھ نیا مواد سامنے آ جاتا ہے۔ بعض واقعات کی اصلیت اور روایات کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ اِس سِلسلے میں مولانا مرحوم کے والد مولانا خیرالدین

"غالب" پر مولانا کی بعض نادر تحریرات ہیں۔

مرتب نے لوحِ ثانی پر مجموعہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

"نقشِ آزاد

یعنی

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے وہ مکاتیب جو میرے نام آتے نیز

بعض دوسری تحریرات و مکاتیب۔

غلام رسول مہر"

پہلے حصے میں ۱۸۱ مکاتیب ہیں (مکتوب نمبر ۱۸۱ کتاب کے آخر میں ہے) ان میں سے ایک مکتوب (نمبر ۱۰۵) مولانا عبدالمجید سالک مرحوم اور بقیہ تمام مکاتیب مولانا مہر صاحب کے نام ہیں۔ ان میں سے ۱۲۳ مکاتیب حضرت مولاناؒ کے قلم سے ہیں، ۲ تاروں کا ترجمہ ہے ۵۳ خطوط مولاناؒ کے ڈپٹی پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خان صاحب کے قلم سے اور تین خط مولاناؒ کے سکریٹری این۔ ایم مسعود صاحب کی جانب سے مولانا کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے۔ اس حصہ کا پہلا مکتوب ۱۹۱۴ء اور آخری خط مئی ۱۹۵۷ء کا ہے۔

یہ مجموعہ نہ صرف علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت ہی سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ مولانا مہر صاحب کے تینتالیس سالہ عزیزانہ و مخلصانہ تعلقات کی ایک تاریخی روداد ہے۔ اِن خطوط سے صرف مکتوب نگار کے علم و فضل اور اخلاق و کرداری پر روشنی نہیں پڑتی بلکہ مکتوب الیہ کے مزاج و طبیعت کے بعض پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ابتداء میں مرتب نے چند صفحات میں مجموعہ کا تعارف کرایا ہے، حصہ اوّل یعنی اپنے نام مکاتیب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں بی۔اے۔ کے آخری سال میں تھا، جب علم وادب کے یہ نادر

تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ مکاتیب خواجہ حسن نظامیؒ کی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" کے حوالہ سے نقل کیے گئے ہیں۔ چونکہ اتالیق خطوط نویسی نہ صرف کم یاب بلکہ نایاب ہے اس لئے ان خطوط کا اس مجموعہ میں شامل کر لینا کسی طرح بھی اہمیت و افادیت سے خالی نہیں۔ مُلا واحدی صاحب اور نیاز صاحب فتحپوری کے نام مکاتیب بھی اسی مجموعہ سے ماخوذ ہیں۔ نیاز صاحب کے نام مکاتیب ۱۹۱۴ء اور اس کے بعد' لیکن ۱۹۱۶ء سے قبل کے ہیں۔ شفاعت اللہ صاحب کے نام مکتوب جولائی ۱۹۲۴ء کا ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزادؒ کا پیام تمام عزیزانِ پنجاب کے نام" ۱۹۲۱ء کا ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تحریر اخبار "زمیندار" کے لئے زرِ ضمانت کی فراہمی میں حصّہ لینے کی اپیل" ہے۔ لیکن یہ اپیل صرف مولاناؒ کی جانب ہی سے نہیں بلکہ ڈاکٹر سید محمود اور مولانا محمد علی جوہرؒ کے بھی اس پر دستخط ہیں۔

سولہ ۱۶ صفحات پر مشتمل کتاب کا یہ آخری حصّہ ہے۔ اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے یہ چند اوراق ہیں لیکن قیمت کے اعتبار سے یہ حصّہ بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس حصّہ کی ترتیب کے بارے میں مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں :-

"حصّہ سوم" ان تحریرات پر مشتمل ہے جو میرے نام نہ تھیں تاہم کسی نہ کسی وجہ سے میرے پاس پہنچ گئیں اور محفوظ رہیں۔ انھیں میں وہ چند مکاتیب بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جو خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ۱۹۱۶ء میں ایک مجموعے کے ساتھ چھاپے تھے۔ ان میں سے بعض مکاتیب "الہلال" سے پیشتر کے ہیں۔ اور اس دَور کے مکاتیب بہت کم یاب ہیں اندیشہ تھا کہ وہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں"

"نقشِ آزاد" کو ایک اعتبار سے میرے نزدیک "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال"

اوران کے (خیر الدینؒ کے) نانا مولانا منور الدین کے بارے میں کچھ تاریخی واقعات اور حالات کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ تاریخی تذکار و وقائع کے علاوہ تحریر و کتابت اور زبان و بیان واملاء اور الفاظ و تراکیب وغیرہ کے بارے میں بہت سے مُفید نکتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس حصّے کے مطالعے سے مولانا مرحوم کے عِلم و فضل اوران کی ژرف نگاہی کا نقش دل پر اور گہرا ہو جاتا ہے۔

اِس حِصے کی تحریرات کے بارے میں مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں:-

" میری کتاب " غالب " ان کے مطالعے سے گزری تو فرمایا کہ " اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مفصّل سوانح عمری لکھی جارہی ہے تو بہت سی ضروری باتیں لکھ بھیجتا " پھر میں نے ان کے ارشاد کے مطابق کتاب کا ایک نسخہ بیچ میں سادہ اوراق لگوا کر بھیج دیا جو کم و بیش تین سال تک ان کے پاس رہا، جب کبھی فرصت ملتی، وہ سادہ اوراق پر کچھ نہ کچھ تحریر فرمادیتے۔ اِس طرح تین سال میں بہت کچھ لکھا گیا۔ جو سب کا سب غالبؒ کے متعلق نہ تھا۔ عادتِ شریف یہ تھی کہ کوئی مبحث شروع فرماتے تو ضمنی گفتگوؤں کے سِلسلے میں مختلف وادیوں کے اندر پھر نکلتے اور ہر نئی تحریر نئی معلومات کا ایک دل آویز مرقع ہوتی۔ میں نے ان تحریرات کو مناسب ترتیب کے ساتھ پیشِ نظر مجموعے کا حصّہ دوم بنا دیا ہے "

" نقشِ آزاد " کا حصّہ سوم ۱۴۲ خطوط، ایک پیام اور ایک اپیل پر مشتمل ..... ہے۔ اِس میں سے آٹھ خطوط خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام ہیں۔ ایک خط جناب ملّا واحدی صاحب کے نام، ایک خط شفاعت اللہ مرحوم کے نام اور چار خط جناب نیاز صاحب فتح پوری کے نام ہیں۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام مکاتیب از دسمبر ۱۹۰۶ء تا مئی ۱۹۱۳ء کے ہیں اور اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ الہلال سے قبل کے مکاتیب ابھی تک بہت تھوڑے ملے

اور ذہنی پس منظر کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن "نقشِ آزاد" میں مولانا آزادؒ ایک عالمِ دین، مفسّرِ قرآن، سیاست دان اور خالص ایک عملی انسان نظر آتے ہیں۔ "غبارِ خاطر" میں وہ ایک فارغ البال اور تنہائی پسند انسان کے روپ میں نظر آتے ہیں لیکن "نقشِ آزاد" میں مولاناؒ کی تصویر ہنگاموں میں گھری ہوئی اور مصروفِ کار نظر آتی ہے۔ پھر اس میں وہ کہیں ایک مربی اور بزرگ کی شان میں جلوہ گر ہوتے ہیں تو کہیں عزیز و شفیق دوست کی حیثیت سے۔ کہیں وہ ہدایات و مشورہ دیتے ہیں۔ کہیں بگڑتے اور خفا ہوتے ہیں تو کہیں مسائل کا تجزیہ کرتے اور اس کے نتائج سے خبردار کرتے ہیں۔ "نقشِ آزاد" کے مطالعے سے ہم صحافت، سیاست، ادب، تاریخ، فلسفہ، تعلیم، مذہب کے بارے میں ان کے افکارِ عالیہ کا پتہ پاتے ہیں تو ساتھ ہی ان کے اشغال و اعمال، اخلاق و کردار، دیانت و امانت اور ان کے گرد و پیش کے متعلق ایسے معلومات حاصل ہوتے ہیں جو "غبارِ خاطر" میں نہیں ملتے۔ پھر یہ نہیں کہ اس میں ان کے ذہنی پس منظر، افتادِ طبع، ذوق و رجحان کا پتہ نہ چلتا ہو۔ یہ فرق صرف مخاطب اور مکتوب الیہ کی تبدیلی ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ "غبارِ خاطر" کے مکاتیب قلعہ احمد نگر کے زندان کی تنہائیوں میں لکھے گئے تھے جب کہ "نقشِ آزاد" کے مکاتیب سیاست کے ہنگامۂ کارزار میں لکھے گئے۔ ناممکن تھا کہ ان پر گرد و پیش کے اثرات نہ پڑتے۔

"نقشِ آزاد" میں کچھ خطوط ترجمان القرآن اور "غبارِ خاطر" کی اشاعت اور فروخت کے معاملات کی نسبت ہیں۔ اس قسم کے خطوط کو اگرچہ علمی و ادبی خطوط میں شمار نہیں کیا جاتا۔ لیکن کسی شخصیت کے مطالعے کے سلسلے میں اس قسم کے خطوط بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ معاملات اور لین دین انسانی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جہاں اس کی شخصیت کا تمام ملمع اتر جاتا ہے۔ اس میدان میں جب کوئی آتا ہے تو وہ اپنے حقیقی اخلاق و کردار ہی میں نظر آتا ہے۔ یہاں ممکن ہی نہیں کہ چہرے پر کوئی نقاب پڑا رہ جائے۔ چنانچہ

پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ ناظرین جانتے ہیں کہ غبارِ خاطر اور کاروانِ خیال میں مولانا نے علم و ادب، فلسفہ و مذہب، فنونِ لطیفہ، اپنے اشغال و اعمال و اذواق، تعلیم و تربیت اور قید و بند کی زندگی اور اس کے معمولات کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا اور اس کے لئے جو اسلوبِ تحریر اختیار کیا اس نے غبارِ خاطر کو ادبِ عالیہ میں جگہ دی ہے۔ لیکن چونکہ وہ تمام خطوط ایک ایسے "صدیق" کو لکھے گئے تھے جسے سیاست اور جد و جہد آزادی کی تحریکات سے نہ صرف کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اس کی راہیں مخالف سمت میں جارہی تھیں دونوں کے سیاسی عقائد اور سیاسی اعمال و اشغال میں بُعد المشرقین تھا صرف علمی و ادبی ہم ذوقی دونوں کو ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی۔ اس لئے جب ان کے لئے مولانا اپنی دکانِ سخن سے کچھ نکالتے تھے تو پہلے احتیاط کی چھلنی میں چھان کر یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ اس میں سیاست کی ملاوٹ تو نہیں۔ اس لئے غبارِ خاطر و کاروانِ خیال میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زندگی اور ان کی ہمہ صفت شخصیت کا صرف ایک پہلو ہی نمایاں ہو سکا۔ اگرچہ غبارِ خاطر میں مولاناؒ کے ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت خاندان و ماحول نیز ان کے علمی و ادبی رجحان اور مذہبی افکار کے بارے میں ایک بنیادی کتاب اور بہترین ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن مولاناؒ کے حالات و سوانحِ حیات کے بارے میں دوسرے مجموعوں کے خطوط اور دیگر کتب و رسائل میں بہت مواد مل جاتا ہے۔ اس لئے صرف اس اعتبار سے غبارِ خاطر کو بہت بڑی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔

"غبارِ خاطر" کے مکاتیب کے برعکس "نقشِ آزاد" کے مکاتیب ایک ایسے عزیز کو لکھے گئے جو خود مختلف حیثیتیں رکھتا تھا، اس کے لئے ضروری نہ تھا کہ احتیاط کی چھلنی میں چھان کر کچھ نکالا جاتے، بایں وجہ "نقشِ آزاد" کے مکاتیب میں مولانا مرحوم کی ایک بالکل مختلف شکل نظر آتی ہے۔ "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" ان کے فکری رجحان

"تبرکاتِ آزادؒ"

جس میں

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ۷۹ مکاتیب اور ۸ مقالات شامل ہیں[1] جن کو

اہمیت، و نوعیت کے اعتبار سے تبرکات کی حیثیت حاصل ہے"۔

غلام رسول مہرؔ"

کتاب کے شروع میں تقریباً چھ صفحات کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ اس میں مکاتیب و مقالات کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی اہمیت و افادیت واضح کی گئی ہے۔ کتاب کے بارے میں مولانا مہرؔ صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہ کتاب جو "تبرکاتِ آزاد" کے نام سے خوانندگان کرام کی خدمت میں پیش ہو رہی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے ان رشحات قلم پر مشتمل ہے، جنھیں تبرکات تسلیم کرنے میں شاید کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مباحث کی اہمیت اور مطالب کی گراں مائگی کے باوجود علم و ادب اور دین و سیاست کے یہ نادر جواہر ریزے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے تھے۔ اور ان پر گرد فراموشی کی اتنی تہیں جم چکی تھیں کہ غالباً کسی کو ان کے وجود کا احساس تک نہ رہا تھا۔"

مکاتیب کی حیثیت و اہمیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"کتاب کے آغاز میں مکاتیب کے چار مجموعے ہیں جن کی کل تعداد ~~اٹھانوے~~ ۹۹ ہے۔ ان میں سے متعدد اتنے طویل اور مفصل ہیں کہ انھیں مستقل رسالے سمجھنا چاہیئے، جو نہایت نفیس، دقیق اور مفید مباحث کے حامل ہیں ایسی چیزیں دوسری جگہ شاید ہی مل سکیں۔ ان میں دینی اور علمی مسائل بھی بیان

---

[1] حقیقتاً اس مجموعہ میں ۹۸ مکاتیب اور ۷ مقالات ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مولاناؒ کے کردار کا یہ پہلو پوری طرح روشنی میں آجاتا ہے اور یہیں معلوم ہوجاتا ہے کہ کاروبار و تجارت سے مولاناؒ کے ذہن و دماغ کو ادنیٰ مناسبت بھی نہیں وہ کاروباری داؤ پیچ سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ کسی سے معاملہ کرتے ہوئے اور کاروباری گفتگو میں اپنے دل کو پوری طرح کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کا دل بچّہ کی طرح معصوم اور ہر قسم کے تحفظات سے ذہن خالی ہوتا ہے۔ معاملہ کرتے ہوئے اگر وہ اپنے مفاد میں کسی بات کو چھپانا بھی چاہیں تو چھپا نہیں سکتے۔ اس طرح فریقِ ثانی کے لئے پورا موقع مہیّا ہوجاتا ہے کہ اگر وہ ان کی معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکتا ہے۔ وہ معاملات میں انتہائی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ وہ فریقِ ثانی پر بہت جلد اعتماد کر لیتے ہیں اور اس وجہ سے بعض اوقات انھوں نے نقصان بھی اٹھایا ہے لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو اس قسم کے خطوط ہیں ان میں اور کوئی بات اس کے علاوہ نہیں کہی گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی دیگر مکاتیب کی طرح بہت سے علمی، ادبی سیاسی اور تاریخی واقعات و تذکار آگئے ہیں۔ نیز ان خطوط میں ابوالکلامؒ کی انانیت ان کے ادب کی شانِ دلربائی، اسلوب نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی چھاپ کا حُسن پوری طرح جلوہ گر ہے۔

تبرکاتِ آزاد

تبرکاتِ آزاد" مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اٹھانوے [۹۸] مکاتیب اور سات مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب بھی مولانا غلام رسول مہر صاحب ہیں۔ اور کتاب منزل لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مکاتیب و مقالات ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ مرتب نے لوحِ اوّل پر کتاب کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

ہیں۔ ان سے وقت کے فکری رجحانات، ہنگامی مسائل اور وقتی سیاسی و تعلیمی مباحث کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام مکاتیب کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں کئی مکاتیب ایسے مباحث سے پُر ہیں جو اس وقت ملک کے تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی حلقوں میں موضوع بنے ہوتے تھے۔ پھر ضمنی طور پر جو مباحث ان مکاتیب میں آگئے ہیں وہ بے شمار بھی ہیں اور بیش قیمت بھی۔

بہر حال مکاتیب کا یہ مجموعہ مطالب کے لحاظ سے حد درجہ بیش قیمت ہے اور کتاب کے تمام دوسرے مجموعوں پر فوقیت رکھتا۔ ان میں سے ایک دو مکاتیب چٹان لاہور اور ایک دوسرے رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں باقی تمام مکاتیب اس مجموعہ میں پہلی مرتبہ شائع ہوتے ہیں۔

دوسرا مجموعہ مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنو کے نام (از ۱۹۱۲ء تا ۱۹۴۸ء) اُنیس ۱۹ مکاتیب کا ہے۔ ان میں سے سترہ ۱۷ مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے اور دو ۲ مکاتیب مولاناؒ کی جانب سے ان کے سکریٹری محمد اجمل خان صاحب کے قلم سے ہیں۔ مرتب نے یہ مکاتیب "نیا دور" کی ایک اشاعت خصوصی کے حوالے سے شائع کئے ہیں۔ اس سے قبل یہ مکاتیب "صدق جدید" لکھنو کے چار نمبروں میں اور بعض مکاتیب "ایشیا" لاہور میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا صورتوں میں ان کی افادیت محدود تھی اور نگارشاتِ آزاد اور علم و ادب کے بہت سے شیدائیوں کو بھی ان کا علم نہ تھا۔ مرتب نے ان مکاتیب کو "تبرکاتِ آزاد" میں شامل کر کے خود کو عقیدتمندانِ ابوالکلامؒ اور ادبی دُنیا کے شکریے کا مستحق ٹھہرالیا ہے۔ مطالب کے لحاظ سے بھی یہ مکاتیب حد درجہ بیش قیمت ہیں۔ اس حصہ کے بعض مکاتیب میں مولانا آزادؒ نے اصلاحِ حال و معاشرت اور اخلاق و رسومات کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ نہ صرف سماجی و سیاسی کارکنوں کے لئے بلکہ ان تمام لوگوں اور علماء کے لئے بھی قابل تقلید ہے جو

ہوتے ہیں، تعلیمی اور اصلاحی مسائل کے متعلق بھی خلاصۂ اہم نکتے ارشاد فرمائے گئے ہیں، جن کی کوئی مثال نہ صرف ہمارے عہد میں بلکہ پیشتر کے اکثر عہدوں میں بھی نہیں ملتی۔ جو کچھ قلم سے نکلا سراسر مجتہدانہ اور بصیرت و موعظت کا ایک نادیدہ مرقع ہے۔ بعض مکاتیب اگرچہ مختصر ہیں مگر ان میں سے بھی کوئی کسی اہم علمی یا اخلاقی نکتے سے خالی نہ ہوگا۔ سب سے آخر میں یہ کہ اسلوب نگارش کی ندرت کاری اور شخصیت کی خاص چھاپ کا حُسن تو سب میں جلوہ گر ہے۔"

پہلا مجموعہ چھبیس[۲۶] مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چوبیس[۲۴] مکاتیب مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام اور دو[۲] مکتوب نمبر ۱۱ و ۲۵، مولوی صاحب موصوف کے والد ماجد مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے نام ہیں۔ یہ مکاتیب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۰ء تک تقریباً اکیس[۲۱] سال کی مدت میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔

ان مکاتیب میں مستقل یا ضمنی طور پر بے شمار مسائل و مباحث آ گئے ہیں۔ جن کا مکمل طور پر احاطہ کرنا ناممکن ہے ان میں سے چند مباحث یہ ہیں۔ تعلیم، نصاب تعلیم، نصابِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت، بعض احادیث مشہورہ کا حقیقی مفہوم، نیز اخلاق و سیرت، حکمت و شریعت، مذہب و قانون، ادب و تاریخ، صحافت و سیاست، علم و تحقیق، احادیث و تفسیر، تذکار و تقلید، افکار و عقائد، رسالت و امامت، وقتی ہنگامی مسائل و معاملات وغیرہ بے شمار مباحث کے علاوہ نجی معاملات و تعلقات ضبطِ تحریر میں آ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض مکاتیب مستقل موضوعات پر ہیں اور رسالوں کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں بے شمار مباحث آ گئے ہیں۔ ان مکاتیب کو "غبار خاطر" کے موضوعاتی مکاتیب کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے اور بعض اعتبار سے اس پر فوقیت رکھتے ہیں۔ "غبار خاطر" کے مکاتیب جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے علمی، ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ مباحث سے تعلق رکھتے

انسان کے ظرف کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو یہی دیکھنے پر قناعت نہ کیجئے کہ اس کا برتاؤ دوستوں اور معتقدوں کے ساتھ کیسا ہے۔ بلکہ یہ دیکھئے کہ معترضوں، نکتہ چینوں اور مخالفوں کے ساتھ کیسا ہے۔ یہ امتحان ایک کڑا امتحان ہے۔ اچھے اچھے عابد وزاہد بزرگ بھی اس امتحان میں ہمیشہ پورے نہیں اُترپاتے۔ مولانا کو اللہ نے اس نعمت خصوصی سے نوازا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے لئے بھی دل میں جگہ رکھتے تھے اور ان سے معاملہ رکھنے میں اپنے حلم، رواداری اور عالی ظرفی کا پورا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔[1]

اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ نے الہلال کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کے نمایاں وغالب عنصر اور جوش خطابت و شعلہ بیانی کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے یا اس دور کی مطبوعہ تحریروں کے بارے میں نکتہ چینوں کے جس احساس ہوئے انانیت کا تذکرہ فرمایا ہے، اس سے اتفاق کیا جائے۔ لیکن مولانا مدظلہ نے خطوط کی جن خصوصیات اور مولانا ابوالکلام آزاد کے جن اخلاقی کمالات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔

تیسرا مجموعہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کے نام (از ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۷ء) اڑتیس مکاتیب کا ہے۔ مرتب نے یہ مکاتیب معارف اعظم گڈھ کے حوالہ سے نقل کئے ہیں۔ ان میں سے بعض مکاتیب چٹان لاہور کی بعض اشاعتوں میں اور ایک دوسرے رسالہ میں یہ تمام مکاتیب شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن ان حالات میں ان سے مستقل طور پر استفادہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ مرتب "تبرکات آزاد" نے یہ خوب کیا کہ ان کو اپنے مجموعے میں شامل کرکے ایک علمی وادبی ضرورت کو پورا کر دیا۔ یہ مکاتیب ندوہ، دارالمصنفین، معارف، دارالارشاد، الہلال، البلاغ کے متعلق اہم معاملات و مسائل سے پُر ہیں۔ جواب تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ حالات و وقائع و تذکار، قرآن و حدیث اور تفسیر و ترجمان القرآن کے سلسلے میں بعض

---

[1] صدق جدید لکھنو۔ ۹ر دسمبر ۱۹۶۰ء۔

اصلاحِ رسومات اور تہذیب اخلاق عامہ کا جذبہ اور داعیہ رکھتے ہیں۔ علمی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے بھی یہ مکاتیب بیش قیمت ہیں اور واقعی تبرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا آزادؒ کی سیرت و اخلاق اور نفسیات کے مطالعے کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ نے اپنے نام مولاناؒ کے خطوط کی روشنی میں ان کی سیرت اور بعض اخلاقی کمالات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس کا مطالعہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ مولانا دریابادی مدظلہٗ فرماتے ہیں۔

"ان کی پبلک تحریریں جس معیار کی ہیں وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ لیکن ان کی سیرت کے بعض جوہر ایسے ہیں جو ان کی خانگی یا نجی تحریروں میں زیادہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ ان کی مطبوعہ تحریروں سے الگ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ان سے مختلف۔ مثلاً۔

۱۔ الہلالی دَور کے مضمونوں اور مقالوں میں طنز و تعریض کا عنصر نمایاں و غالب نظر آئے گا۔ لیکن عین اس زمانے کے مکتوبات میں یہ عنصر نام کو بھی نظر نہیں آیا۔ اور مولانا (ایڈیٹر الہلال سے الگ) تمام تر سادگی، سنجیدگی کی تصویر نظر آتے ہیں۔

۲۔ اس دَور کے مضمون اور مقالے جوشِ خطابت اور شعلہ بیانی کی نذر ہیں۔ مکتوبات میں اس کے برعکس، مولانا بجائے ایک جذباتی انسان کے ہر طرح متوازن و معتدل اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے والے انسان کے رُوپ میں جلوہ گر ہیں۔

۳۔ نکتہ چینوں کو اس دَور کی مطبوعہ تحریروں میں بُوئے انانیت محسوس ہوتی ہے۔ ذاتی خطوط کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں جلوہ آرائیاں تواضع، انکسار و اخلاص ہی کی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پختہ عمری کے بعد مولاناؒ کی پبلک تحریروں میں بھی یہ رنگ ایک حد تک آچلا تھا، پھر بھی یہ رنگ نمایاں خطوط ہی میں ہے اور ابتدائی اور درمیانی دَور کی مطبوعہ تحریریں تو بالکل ہی دوسرے رنگ کی ہیں۔

"تبرکاتِ آزاد" کا آخری حصہ بلند پایہ مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ
حسبِ ذیل مضامین ہیں۔
۱۔ ہجرت کا فتویٰ (۱۹۲۰ء) ۲۔ فتنۂ ارتداد اور مسلمان (۱۹۲۳ء) ۳۔ مسئلۂ خلافت
جمہوریۂ ترکیہ (۱۹۲۴ء) ۴۔ امیر ابن سعود اور حرمین شریفین (۱۹۲۵ء) ۵۔ دیش
موچتر نجن داس (۱۹۲۵ء) ۶۔ مقابر و آثار پر عمارات (۱۹۲۵ء) ۷۔ کیا آخری منزل
(۱۹۲۱ء)۔

یہ تمام مضامین و مقالات مختلف اخبارات و رسائل سے ماخوذ ہیں۔ ہر تحریر کے شروع
مرتب کے قلم سے تمہیدی عبارتیں ہیں، جن سے تحریرات کا پس منظر معلوم ہو جاتا ہے
ان کی علمی و تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملفوظاتِ آزاد

اب اس سلسلے کی ایک آخری کتاب ہمارے سامنے "ملفوظاتِ آزاد" آتی ہے۔
کتاب کو مکاتیب کے سلسلے میں شامل کرنے کی جرأت میں کر رہا ہوں۔ مجھے فنی نقطۂ
سے اور موضوع کے تعلق سے کچھ علم نہیں کہ ملفوظات کو مکاتیب کی قسم قرار دیا جاتا
یا کسی دوسرے موضوع کے تحت شمار کیا جاتا ہے۔ یا ملفوظات کو ایک الگ فن اور
مستقل موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

"ملفوظاتِ آزاد" ایک سو ساٹھ صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کو مولانا ابوالکلام
آزاد مرحوم کے سابق ڈپٹی پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب نے ترتیب دیا اور
حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی" نے جولائی ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ اس کا ایک ایڈیشن "مکتبۂ
اول کراچی" نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ میرے پیشِ نظر "حالی پبلشنگ ہاؤس" کا مطبوعہ
نسخہ ہے۔

مفید اور اہم مباحث ان مکاتیب میں آگئے ہیں۔ نیز یہ مکاتیب ہر دو اعاظم رجال کے مخلصانہ و برادرانہ تعلقات کی ایک ایسی دستاویز ہیں جو بجائے خود ایک مستقل موضوع اور تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس کے علاوہ مکاتیب کی جن علمی، ادبی اور تاریخی خصوصیات اور مکتوب نگار کے اخلاق و سیرت و کردار کے جن کمالات کی جانب مولانا دریابادی مدظلہ نے اپنے تبصرہ میں اشارہ فرمایا ہے، وہ ان مکاتیب میں بھی اسی طرح جلوہ گر ہیں۔ البتہ حضرت سید سلیمان ندویؒ کے نام مولانا آزادؒ کے مکاتیب کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو انھیں مجموعے کے دوسرے مکاتیب سے ممتاز کر دیتی ہے۔ وہ ہے اکثر مکاتیب کا خالص عالمانہ انداز اور ٹھوس علمی مباحث کی زیادتی۔ اور یہ فرق صرف اس لئے ہے کہ حضرت سید صاحبؒ اور مولانا دریابادی مدظلہ کی شخصیتوں میں علمی اعتبار سے ایک نمایاں فرق تھا جس کی تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

چوتھا مجموعہ پندرہ ۱۵ مکاتیب پر مشتمل ہے۔ یہ مکاتیب دس ۱۰ حضرات کے نام ہیں، ان میں سے بعض شخصیتوں کا شمار مشاہیر میں ہوتا ہے۔ مثلاً خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم وغیرہ۔ یہ مختلف اقسام کے مکاتیب ہیں اور ان میں سے ہر مکتوب اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان مکاتیب میں ابوالکلام کا عجز بھی ہے، اس کا فکر بھی ہے۔ اس کا اخلاص و محبت بھی جلوہ گر ہے۔ یہ مکاتیب نہ صرف علمی و ادبی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہیں، مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں :-

> "چوتھا مجموعہ متفرق مکاتیب کا ہے ان میں سے بعض دہلی کے ایک مرقع "میرا عقیدہ" میں شائع ہو چکے تھے، بعض مختلف رسائل میں چھپے، بعض مجھے ایک دوست کی مہربانی سے میسر آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ان مکاتیب کی اشاعت سے مقصود یہ تھا کہ مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریرات یکجا ہو جائیں۔

ملفوظات کی اہمیت اور نوعیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مولانا کے ملفوظات سے نہ صرف اس تاریخی دور کی سماجی و سیاسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے دلوں میں کیا کیا خیالات اور سوالات ابھرتے تھے اور ان کا پس منظر کیا تھا۔ اس لئے میں نے سوالات پوچھنے والوں کے سوالات کو حتے الامکان مکمّل طور پر نقل کر دیا ہے اور ان کے ساتھ مولانا کے فرمودات کو اختصار سے لکھ دیا ہے۔ اس اختصار کی خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا کو مختلف سیاسی، سرکاری اور سوشل مصروفیتوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ ہر سوال کے متعلّق تفصیل سے کچھ ارشاد فرمائیں۔ وہ چند لفظ فرما دیتے تھے۔ یہ میرا کام تھا کہ اسے مربُوط عبارت کا جامہ پہناؤں۔ اگر کہیں مسامحت ہوئی ہو تو اس کی تشریح کرنے کو تیار ہوں۔ یہ مولانائے مرحوم کی کوتاہی نہ سمجھی جائے۔"

مولانا آزاد کی نسبت فرماتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد غیر معمولی عالمِ دین تو تھے ہی، وہ اُردو کے بے مثال ادیب بھی تھے اور مدبّر بھی۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس میدان کی صفِ اوّل میں تھے۔ وہ ہر میدان کے شہسوار اور یگانۂ روزگار نظر آتے ہیں۔

مسائلِ دینیہ میں ان کی جدّت پسندی پر شاہد عدل ہے۔ طلاق مرّتان کے سلسلے میں ان کا اجتہاد قابل تقلید ہے۔ بنک کے سُود اور انشورنس کے معاملے میں وہ جدید سوسائٹی کی مجبُوریوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ پردۂ حجاب اور غضِ بصر کے متعلق وہ حقیقی اسلامی فیصلہ نمایاں کرتے ہیں۔"

ملفوظات کا یہ مجمُوعہ مولانا کے افکار و خیالات کے باب میں بہت اہمیت رکھتا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ مرتب نے پُوری صفائی کے ساتھ یہ بیان کر دیا ہے کہ

اس میں ۸۴ شناسی مختلف حضرات کے خطوط اور مولانا آزادؒ کے مختصر جوابات درج ہیں۔ کتاب کی لوح ثانی (صفحہ ۳) پر ان الفاظ میں کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔

"با صد ہزار دیدہ بگرد جہاں سپہر
جویائے آدمی ست ولے آدمی کجاست!

انسانی، دینی، علمی، ادبی، سیاسی، تفریحی، تنقیدی، تعریفی مسائل کے سلسلے میں

"ملفوظاتِ آزاد"

جلد اوّل دینی

نمبر ۱"

ابتدائی چودہ ۱۴ صفحات میں مرتب نے کتاب کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور ان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

مرتب نے بہت اچھا کیا کہ ملفوظات کے بارے میں یہ وضاحت کر دی کہ ملفوظات میں الفاظ ان کے اور مفہوم مولاناؒ کا ہے۔ نیز ملفوظات کی صحت ان کے حافظہ اور ان کی یادداشتوں کی صحت پر مبنی ہے۔ مرتب محمد اجمل خاں صاحب فرماتے ہیں :-

"بالفعل میں اس اہم تاریخی دَور کے لوگوں کے مختلف سوالات کے متعلق مولاناؒ نے جو کچھ فرمایا تھا اپنی مختصر یادداشتوں سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں۔ چونکہ مولاناؒ کے ارشادات کی مکمّل نقلیں میرے پاس نہیں ہیں۔ لہذا عبارتیں مولاناؒ کی نہیں بلکہ مولاناؒ کے فرمودات کا خلاصہ ہے۔"

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں :

" موجودہ سلسلہ کی خصوصیت بس اتنی ہے کہ اس میں لوگوں کے سوالات بھی ہیں اور بروایتِ راقم مولاناؒ کے جوابی ملفوظات بھی۔ ان کی صحت میری یادداشتوں کی صحت پر منحصر ہے۔"

ملفوظات کی ایک خصوصیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مرتب کے پیش نظر بھی ملفوظات کی اشاعت کا یہی مقصد ہے۔

"یہ جو کچھ پیش کر رہا ہوں، نہ مولانا کی انشا کا نمونہ ہے نہ فنِ ترتیب نویسی کا۔ یہ مولانا کے ارشادات ہیں جو میں نے جمع کر لئے ہیں اور صاحبانِ نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ میرا مقصد تو یہی ہے کہ مولانا کے ملفوظات سے ان کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن اگر تاریخ انشا پردازی میں گلہائے رنگا رنگ کی تلاش ہو تو اس کا بھی سامان بہم پہنچ جاتے۔"

محمد اجمل خاں صاحب نے ملفوظات کی جو جلد پیش کی ہے، وہ حقیقتاً ایک وسیع اور بہت بڑے کام کا "پیش لفظ" ہے آئندہ کام کی کیا نوعیت اور کیا حیثیت ہوگی، اس کی نسبت خانصاحب موصوف فرماتے ہیں:۔

"ملفوظات کی بہت سی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ اب تک عموماً تصوّف و مذہب کے سلسلے میں ملفوظات لکھے ہیں۔ اس مجموعہ کی نوعیت اگرچہ ملفوظات کی ہے لیکن اس میں واقعات بھی ہیں اور حکایات بھی، روایات بھی ہیں اور فکاہات بھی۔ بہرحال ہم جملہ ملفوظات و اشاراتِ آزاد کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً دینی، ادبی و سیاسی۔ ہر عنوان مجموعہ کے اوپر درج کر دیا جائے گا اور ممکن ہے ہر عنوان کی کئی کئی جلدیں ہوں۔ یہ سب روایات و حکایات جنھیں ملفوظات کی شکل دی گئی ہے۔ مولانا کی دین پرستی، انسان دوستی اور حُب قومی کی زندہ یادگار ہوں گی۔

زاہد بیا و موت شہیدانِ عشق بین
کیں موت باز زندگی جاودان رسید"

یہ مولانا رح کے الفاظ نہیں ہیں۔ مولانا رح کے مفہوم کو اُنھوں نے اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس صُورت میں یہ خطرہ بھی موجُود ہے کہ ممکن ہے کسی امر کی نسبت وہ مولانا کے فرمودہ کو سمجھ نہ سکے ہوں یا ضبط تحریر میں لانے میں تسامح ہوا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرتب کی یادداشت نامکمل ہو۔ یہ خدشہ صرف میرے ہی دماغ میں پیدا نہیں ہوا بلکہ میرا خیال ہے کہ خود مرتب کا ذہن بھی اس سے خالی نہ تھا۔ مُرتب کے یہ الفاظ اسی امر کی غمازی کرتے ہیں۔

"مولانا کو مختلف سیاسی، سرکاری اور سوشل مصروفیتوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ ہر سوال کے متعلق تفصیل سے کچھ ارشاد فرمائیں۔ وہ چند لفظ فرما دیتے تھے، یہ میرا کام تھا کہ اسے مربُوط عبارت کا جامہ پہناؤں۔ اگر کہیں مسامحت ہوتی ہو تو اس کی تشریح کرنے کو تیار ہوں۔ یہ مولانائے مرحوم کی کوتاہی نہ سمجھی جائے۔"

اس انکشافِ حقیقت کے بعد اس کتاب کو مولانا رح کے افکار و خیالات کے باب میں ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پہلی اور بنیادی حیثیت مولانا رح کی اپنی تحریرات ہیں۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ مولانا رح نے اپنی کسی تحریر میں ملفوظات کی رائے کے خلاف، رائے ظاہر فرمائی ہے، تو ملفوظات کی رائے کو اس کے مقابلے میں رد کردیا جائے گا۔ البتہ جن مسائل کے بارے میں مولانا رح کی اپنی تحریرات میں کوئی رائے نہیں ان مسائل کی نسبت بشرطِ صحت یادداشت مرتب، ملفوظات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ اور مولانا رح کے جن ملفوظات کی مولانا رح کی دیگر تحریرات سے تائید ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ ان کی صحت کی نسبت کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ملفوظات سے نہ صرف مولانا رح کے خیالات کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ ان سے مولانا رح کی نکتہ رسی اور معاملہ فہمی کی اعلیٰ صلاحیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ مولانا رح کی معاملہ فہمی کی صلاحیت ملفوظات کی شہادت کی محتاج نہیں لیکن اس وجہ سے

مکاتیب امام الہند

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب کا چھٹا مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔ اس مجموعہ میں بڑی تعداد غیر مطبوعہ مکاتیب کی ہے جو پہلی مرتبہ علمی و ادبی اور سیاسی دنیا کے سامنے آرہے ہیں۔ کچھ مکاتیب ایسے ہیں جو اگرچہ کبھی نہ کبھی کسی اخبار یا رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں لیکن عام طور پر یہ مکاتیب نگاہوں سے پوشیدہ تھے، اس لئے ان کی حیثیت بھی غیر مطبوعہ مکاتیب سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ پھر ان سے مستقل طور پر استفادہ کی کوئی صورت نہ تھی، اس لئے ضروری سمجھا کہ اس قسم کے تمام متفرق و منتشر مکاتیب کو یکجا کر دیا جائے تاکہ ہر شخص کے لئے ان سے استفادہ ممکن ہو جائے، نیز ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ مجھے خوشی ہے کہ کسی اخبار یا رسالہ میں ایسا کوئی مکتوب نہیں رہا جو میرے علم میں آجانے کے بعد دسترس سے باہر رہ گیا ہو۔ کچھ مکاتیب مختلف اخبارات و رسائل میں بکھرے ہوئے تھے، اگرچہ وہ علم میں تھے، لیکن جتنی بڑی تعداد مہیا ہو گئی، نہ اس کا علم تھا نہ ان کی اہمیت کا اندازہ۔ اب یہ خطوط ایک سلسلے اور ترتیب کے ساتھ سامنے آئے تو حیرت ہوئی کہ علم و ادب اور سیاست و تاریخ کے کیسے انمول موتی تھے جو بکھرے پڑے تھے اور خوشی ہوئی کہ ان کے جمع و ترتیب کی خدمت ایک طالب علم کے حصہ میں آئی، جسے نہ کام کا سلیقہ تھا، نہ تجربہ، نہ کوئی رہنمائی تھی نہ غیر محدود اور کافی وسائل۔ غیر مطبوعہ مکاتیب کا مہیا ہو جانا اور ایک بڑی تعداد میں، یہ محض دوستوں کی عنایت اور ان کے اعتماد کا نتیجہ ہے۔ اس کے لئے ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے بلاپس و پیش مکاتیب مہیا فرمادیئے۔ ورنہ ایسے مکاتیب کا کسی کو علم بھی نہ ہو سکتا تھا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام خطوط و رقعات ان کی کتاب "ذکر آزاد"

مکاتیب ابوالکلامؒ

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب اور بعض مکاتیب کے اقتباسات کا ایک مختصر مجموعہ" ادبستان۔ لاہور" نے شائع کیا تھا۔ چونکہ یہ تمام مکمل اور نامکمل مکاتیب دوسرے مجموعوں میں شامل ہیں اس لئے یہ مجموعہ کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ بایں وجہ اس کا علیحدہ تعارف کرانا غیر مفید معلوم ہوا۔

میرا عقیدہ

مولانا آزادؒ کے چند مکاتیب کا ایک مختصر مجموعہ "میرا عقیدہ" کے نام سے مکتبہ جامعہ دہلی" اور مکتبہ ماحول، کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس رسالہ کے مکاتیب بھی چونکہ ایک دوسرے مجموعے میں شامل ہیں اس لئے اس پر بھی علیحدہ تبصرہ مناسب نہیں معلوم ہوا۔

جواہر نگار قلم سے ہیں۔ ۲۳ مکاتیب مولاناؒ کی ہدایت کے مطابق ان کے سکریٹریوں کی جانب سے ہیں۔ اِس اعتبار سے بھی یہ مجموعہ ایک خصوصیت رکھتا ہے اس لئے کہ مولاناؒ کے قلم سے مکاتیب کی اتنی بڑی تعداد کسی دوسرے مجموعے میں نہیں ہے۔ نقشِ آزاد میں مکاتیب کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ لیکن مولاناؒ کے قلم سے اس میں بھی صرف ایک سو اکتیس مکاتیب ہیں۔

اس مجموعہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف النوع اور کثیر الاقسام مکاتیب ہیں اور ان کی روشنی میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی جو تصویر بنتی ہے، وہ اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے جو دیگر مجموعوں کے مطالعے کے بعد ذہن میں بنتی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ کے ذوقِ نظر اور افکار و خیالات کے بے شمار گوشے سامنے آتے ہیں، ان کے علم و بصیرت، دانائی و حکمتِ علی، اعتدال فکر و عمل اور انصاف پسندی، اخلاق، کمالاتِ سیرت و کردار اور ضبط و تحمل کے اتنے عظیم الشان مظاہر سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر ان کی سیاسی حیثیت سے قطعی انکار کی جرأت کر لی جائے اور ان کے سیاسی کارناموں کو قطعًا تسلیم نہ کیا جائے، جب بھی ان کی شخصیت اتنی ہی بلند اور پُرعظمت رہتی ہے۔

اِس مجموعہ میں بعض مسائل و مباحث پر طویل مکاتیب بھی ہیں، اور ان میں ضمنی طور پر بھی بے شمار مسائل و مباحث آ گئے ہیں۔ ان میں سے بعض سیاسی خطوط محض اپنی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا مطالعہ اسی حیثیت سے کیا جانا چاہیئے۔ وہ ایک مخصوص دَور میں لکھے گئے، اور اب حالات بدل جانے کے بعد ان سے صرف علمی اور تاریخی استفادہ کیا جا سکتا ہے، برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ اور پاکستان کے پس منظر کے مطالعہ کے لئے وہ بہت اہم چیز ہیں۔ ساتھ ہی مولاناؒ کی شخصیت اور ان کے افکار و عقائد کے مطالعے کے سلسلے میں بھی ان مکاتیب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے مکاتیب سے ان کے ایک خاص زاویۂ نگاہ، اندازِ فکر اور رجحانِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ بعض مکاتیب بالکل نجی حیثیت

سے ماخوذ ہیں۔ غالبًا کسی کو خیال بھی نہ ہوا ہوگا کہ علم و ادب اور تاریخ و صحافت و سیاست کے کتنے انمول موتی اس میں چھپے پڑے ہیں۔ میں نے اس میں سے ان کو نکالا، ترتیب دیا، ان کا پس منظر واضح کیا اور جس قدر بھی ممکن ہوسکا ان پر حواشی تحریر کئے۔ مجھے ابتداء میں ان مکاتیب و رقعات کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ لیکن جب تمام مکاتیب و رقعات نقل ہوکر سامنے آئے تو حیران رہ گیا کہ یہ کس قدر بیش قیمت اور اہم ہیں اور ان کو نظر انداز کردینا کتنا بڑا ظلم ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ترتیب و حواشی سے ان کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

چند مکاتیب اس مجموعہ میں ایسے ہیں جو "تبرکاتِ آزاد" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر صاحب' میں آگئے ہیں۔ اگرچہ میرے پیش نظر شروع سے یہ تھا کہ کوئی ایسا مکتوب اس مجموعہ میں شامل نہ کیا جائے جو مولانا آزادؒ کے کسی دوسرے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہو۔ اس وقت "تبرکاتِ آزاد" میری نظر سے نہ گزرا تھا اور اس لئے مولانا سید سلیمان ندویؒ مولانا عبدالماجد دریابادی اور بعض دیگر حضرات کے نام مولانا آزادؒ کے مکاتیب کی ایک بڑی تعداد اس مجموعہ کے لئے نقل کرلی تھی، لیکن "تبرکاتِ آزاد" کے مطالعہ کے بعد وہ تمام مکاتیب پیش نظر مجموعہ سے خارج کردیئے۔ صرف چار مکاتیب کسی خاص وجہ سے اس مجموعہ میں شامل رہنے دیئے۔ مجھے امید ہے کہ یہ تکرار، تکرار قبیح کے ذیل میں ہرگز نہ آئے گی۔ ان چار مکاتیب کے اضافہ سے مجموعہ کی قیمت پر بھی ایسا اثر نہ پڑے گا جو بارِ خاطر ہو۔

یہ مجموعہ سنہ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۹۵۷ء کے ۱۷۱ مکاتیب اور ۷ دیگر تحریرات و پیغامات[۱] پر مشتمل ہے۔ یعنی ۵۷ برس میں پھیلے ہوئے نادر مکاتیب و دیگر تحریرات اس مجموعہ میں آگئی ہیں۔ اتنے طویل زمانے کی مختلف تحریرات و مکاتیب کسی مجموعے میں بھی نہیں۔ اس مجموعہ کا یہ ایک خاص امتیاز ہے۔

پیش نظر مجموعہ کے ۱۷۱ مکاتیب میں سے ۱۴۸ مکاتیب مولانا ابوالکلامؒ کے

---

[۱] ایک پیغام حکیم نثار احمد صدیقی کے نام مولانا مرحوم کے مکتوب کے ذیل میں آگیا ہے۔

اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس مجموعہ میں کوئی ایسا مکتوب نہیں جس پر مکتوب کی بجائے مضمون یا مقالے کا دھوکا ہو۔ "غبارِ خاطر" کے اکثر مکاتیب ایسے ہیں کہ اگر ان کے شروع اور آخر سے چند الفاظ نکال دیے جائیں تو ان پر مکاتیب کا گمان بھی نہیں ہوتا ہے۔ اِس لئے میرے خیال میں "غبارِ خاطر" کی حیثیت مجموعہ مکاتیب کی کم اور تحریرات کی زیادہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ "غبارِ خاطر" کے سرورق پر مرتب کے یہ الفاظ :۔

"قلعۂ احمد نگر کی اسیری (از ۹ اگست ۱۹۴۲ء تا ۱۵ جون ۱۹۴۵ء) کے زمانے کی بعض تحریرات"

ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مرتب کے ذہن میں بھی "غبارِ خاطر" کی بنیادی حیثیت "تحریرات" کی تھی "مکاتیب" کی نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو تعارف میں "بعض تحریرات" کی جگہ "بعض مکاتیب" الفاظ ہوتے۔

اسی طرح "تبرکاتِ آزاد" میں مولوی محیٰ الدین احمد قصوری کے نام بعض مکاتیب ہیں، اگر ان کے چند ابتدائی اور آخری الفاظ و سطور، جو موضوع سے ہٹ کر نوکِ قلم پر آگئی ہیں، نکال دی جائیں تو ان پر بھی مکاتیب کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص موضوع پر مضمون ہے یا ایک مستقل رسالہ۔

میری طالب علمانہ رائے میں مکاتیب کی یہ کوئی خوبی نہیں۔ مکاتیب وہی کہلاتے ہیں، جن میں نہ صرف القاب و آداب ہوں اور آغاز یا اختتام پر سلام و تحیہ یا دوسرے رسمی الفاظ کی وجہ سے ان پر مکاتیب کا گمان ہو، بلکہ مکاتیب کا ہر حصہ، ہر جملہ اور ہر سطر بلکہ ہر ہر لفظ بولتا ہو کہ وہ مکاتیب ہیں۔ مکاتیب کی یہ خصوصیت ہمیشہ سے مسلّم رہی ہے اور اسی لئے خط کو نصف ملاقات کہا گیا ہے۔

ان مکاتیب میں مولانا اپنے ہر مکتوب الیہ کے انتہائی قریب اور اس سے بولتے جاتے

کے ہیں۔ لیکن ان میں بھی ابوالکلام کی مخصوص اندازِ نگارش کی ندرت کاری اور زبان و بیان کی ایسی شگفتگی اور رنگینی موجود ہے جس کی بنا پر انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

پیشِ نظر مجموعہ کا دوسرے مجموعوں سے موازنہ مقصود نہیں، چونکہ اس مجموعہ میں دوسرے تمام مجموعوں سے کسی قدر مختلف نوعیت کے مکاتیب ہیں، اس لئے ان خصوصیات کی تلاش محض بے سود ہوگی جو دوسرے مجموعوں کا مابہ الامتیاز ہیں۔ ممکن ہے بعض خصوصیات ان سے زیادہ ہوں اور ممکن ہے دوسرے مجموعوں سے بعض خصوصیات میں یہ مجموعہ کم تر حیثیت رکھتا ہو۔ لیکن اس کی یہ خصوصیت بے مثل ہے کہ اس میں ابوالکلام آزادؒ سراپا ایک عملی انسان اور عوام سے انتہائی قریب نظر آتے ہیں۔ اس میں اس ابوالکلام کا پتہ نہیں چلتا جو جلوت سے گریزاں اور خلوت کا خواہاں تھا۔ بلکہ وہ یہاں رونق بزم و مجلس ہے۔ ان مکاتیب میں وہ اپنے کسی ہم نفس دیرینہ سے مصروفِ گفتگو اور صحبت و یکجائی کے آرزومند نظر نہیں آتے بلکہ عوامی زندگی سے انتہائی قریب اور ان کے مسائل و مشکلات کو اپنے ناخنِ تدبیر اور عقل گرہ کشا سے سلجھاتے اور کھولتے نظر آتے ہیں۔ میرا یہ کہنا غالباً خالی از حقیقت نہ ہوگا کہ اس مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ مولاناؒ کس حد تک عوامی شخصیت تھے۔

اِس سے قبل حضرت مولاناؒ کے جو مکاتیب شائع ہو چکے ہیں وہ تقریباً چوبیس[۲۴] حضرات کے نام ہیں۔ اگرچہ ان میں بے شمار مسائل و مباحث میں اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا ہے اور تاریخ و صحافت اور سیاست و مذہب وغیرہ کے مختلف میدانوں میں اشہبِ فکر اور رخشِ قلم دوڑتا اور طرارے بھرتا نظر آتا ہے لیکن جس قدر مختلف اور بے شمار میدانوں میں فکر و قلم کی جولانیاں اس مجموعہ کے خطوط میں نظر آتی ہیں اور جس قدر موضوعات اور مباحث و مسائل اس مجموعہ میں زیر بحث آئے ہیں، اتنے دوسرے کسی مجموعے میں نہ آتے ہوں گے۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے اتنے حضرات کے نام مولاناؒ کے مکاتیب پہلی بار صرف اسی مجموعہ میں سامنے آئے ہیں۔

شبلیؒ سے عقیدت کے باوجود تعلّقات و معاملات میں انھوں نے ہمیشہ برابری کا برتاؤ کیا اور کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ خود کو ان کے مقابلے میں ثانوی حیثیت دی جاتے، ان کی یاد ہمیشہ ممدوح کی حیثیت سے آتی لیکن یہ ممدوح ان کے پیر یا اُستاد کا قائم مقام نہ تھا بلکہ ایک ایسا دوست تھا جس کے فضل و کمال نے اسے ممدوح و محترم بنا دیا تھا۔ شبلی و حالی سے مولاناؒ کی عقیدت ایک شاگرد اور مرید کی عقیدت نہ تھی بلکہ ایک ایسے ہم رُتبہ دوست کی عقیدت تھی جسے دوست کے علمی و اخلاقی کمالات نے مُعتقد بنا دیا ہو۔ لیکن جس طرح شبلی و حالی سے حددرجہ عقیدت اور نیازمندی کے باوجُود ان کی انفرادیت اور انانیت ہر جگہ موجُود رہی، اسی طرح مولانا عبدالرزّاق کان پوری کے نام خط میں بھی عقیدت و نیاز کے ساتھ ان کی انانیت بھی پُوری طرح جلوہ گر ہے۔

اس مکتوب کی یہ اہمیت بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ مولانا آزادؒ کا سب سے پہلا مکتوب ہے، جو اب تک دستیاب ہوا ہے۔ اِس سے پہلے کا کوئی مکتوب اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اِس کے علاوہ بھی یہ مکتوب ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ اس مکتوب سے اس روایت کی تردید ہو جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ شبلی سے مولاناؒ کی پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی۔ اس مکتوب کے ذریعہ پہلی بار اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ علامہ شبلی نعمانی سے مولانا آزادؒ کی پہلی ملاقات دسمبر ۱۸۹۹ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کلکتہ میں ہوئی تھی اور اِس کے بعد ہی سلسلۂ خط و کتابت شروع ہو گیا تھا۔

مولوی عبداللطیف کے نام مولاناؒ کے مکتُوب کو ہم ایک درخواست بھی کہہ سکتے ہیں، اس میں مولاناؒ نے اپنی ضرورت کا اظہار کیا ہے لیکن ان کی انانیت وہاں بھی موجُود ہے، وہ اپنی خودداری پر حرف آنے دینا پسند نہیں کرتے، ان کی درخواست میں بھی استغنا کی شان پائی جاتی ہے۔ انھیں اپنی بڑائی کا احساس ۱۹۰۱ء میں بھی تھا جب کہ ان کی عمر تیرہ

نظر آتے ہیں، وہ کسی ایک مقام پر بھی جذبات کی روانی، بحث کے انہماک اور ردّ و انکار کے جوش میں نہ مکتوب الیہ کو بھول جاتے ہیں اور نہ اس کی انفرادی نفسیات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

"غبار خاطر" کے اکثر اور "تبرکاتِ آزاد" کے بعض مکاتیب میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزادؒ کے سامنے جب کوئی موضوع علم و فن کھل جاتا ہے تو ان کے انہماک و استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ مخاطب کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت خالص علمی اور فنی تحریرات کی ہے مکتوبات کی نہیں۔

اس مجموعہ کے مکاتیب میں مولاناؒ کی سیرت و کردار اور اخلاقی کمالات، نیز ان کے عقائد و افکار کے جو مختلف گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان محدود صفحات میں ان سب کا احاطہ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ چند باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔

مجموعہ کے سب سے پہلے مکتوب میں وہ سر تاپا ایک نیاز مند اور عقیدت کیش کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ مولاناؒ کا یہ معاملہ اگر مکاتیب کی روشنی میں دیکھا جائے تو مولانا الطاف حسین حالی اور حضرت علامہ شبلی نعمانی کے ساتھ مخصوص تھا۔۔ ان کے علاوہ اور کوئی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جس سے مولاناؒ کے عقیدت مندانہ تعلقات ہوں۔ مولانا حالی مرحوم سے انھوں نے ایک سے زیادہ جگہ پر اپنی عقیدت مندی کا ذکر کیا ہے۔ پھر یہ عقیدت مندی کسی محدود زمانہ کا تأثر نہ تھا۔ اسی طرح حضرت علامہ شبلی مرحوم سے ان کی عقیدت مندی آخر تک باقی رہی۔ ان کا جہاں کہیں بھی ذکر آیا اور جب بھی ان کی یاد آئی تو زبان و قلم بے قابو اور دل بے چین ہو گیا۔ ان دو اعاظم رجال کے علاوہ صرف مولانا عبدالرزاق کانپوری کے حضور میں وہ ایک عقیدت کیش کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان سے یہ عقیدت مندی چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ شاید میری نظر سے مولاناؒ کی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس میں مولانا عبدالرزاق کانپوری کا ذکر آیا ہو اور ان کی یاد نے بے چین کر دیا ہو۔ لیکن حضرت علامہ

یہ بات صبر و برداشت سے باہر ہوگئی چنانچہ انھوں نے نہ صرف مولاناؒ کی اجازت کے بغیر سفر کا ارادہ کر لیا بلکہ ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس پر انھیں خود بھی بعد میں شرمندگی ہوئی۔ مولانا ملیح آبادی کے الفاظ میں پورا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ "گستاخی" کے عنوان سے "ذکر آزاد" میں تحریر فرماتے ہیں:

"رانچی کا سفر ٹلتا رہا۔ آخر میں نے طے کر لیا کہ بغیر اجازت ہی چل دوں۔ پورا اخبار تیار کر چکا تھا اور بعد کے نمبر کے لئے بھی کئی مضمون لکھ ڈالے تھے، رانچی رات کو ریل جاتی تھی۔ چلنے سے پہلے مولاناؒ کے لئے رقعہ لکھ دیا کہ وطن سے تار آیا ہے اور میں جا رہا ہوں۔"

یقیناً یہ میری بڑی اخلاقی کمزوری تھی کہ غلط بیانی سے کام لیا۔ مجھے صاف صاف لکھ دینا تھا کہ رانچی جا رہا ہوں۔ آج تک اپنی اس اخلاقی گراوٹ پر سخت نادم ہوں۔

چوبیس ۲۴ گھنٹے ٹھہر کر رانچی سے لوٹ آیا اور آتے ہی معلوم ہو گیا کہ مولاناؒ میرا پرزہ پاکر فوراً نیچے اتر آئے تھے۔ بہت برہم تھے۔ اخباروں میں ٹائم ٹیبل دیکھا۔ انکوائری آفس سے فون پر ریل کے اوقات معلوم کئے، سمجھ گئے کہ رانچی گیا ہوں۔

صبح کو مولاناؒ اپنے کمرے میں آکر بیٹھے اور میں مضامین لے کر پہنچا تو چہرے سے خفگی ظاہر تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگے:

مولاناؒ گھر پر خیریت تو ہے؟

میں۔ (سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے) جی ہاں

مولاناؒ مولوی صاحب! آپ دفعتاً چلے گئے۔ رات ہی کو تار آیا تھا؟

میں۔ کچھ ایسی ہی بات تھی!

مولاناؒ آپ میں اخلاقی کمزوری ہے۔ آپ کو شرمندہ ہونا چاہیئے!

میں۔ یہ نہ فرمائیے۔

یہ کہتے ہوئے مجھ پر غصہ کا سخت دورہ پڑا۔ ہاتھ کے مضمون مولاناؒ کے منہ پر

برس سے زیادہ نہ تھی اور درسیات میں وہ اس وقت تک کتبِ وسطیٰ تک بھی نہ پہنچے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ اس وقت محض ایک طفلِ مکتب تھے، اور اس وقت بھی انھیں اپنی خودداری کا احساس و پاس تھا جب ان کی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اگرچہ وہ اس وقت تک مشہور علمی و ادبی رسائل و اخبار مثلاً لسان الصدق کلکتہ، الندوہ لکھنؤ، اور وکیل امرتسر کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ ان کی یہ خودداری زندگی بھر ان کے ساتھ رہی اور ان کی انانیت ان کی زندگی کے ہر گوشے اور ہر عمل سے جھلکتی رہی۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام مکاتیب میں مولانا کے اخلاق کا ایک ایسا پہلو نمایاں ہوتا ہے جو مولانا کے تقریباً چھ سو مطبوعہ مکاتیب (بشمول مکاتیب مجموعہ ہٰذا) اور ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی دیگر تحریرات میں کسی ایک جگہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ ملیح آبادی کے نام مکاتیب میں نہ تو وہ اپنا علمی تفوق ظاہر کرتے ہیں، نہ سراپا عالمِ دین اور کل ہند سیاسی رہنما کے روپ میں نظر آتے ہیں، نہ ان پر کسی قسم کا رعب اور اثر ڈالتے ہیں پھر بھی ملیح آبادی ان کی بارگاہ میں بے تکلف دوست اور ساتھی کی حیثیت سے نہیں جا سکتے۔ بعض مکاتیب میں وہ ایک رفیق اور ساتھی نظر آتے ہیں جو اپنے دوست کے جذبات کا انتہائی احترام کرتا ہے، کہیں ایک شفیق کے روپ میں نظر آتے ہیں، جو اپنے چھوٹے کی ناسمجھی پر کڑھتا ہے اور بے چین ہوتا ہے حتیٰ کہ کہیں کہیں وہ سراپا نیاز مند نظر آتے ہیں۔ ان مکاتیب کے پس منظر میں مولانا ملیح آبادی جس قدر جذباتی اور غیظ و غضب میں بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، مولانا کے مکاتیب میں اتنے ہی صبر، ضبط اور تحمل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہاں پر مولانا کے اخلاق کے اس پہلو کو سامنے لونے کے لئے میں کسی قدر تفصیل سے کام لوں گا۔

۱۹۲۷ء میں جب کہ "الہلال" (دورِ ثانی) کو نکلے زیادہ دن نہ گزرے تھے اور تین نمبر ہی شائع ہوئے تھے، مولانا ملیح آبادی رانچی جانا چاہتے تھے، لیکن مولانا اس موقع پر ان کا یہ سفر مناسب خیال نہ کرتے تھے، اس لئے ٹال دیتے تھے۔ ... مولانا ملیح آبادی کے لئے

زرین اصول اور رشد و ہدایت کا کوئی نکتہ موجود ہے، یا مکتوب نگار کی زندگی کے علمی، عملی یا اخلاقی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے یا اس سے ان کے کسی مخصوص طرزِ فکر، زاویۂ نگاہ اور افکار و خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ مکاتیب مولاناؒ کے علم و بصیرت پر دلالت کرتے ہیں، ان کی باریک بینی اور ژرف نگاہی پر شاہد ہیں، ان کے صبر و ضبط اور تحمل کا بیان ہیں، ان کی اعتدال و انصاف پسندی کا ان میں مواد موجود ہے، ان کے مرتبۂ ایمانی اور اخلاقی کمالات کی دستاویز ہیں اور ان کے کردار کی بلندی اور سیرت کی عظمت کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ ان کی زبان و بیان اور اسلوب تحریر کی ندرت کاری کا نادر نمونہ ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ نہ صرف ادب و تاریخ کے شیدائیوں اور مذہب و سیاست کے طالب علموں کے لئے مفید ہوگا اور ان کی توجہ کا مرکز بنے گا بلکہ سماجی اور سوشل کارکنوں اور عوام کی اصلاح و تہذیب کا جذبہ و داعیہ رکھنے والوں کے لئے بھی سبق آموز ہوگا۔

مولاناؒ کا زندگی بھر یہ اصول رہا کہ اُنھوں نے جواب کے لئے کبھی کسی کے بھیجے ہوئے ٹکٹ یا لفافہ قبول نہیں کیا۔ اکثر لوگ جو مولاناؒ کے اس اخلاقی اصول سے واقف نہ تھے خط کے ساتھ ٹکٹ یا لفافہ بھی بھیج دیتے تھے تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو یا جواب یقینی ہوجائے لیکن مولاناؒ ہمیشہ اور ہر کسی کے بھیجے ہوئے ٹکٹوں کو واپس کردیا کرتے تھے اور لکھ دیتے تھے کہ جواب کے لیے ٹکٹ بھیجنے کی ضرورت نہ تھی جواب دینا اخلاقی فرض ہے۔

اس دَور میں جب کہ بعض بڑے اخبار و رسائل باقاعدہ اعلان چھاپتے ہیں کہ جواب طلب امور کے لئے فلاں قیمت کے ٹکٹ یا لفافہ آنا ضروری ہے اور بعض بڑے آدمی متمنی رہتے ہیں کہ خط کے ساتھ ٹکٹ یا لفافہ آجائے، مولاناؒ کا یہ اخلاقی اصول اور زندگی بھر کا معمول حیرت انگیز نہیں تو کیا ہے؟

تقسیم ملک کے بعد کی کئی ایسی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں کہ بعض حضرات نے

کھینچ پھینکے، اور یہ کہتا ہوا کمرے سے نکلنے لگا: "میں آپؒ کے ساتھ کام نہیں کروں گا!"
مگر مولاناؒ نے لپک کر پکڑ لیا اور عجیب لہجے میں فرمانے لگے "میں نے تو کوئی گستاخی نہیں
کی۔ مجھے معاف کر دیجیے!"

لیکن میں غصّے سے بے خود ہو رہا تھا۔ اپنے کمرے میں چلا آیا اور اسباب باندھنے لگا معًا
مولاناؒ کے آخری لفظ یاد آ گئے۔ اپنی بھیانک حرکت بھی یاد آ گئی، ایسا معلوم ہوا کہ شرم و
ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔ انتہائی کوفت کے عالم میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا اور اس
وقت چونکا، جب تیسرے پہر کو ملازم نے آ کر کہا "مولاناؒ، چائے کے لئے بلا رہے ہیں"
اب میرے لئے اور بھی مصیبت تھی۔ نہ شرم سے جا سکتا تھا، نہ جانے سے انکار کر سکتا
تھا۔ جانا ہی پڑا، مگر پاؤں اُٹھتے نہ تھے، جیسے من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ بڑی مشکل سے
پہنچا، مگر نگاہیں زمین پر گاڑے، بالکل سنگین مجرم کی طرح، مگر مولاناؒ نے دیکھتے ہی ایسی
بشاشت سے گفتگو شروع کر دی اور دنیا جہاں کے ایسے ایسے لطیفے چھیڑ دیئے کہ میں اپنا قصور
ہی بھول گیا اور بے اختیار کھلکھلانے لگا۔ بعد میں کبھی مولاناؒ نے نہ میری اس شرمناک
حرکت کی طرف اشارہ کیا، نہ مجھے معذرت ہی کرنے کا موقعہ دیا۔"

یہ معاملہ تو مولاناؒ کا اپنے ایک خورد اور رفیق کے ساتھ تھا، لیکن ٹھیک اسی زمانے
کا واقعہ ہے کہ ... کلکتہ کا ڈپٹی پولس کمشنر ان کو بلاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ طبیعت ناساز ہے
اور حاضری سے معذور ہیں لیکن ایک پبلک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا جا چکا ہے وہاں
ضرور جائیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سیرت و اخلاق کا یہ وہ پہلو ہے اور کردار کی یہ وہ بلندی
ہے جسے مولاناؒ کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والا نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

غرض کہ مجموعہ کا ہر مکتوب اپنی جگہ پر ایک علمی و ادبی جواہر پارہ، تاریخ و حکمت کا
انمول موتی ہے یا اس میں عبرت و موعظت اور اخلاق کا کوئی سبق، معاشرت کا کوئی

درجہ احترام اور عقیدت پنہاں ہے اور "حضرت" میں کس درجہ سادگی اور بے تکلفی موجود ہے۔ صرف ان القاب کی روشنی ہی میں آزاد شبلی تعلقات کی نوعیت، شبلی سے ابوالکلام کی عقیدت اور ابوالکلام کی انفرادیت و انانیت کی ایک کہانی لکھی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مولانا حالی کو "یا جناب الجلیل الاعز" کے القاب سے مخاطب فرمایا ہے اور صرف اس القاب میں اپنی عقیدت اور نیازمندی کی پوری حکایت بیان کر دی ہے۔ مولانا کے ہاں ان کے دوستوں اور عقیدت مندوں کے خاص خاص درجے ہیں اور ان کے لئے مخصوص القاب۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے لئے "صدیق مکرم" مخصوص القاب تھا، عام دوستوں کو وہ "صدیقی" لکھا کرتے پھر ان میں بھی درجے تھے بعض صدیق صدیقی العزیز" اور "صدیقی الاعز" کے درجۂ علیا سے تعلق رکھتے تھے اور بعض محض "صدیق" کے زمرے میں آتے تھے۔ حضرت شروانی اور مولانا سید سلیمان ندوی دوستوں کے اسی درجۂ علیا سے تعلق رکھتے تھے، جس طرح حضرت شروانی کے لئے "صدیق مکرم" مخصوص تھا اسی طرح حضرت سید صاحب مرحوم کے لئے "اخی" "یاصدیقی الاعز والاجل" استعمال کرتے تھے۔ اور جن عزیزوں سے ان کو خاص تعلق خاطر ہوتا اور وہ عمر میں ان سے چھوٹے بھی ہوتے ان کو وہ ہمیشہ "عزیزی" کے محبت آمیز القاب سے مخاطب فرماتے تھے۔ عام لوگوں کے لئے ان کا مخصوص القاب "محبی فی اللہ" تھا۔ اس کے علاوہ ابتدائی دور کے ایک دو مکتوب میں "جناب مکرم" اور "شفیق مکرم" اور ایک دو مکتوب میں "مکرمی" یا "جناب من" بھی استعمال کیا ہے۔

القاب کے استعمال میں مولانا کا ایک ایسا معمول اور طریقہ رہا ہے کہ صرف القابات کی روشنی میں ان کے ممدوحین، صدیقین اور محبین کی ایک فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔ اور القابات کی روشنی میں ان کے مخاطبین کے درجات بلحاظ تعلق خاطر متعین کئے جاسکتے ہیں۔ بلکہ یہ نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ مولانا کا کونسا مکتوب الیہ کتنی مدت کی خط و کتابت کے بعد کس زمانہ میں عام سے خاص اور پھر خواص کے کس درجے میں داخل ہوا۔ یا کس مکتوب الیہ سے

خط لکھا لیکن مولانا رح کی جانب سے جواب نہیں ملا۔ شاید یہ بات ان کے لئے خلاف توقع اور باعث حیرت ہو اور ممکن ہے وجہ شکایت بھی ہو۔ میں یہاں اس شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا رح کے نام سینکڑوں خطوط روزانہ آتے تھے۔ ان میں نجی و شخصی معاملات اور ذاتی حالات و شکوک و شبہات سے متعلق عرض و گزارش سے لے کر ملک و قوم اور ملت کے اہم ترین تعلیمی، سماجی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر استفسار، مشورے اور اطلاعات ہوتی تھیں۔ حضرت مولانا رح کے سکریٹری ان میں سے اہم ترین مراسلات کا انتخاب کر لیتے اور وہی مولانا رح کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ان میں سے بعض مختلف محکموں اور اداروں کو ان پر کارروائی کے لئے بھیج دیئے جاتے اور بعض کے جوابات کے لئے وہ اپنے کسی سکریٹری کو ہدایت فرما دیتے۔ غیر اہم مراسلات کی مولانا رح کو خبر بھی نہ ہوتی۔ یہ فیصلہ ان کے سکریٹری کرتے کہ کونسا خط اہم ہے اور کونسا غیر اہم۔ مولانا رح جیسا کوئی بھی مصروف شخص اگر سیکڑوں خطوط کا مطالعہ کرنا، پھر جواب لکھنا یا لکھوانا بھی چاہے تو ان میں سے ایک بات بھی ممکن نہیں۔ اگر اس بارے میں کسی صاحب کو شکایت ہو تو انھیں ان حالات پر غور کرنا چاہیئے۔

اردو خطوط نویسی میں لمبے چوڑے القاب و آداب لکھنے کا عام رواج تھا اور کم از کم پرانے خیال کے لوگوں اور خصوصاً دینی اور مذہبی حلقوں میں آج بھی اسی رسم کہنہ کی پابندی کی جاتی ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد رح نے اس معاملے میں بھی رسم و رواج عام سے اپنی راہ الگ بنائی۔ اس سلسلے میں ان کا صرف ایک اور سب سے پہلا مکتوب ہے جس میں انھوں نے طویل القاب یعنی "حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدفیوضہ" استعمال کیا ہے۔ اس کے سوا مولانا رح نے کسی چھوٹے بڑے کو لمبے چوڑے القاب سے مخاطب نہیں کیا۔ مولانا شبلی کا وہ بے حد احترام کرتے تھے لیکن ان کے نام مکاتیب میں بھی آداب و القاب میں طوالت پسند نہ کی، بلکہ صرف "آقائے من" یا "یا مولی الجلیل" اور ایک مکتوب میں تو وہ خالص لکھنوی انداز میں "حضت!" لکھ کر مخاطب کرتے ہیں۔ غور فرمایئے کہ آقائے من اور یا مولی الجلیل میں کس

مجموعہ کے آخر میں "چند دیگر تحریرات" کے عنوان سے مولانا کے قلم سے چند سوالات کے جوابات اور چند پیغامات وغیرہ ہیں۔ ان میں سے ہر تحریر اپنی جگہ ایک خاص اہمیت رکھتی تھی اور ان کا محفوظ کر دینا ضروری خیال کیا۔ اس لئے انھیں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا مطالعہ بھی افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ ہر تحریر کے ساتھ ایک تمہیدی عبارت ہے جس سے اس کا پس منظر واضح ہو گیا ہے اور اس کی اہمیت خوب تر سمجھ میں آجاتی ہے۔

روزِ اوّل سے تعلّق کی کیا نوعیت تھی؟

مکاتیب کے صرف القابات کے مطالعے سے یہ بات قطعیّت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ عام لوگوں سے مولاناؒ کے تعلقات کی بنیاد اور نوعیت کیا تھی؟ ان کا معاملہ نہ کسی ذاتی غرض پر مبنی تھا، نہ کوئی شخصی مفاد پیشِ نظر ہوتا تھا، نہ دوسروں کی نظر میں خود کو محبوب وہر دلعزیز بنانے کا جذبہ وسعی کارفرما ہوتی تھی۔ عوام سے ان کا تعلّق اسلام کے بلند اصول "الحبّ فی اللہ والبغض فی اللہ" پر مبنی تھا۔ وہ ہر کسی سے اسی بنیاد پر ملتے اور اسی غرض سے خط وکتابت کرتے تھے۔ اس کے سوا ان کے یہاں عوام سے تعلّق کا کوئی اور تصوّر نہ تھا۔

مولاناؒ کے مکاتیب کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا ضروری خیال کرتا ہوں اور وہ ہے مولاناؒ کے مکاتیب میں "سلام" کا مقام ومحل! عام طور پر سلام وتحیہ مکاتیب کی ابتدا میں لکھا جاتا ہے۔ بظاہر مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ملاقات کے وقت پہلے سلام ومزاج پرُسی کی جاتی ہے پھر دوسری گفتگو کرتے ہیں، مکاتیب میں بھی یہی رسم اختیار کی جائے، لیکن بجز چند مکاتیب کے مولانا آزادؒ کا معمول اس سے قطعی مختلف رہا۔ وہ "سلام" ہمیشہ مکتوب کے اختتام میں لکھتے تھے۔ یہ ترک واختیار حقیقتاً مولانا آزادؒ کی انانیت اور رسم ورواجِ عام کی تقلید سے نفور کا نہیں بلکہ اس سے ان کے رجحانِ طبع اور اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا غلام رسُول مہر صاحب کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"تحریر میں بھی تحیہ اَولیٰ ومُستحسن ہے، جس طرح ملاقات میں، لیکن اس کا موزوں محل ابتدا میں ہے یا اختتام میں؟ اس بارے میں اختلاف ہوا۔ امام احمد بن حنبلؒ اختتام کے محل کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی طریقہ مکتوباتِ نبویہ میں ملحوظ رہا ہے، میں بھی اکثر یہی طریقہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ معہذا دوسرا طریقہ بھی معمول بہا ہے اور موجب ردّ وقدح نہیں۔"[۱]

(حصۂ دوم)

فہرست

چند دیگر تحریرات

(۱) مولانا عبدالرزّاق کانپوری کے نام

حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدّ فیوضہٗ

السلام علیکم۔ مزاج شریف، والانامہ وررود ہوا، شرفِ افتخار ہمراہ لایا۔ خادم آپ کی اس عنایت بے غایت کا صد درجہ ممنون و مشکور ہوا کہ اس نالائق پر نظر مشفقانہ فرمائی اور جواب عریضہ سے افتخار و عزت افزائی بخشی ؎

یہ فقط آپ کی عنایت ہے ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا!

فی الواقع آپ کی ذات بابرکات مغتنماتِ روزگار سے ہے۔ اللہ جل شانہٗ آپ کو صد وسی سال سلامت رکھے اور مکروہاتِ زمانہ سے محفوظ۔ ع

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

آپ نے جس اہم کام کا بیڑا اُٹھایا ہے، فی الواقع نہایت ہی مشکل ہے۔ بلا رو رعایت عرض کرتا ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ اس پُرخطر میدان میں بہادرانہ قدم رکھا، انشاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے اور عنقریب آپ کی بیش بہا تصنیف سے ملک مستفیض ہوگا۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لائف میں نے تھوڑے عرصہ سے شروع کردی ہے، لیکن جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، واقع میں ایک بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اور وقتِ کثیر درکار ہے، لیکن السعی منّی والاتمام من اللہ، کا مقولہ ہر وقت پیش نظر ہے، اور اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو اپنے کام میں کامیاب ہوں گا اور ضرور ہوں گا۔ اعظم گڈھ میں مولانا شبلی نعمانی کا عمدہ کتب خانہ ہے۔ گزشتہ کانفرنس میں (جو کلکتہ میں جلسہ ہوا تھا[۱]) مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ آپ کے مفید کتبخانہ سے خادم بھی مستفیض

[۱] آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس سیزدہم منعقدہ کلکتہ ما دسمبر ۱۸۹۹ء۔

(۲)

حکیم محمد علی خاں کے نام

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۱ر جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعہ

جنابِ حکیم صاحب! السّلام علیکم و علیٰ من لدیکم

مجھے آپ کے مرقع عالم سے کس قدر شفقت ہے، اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بمبئی میں مرقع عالم سنین ماضیہ کے پرچے جب میں نے طلب کئے تھے اور کارپرداز کی غفلت کے سبب فرمائش کی جلد تعمیل نہ ہوئی تھی تو اس وقت میں نے متواتر رجسٹرڈ خطوط روانہ کئے تھے یعنی طبیعت میں اس کا ایک شوق بڑھا ہوا تھا اور بدگمانی اس امر کا موقع ہی نہیں دیتی تھی کہ خط کے نہ پہنچنے کو تسلیم کر کے عدم تعمیل فرمائش کو کسی اور وجہ پر محمول کرتا اگرچہ رجسٹرڈ خطوط کا کسی چیز کی فرمائش کے لئے ارسال کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے، مگر ایک ایسی حالت میں کہ ناقدری کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہو، اور لوگوں کو ایک کارڈ بھیجنا بھی بار گزرتا ہو اس قدر اشتیاق کا ہونا کہ فرمائش کے لئے پیڈ خطوں اور کارڈوں پر بھروسا نہ کر کے متواتر رجسٹرڈ خطوں کا ارسال کرنا ایک خصوصیت کا پہلو رکھتا ہے۔

مگر کچھ دنوں سے میں بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے مرقع عالم اپنی ایک خاص خصوصیت کو جو اور ہندوستانی میگزینوں میں اس کے لئے مابہ الامتیاز تھی، کھو بیٹھا ہے۔ اس لئے پبلک کو وہ توجہ جو پچھلے دنوں اس کی طرف مبذول تھی، ایک حد تک جاتی رہی، وہ کیا؟ پنکچوالٹی یعنی پابندیٔ وقت۔ پس اب اور ذرا آپ ادھر متوجہ ہوں۔ اور ایک سال کا جو آپ کا قرض باقی ہے، اسے جلد جلد ادا کر کے آئندہ سے اس میں پابندی کا جادو پیدا کر دیں۔

اس عریضہ کے ہمراہ ایک مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ارسالِ خدمت

ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ میں فہرست بھیجوں گا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی اس لئے ارسال نہیں کی۔ کل بھی میں نے شبلی صاحب کے یہاں عریضہ لکھا ہے۔ چونکہ آج کل "ہیروز آف اسلام" میں سے صلاح الدین ایوبی کی لائف لکھتے ہیں، کم فرصت ہے۔

پٹنہ کی بابت جو کچھ آنجناب نے تحریر کیا ہے، بجا ہے: ۱۱ رجب المرجب کو میں پٹنہ جاؤں گا کیونکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہے[1]، اس لئے وہاں کے کتب خانہ کی بھی سیر ہو جائے گی اگر تصنیفاتِ غزالیؒ مل گئیں، دیکھ لی جائیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ابھی صرف احیاء العلوم پر ایک تفصیلی ریویو کیا گیا ہے۔ اور جو کتابیں دستیاب ہوئیں، ان سے امام صاحبؒ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ مصر وغیرہ سے کتابوں کے لئے خطوط لکھے ہیں طبقات الشافیہ تو موجود ہے۔ آپ دعا کیجئے!

تمدن عرب، الفاروق، دربارِ اکبری، ترجمۂ قرآن نظم وغیرہ۔ میں قبل منگا چکا ہوں۔ سبحان اللہ یہی کتابیں تو ہمارے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔

دیگر یہ تحریر فرمائیں کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں، ان کے ترجمے اردو میں بھی دستیاب ہوتے ہیں؛ اگر یہ صحیح ہے تو کہاں ہوتے ہیں؟ تحریر کیجئے گا۔

خادم العلماء

غلام محی الدین آزاد کان اللہ لہٗ

---

[1] ۱۴ راگست سنہ ۱۹۰۰ء کو ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ میں طے کیا گیا تھا کہ ۱۱ رجب سنہ ۱۳۱۸ھ مطابق ۴ رنومبر سنہ ۱۹۰۰ء کو پٹنہ میں سالانہ جلسہ ہو۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا آزادؒ کا یہ خط ۱۴ راگست اور ۴ رنومبر سنہ ۱۹۰۰ء کی درمیانی مدت کا ہے۔ مولانا رحمہ کا یہ سب سے پہلا خط ہے جو اب تک دستیاب ہوا ہے۔

بھی ایسے نہ ہوں گے، جنھیں اس کی توسیع اشاعت کا خیال ہو؛ میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک صاحب احباب خریدار میں سے ایک ماہ کے اندر پانچ خریداروں کو بہم پہنچانے کا ذمہ لے لے۔ اگر وہ مہینے کے اندر نہ بہم پہنچا سکے تو دس روپے دے کر پانچ پرچے خرید لے، اس کا اسے اختیار ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس تجویز پر محبّانِ علوم غور فرما کر عمل فرمائیں گے۔ کیونکہ جب تک ایسا خیال ساری قوم میں نہ ہوگا، کبھی علمی ترقی نہیں ہو سکتی۔

میں نے آپ کی تمام تصانیف پر ایک ریویو بھی لکھا ہے، اسے بھی عنقریب ارسال کروں گا، جس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مرقع عالم کیا چیز ہے اور ہم اس کی کیسی ناقدری کر رہے ہیں۔ زیادہ نیاز۔

خادم احباب

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد، دہلوی مقیم کلکتہ

از کلکتہ امرتلہ لین۔

کرتا ہوں اسے مرقع میں شامل کیجیے۔ انشاء اللہ نمبر ۳ و نمبر ۴ بھی ارسال خدمت عالی کر دوں گا۔

آپ جانتے ہیں اور یقیناً مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ محرکین تعلیم انگریزی کی انگریزی کی اشاعت سے کیا غرض تھی۔ اشاعت علوم، مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعہ ملازمت سمجھ لی گئی۔ اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے نہ فلسفے سے، بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور دس[1] روپے پر ملازم ہو گئے۔ پس حالتِ موجودہ کے لحاظ سے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا ترجمہ کیا جائے اور سائنٹفک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے۔

مولوی محمد عمر صاحب[1] نے واقعی یہ بہت اچھا کیا کہ مرقع عالم کو علوم مغربی کا مخزن بنا لیا، ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے، مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعت علوم مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندوستان میں پھیل رہا ہے اور جب اس میں ترقی ہو گی[2] تو اس میں بھی یقیناً ہو گی۔ پس اس لیے ضروری ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کر لیا جائے۔ آپ کہیں گے کہ وہ کونسا مرض ہے؟ حضرت! وہ دہریت اور لامذہبیت کا مرض ہے جو مذہب کی پاک زندگی کا کام تمام کر دیتا ہے اور جس نے یورپ کو مذہب کی قید سے آزاد کر دیا ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام کو ناواقفوں نے سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے، اس لیے انھیں مذہب کے خلاف کرنا ضروری ہے۔ میں نے اس خیال سے کہ جب مرقع عالم میں سائنس کے تراجم شائع ہو رہے ہیں تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے، یہ مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" آپ کے پرچے کے لیے بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو گا اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھیں گے۔

مرقع عالم کے غالباً ہزار سے زیادہ خریدار ہوں گے۔ کیا ہزار میں نصف، پانچ سو

---

[1] مولوی محمد عمر صدیقی مرقع عالم کے ایک مضمون نگار تھے سائنس اور علوم مغربی پر بہت سے مضامین انگریزی سے ترجمہ کر کے مرقع عالم میں شائع کراتے تھے۔ [2] علوم مغربی کی اشاعت میں۔

میں کوئی امر مانع نہ ہو، ڈھاکہ سے واپسی پر اخبار جاری ہوجائے گا اور انشاء اللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہوجائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر نہ ہوگا۔ بالخصوص اس حالت میں کہ یہ پیشگی رقم میرے لئے ایک نہایت کارآمد اور بے حد مفید رقم ہوگی۔

اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کی دوستانہ توجہ کا ممنون ہوں اور ممنون رہوں گا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

۲۵ر دسمبر ۱۹۰۶ء

(۴)

مولوی عبداللطیف مرحوم کے نام

[اواخر ۱۹۰۶ء میں اخبار وکیل امرتسر سے مولانا آزادؔ کلکتہ تشریف لے آتے تھے۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے مولوی عبداللطیف مالک اخبار "دارالسلطنت" سے تعارف کرایا اور طے پایا کہ دارالسلطنت (ہفت روزہ) جو دنوں سے بند تھا، مولانا آزادؔ کی ادارت میں دوبارہ جاری کیا جائے۔ انہی دنوں میں آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈھاکہ میں اجلاس ہو رہا تھا۔ جس میں مولانا آزادؔ شرکت کے خواہاں تھے، مصارف سفر کے لئے رقم کی ضرورت تھی، مولانا نے پیشگی رقم طلب کی۔ ۱۹۰۷ء کے شروع میں کچھ دنوں تک دارالسلطنت نکلتا رہا تھا۔]

۱۱، کولھو ٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

جناب مکرم!

افسوس ہے کہ کثرت کار اور ہجوم احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خود حاضر ہوں۔ پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ چکی ہے اور صرف ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہے۔ میں اس کو بھی ابھی طے کر لیتا، مگر ہجوم احباب ایک گھنٹے کی فرصت نہیں دیتا، اس لئے آج شام کو ڈھاکہ روانہ ہوں گا، پہلی جنوری کو یقیناً واپس آجاؤں گا۔ پہلی سے ۷ ار تک کافی وقت ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد قیام پریس کی صورت ہوجائے گی۔

لیکن ایک انتہائی ضروری معاملہ ہے، جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورتیں متقاضی نہ ہوتیں تو میری خودداری اس کے لکھنے سے سخت مانع آتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق اخبار مجھے اس وقت پیشگی دے دیں۔ بشرطیکہ پیشگی دینے

(۵) (۲)

۱۳۔ مکلاوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۶ ۱۰/۹ ء

یا مولی الجلیل

تعلیقہ مبارک پہنچا، پچھلے کارڈ میں آپ نے لکھا تھا کہ غضب ہے کہ تم ضروری باتوں کا بھی جواب نہیں دیتے، سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کونسی ہوتی ہے؟ کتابیں خط کے ساتھ رجسٹرڈ روانہ کی گئیں، لیکن کبھی کبھی ڈیلوری میں تاخیر ہوجاتی ہے۔ ہاں البتہ اگر کتاب الوفاء دار المصطفیٰ[1] کا نسخہ ہاتھ آیا ہے، تو نہایت نایاب ہے۔ شیخ عبدالحق محدّث کو بھی غالباً نہیں ملا، کیونکہ جذب القلوب میں صرف خلاصۃ الوفاء کا خلاصہ و ترجمہ ہے۔

دیوان صائب سے کیا وہ نسخہ مقصود ہے جو امپیریل لائبریری میں بخطِ مصنف موجود ہے؟ اس کا عکس جب چاہیں لے سکتے ہیں، کیونکہ لائبریرین ہری ناتھ دے سے شناسائی ہے۔

اوّل تو میں اب کلکتہ سے کہاں نکلتا ہوں، لیکن نمائش الٰہ آباد کا ضعیف سا خیال ہے، اگر مسئلہ قیام پیش نظر، الٰہ آباد میں میری کسی سے ایسی ملاقات نہیں، کہ اپنا بوجھ ڈالوں۔ ایک دو بار مسٹر اسحٰق کے ہاں ٹھہرا مگر برسم طفیلی، کہ جب آپ کہیں ٹھہریں گے تو آپ کے خدام و وابستگان بھی لا محالہ، میں بھی ایک چاکر گستاخ تھا کہ ٹھہر گیا۔

علاوہ بریں وہ زمانہ ایسا ہوگا کہ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ زائرینِ نمائش کا ہجوم، اور

---

[1] کتاب کا نام "وفاالوفا باخبار دار المصطفیٰ" ہے۔ یہ کتاب ۱۳۲۶ھ یعنی ۱۹۰۸ء میں چھپی تھی (دو جلدوں میں) اور تحریر مکتوب کے زمانے میں یقیناً نایاب تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو اس کی صرف تلخیص ملی تھی، جس کا ترجمہ انھوں نے "جذب القلوب الی دیار المحبوب" کے نام سے فارسی میں مرتب کیا۔

(۴)

حضرت علّامہ شبلی کے نام

(۱)

آقائے من !

آج پُرانے کاغذات میں لفافے ڈھونڈ رہا تھا، آپ کے چند خطوط اور کارڈ نکل آئے، میں پھر اسی تمنّا زار میں پہنچ گیا، جہاں کسی کی نگہ ارادت نوازمایۂ حیات تھی۔

والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے[1]۔ اخبارات میں بھی تذکرہ آچکا ہے، مگر آپ نے ایک سطر بھی نہیں لکھی، دل ارادت و عقیدت سے اسی طرح لبریز ہے، جیسے پہلے تھا، اور اب انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا۔

از طورِ صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز
بر آتشے نہ تاختہ پروانہ ام ہنوز

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں؟ حافظ عبدالرحمٰن راوی تھے کہ عرصہ تک آنے کی اُمید نہیں، بہرحال میں چہلم کے بعد بمبئی پہنچتا ہوں اور وہاں سے جہاں آپ ہوں۔

دِل نے مِلا دیں خاک میں سب وضع داریاں
جوں جوں رُکے وہ ملنے سے ہم بیشتر مِلے

ابوالکلام
۲۶/ اگست ۱۹۰۸ء

---

[1] گویا مولانا کے والد کا انتقال ۱۶/ اگست ۱۹۰۸ء کو ہوا تھا۔

(۳) (۶)

حضت!

میری مصلحت و ید تو یہ ہے کہ کہیں نہ جائیے، لکھنؤ میں رہیے۔ حج کی دو صورتیں ہیں، ایک تو للعوام کہ بتلاش کعبہ بحر و بر طے می کنند اور دوسرا للخواص کہ جب ضرورت ہوتی ہے کعبہ کو طلب کر لیتے ہیں۔ ابراہیم بن ادہم ہر ہر قدم دو رکعت نماز کرد، چوں قریب کعبہ رسید نہ یافت۔ ندائے غیبی بگوش رسید کہ برائے استقبال رابعہ بصریہ رفتہ۔ آپ کا درجہ اس سے بلند ہے کہ کعبہ کی تلاش میں دشت پیمائی کریں۔ ہاں! اجرام سماوی کا مطالعہ اور تفکر فی خلق السموٰت والارض، گو لکھنؤ میں بیت المقدس جیسی ٹیلسکوپ اور دوربین نہیں، اس لئے اجرام بعیدہ کا مطالعہ بے عذر۔ لیکن تاہم اگر علم ہیئت کے ابتدائی مراتب کی تحقیق منظور ہو تو شہاب ثاقب کے اجرام کی تفرید و تحلیل کیجئے۔ ایسا نہ ہو کر باب حرم سے عراقی کی طرح سننا پڑے۔

تو بروں در چہ کردی کہ دروں خانہ آئی۔

ابوالکلام

میکلوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۱۱ر اکتوبر ۱۹۱۰ء

ہر الٰہ آبادی کا گھر مہمان سرا، پس آج چاہتا ہوں کہ سپرنٹنڈنٹ سے خط و کتابت کر کے بُجرت قیام کا بندوبست کر لوں۔ کیونکہ خیموں میں فی کس سے ۲ روزانہ لے کر انتظام کیا گیا ہے۔

شہابِ ثاقب کو پہلے اچھی طرح نہیں سمجھا تھا، کیونکہ اس نص مبہم و متشابہ کی کئی تاویلیں ہو سکتی تھیں، مجبوراً مذہب اربابِ ظواہر و محدثین اختیار کیا تھا، یا مذہب سلف کیفیتہ مجہول والسوال عنہ بدعۃ الخ کہ استوا علی العرش پر بالفاظہ ایمان لانا چاہیئے۔ لا یعلم تأویلہ الا الراسخون فی العلم اور رسوخ علم سے بے بہرہ، البتہ اتنی تسکین تھی کہ الا من ارتضٰی من رسول، بھی کہیں کہیں آیا ہے، اب پرسش مزید سے درجہ متکلمین اشعریہ حاصل ہوا کہ تاویل کی جرأت ہوئی، مگر متمنی درجۂ اربابِ کشف جہاں حقائق اصلیہ بصورتِ حقیقی منکشف ہو جاتے ہیں۔

. . . . کا اس کارروائی سے ایک مقصد تو ان جملوں کا انتقام ہے، جو ان کی تلون مزاجی، ضمیر فروشی کی نسبت ہمیشہ آپ کی زبان سے نکلے، پھر یہ بھی کہ ان لوگوں کے عقیدے میں اپنے قد کی پستی مبدل بہ بلندی نہیں ہو سکتی، جب تک دوسروں کے قد کو پست نہ ثابت کیا جائے۔

میں تو کسی اُردو اخبار کو خریدتا نہیں، مفت آیا کرتے تھے، سو وہ بھی اب بند۔ اتفاقاً مرزا صاحب نے دلگداز دکھایا، تو پہلا مضمون نظر سے گزرا، تاہم آپ اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہیں کہ ایسے لوگوں کے مُنہ لگیں، فِی قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا

دیوانِ شرف جہاں وی پی بھجوا دیجئے۔

کنز العلوم کے لئے آج لکھتا ہوں۔

کاش آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت باتیں کرتا، میری قلبی حالت عجیب و غریب ہو رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ بظاہر حالات جلد شرفیاب زیارت ہونے کی اُمید نہیں۔

خیر اندیش
حسرت
کیف الوصول الی سعاد و دونہا قلل الجبال و دونھن حیوف

اکتوبر میں رنگون ہی چلئے، والد کے عقیدت مند وہاں کم نہیں۔

کسی طرح فائق نہیں، لیکن جب اس کی نسبت اُردو کے ملک التجار نے صاف کہدیا کہ ع

خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

تو پھر نمائش کے خریداروں کی حقیقت معلوم، البتہ اس واژوں روشنی کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مقصود بیع و شرا نہیں، بلکہ صرف نمائش، لیکن شاید جناب کو اس پر بھی اعتراض ہو۔

بار بار چاہا کہ اپنی سرگزشت عرض کروں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک دفتر بے کنار اور پھر — اتنے دفتر میں کہیں فصل نہیں، باب نہیں، حیران ہوں کہ کہاں سے عرض کروں، اور کس قدر۔ ایک قصہ ہوتا تو سُنا دیتا۔ میری داستان تو ایک مجموعہ قصص ہے۔ اپنی کن کن مصیبتوں کو عرض کروں۔

بکشت ما گزار لشکر اُفتاد

مونس قدیم بخار کی صحبتِ شبانہ روزی نے عدیم الفرصت کردیا ہے، چند دنوں کے لئے یہ کہیں تشریف لے گئے تو اپنے سلسلۂ قصص کا کوئی تازہ ترین افسانہ بالاختصار عرض کروں گا۔ ع

زانجملہ یکے قصۂ محمود و ایاز است

کنز العلوم کے لئے شیخ محمد کو کہدیا تھا، تعجب ہے کہ نہیں بھیجا، آج ان کو پھر لکھتا ہوں بایں مضمون کہ اگر آپ کے لئے دقت و اشکال ہو تو مجھے بھیج دیجئے۔ میں خود بھیج دوں گا۔

دواوین و تذکار کا خیال رکھیے، جب کوئی عمدہ نسخہ ہاتھ آئے تو مجھے یاد کیجیے۔ چاہتا ہوں کہ قدماء و متوسطین کے تمام دواوین جمع کرلوں نیز تذکرے، ورنہ مطالعہ کے لئے تو سوسائٹی[1] میں کافی ہیں۔

جناب کی نئی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ صرف خبر سُنی، آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا

---

[1] مراد ہے کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔

(۴) (۷)

کلکتہ

۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۰ء

یامولی الجلیل!

گو رابعہ بصریہؒ کی جلالۂ مرتبت کا سیّد الطائفہ تک کو اقرار تھا، آپ تو اپنے ظہور اوّل میں یہاں تک معترف کہ خدایا این چہ بو العجبی ست کہ مردانِ عالم را ازاں محروم می کنی کہ نصیب این پیرزن است، لیکن تاہم اَلذَّکَرُ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ، اور سردست تو آپ کو اس آیت کے دقائق حل کرنے ہیں کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ۔

ماسٹر دین محمد نہایت وحشت انگیز خبر لائے، میں وارداتِ مسرت ونشاط میں شریک نہ تھا۔ مگر اجازت دیجیے کہ ماتم میں بقدرِ استعداد دست وسینہ حصّہ لوں، لَا یُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ سرائی تو مخصوص با مثال ابراہیمؑ ہے، مگر میرے عقیدے میں آپ اُمّتِ مرحومہ کی اس جماعت ابدال سے کسی طرح کم نہیں، جن میں سے ہر فرد چالیس درجہ ابراہیم خلیل اللہ سے مرتبہ میں زائد، بطفیل فیضان درجۂ محبوبیت محمدیہ، کما ورد فی الحدیث[1]! پس کم از کم آپ کو زبانِ حال سے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا، ضرور کہنا چاہیے۔ اور نیز مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ جو نفوس قدسیہ عطیۂ توحید سے فیضیاب ہوں، انھیں کیا ضرور کہ آلودۂ شرک ہوں۔ یہ تو ہم ایسے بُت پرستوں کے لئے رہنے دیجیے۔

اس زمانہ کی خیرہ مذاقی دیکھیے کہ دیوانِ فیضی کا اوّلین مستحق تو کتب خانہ ندوہ تھا کہ ان چیزوں کا موجودہ عہد میں آپ کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ گورنمنٹ لائبریری الہ آباد میں اس کے دقائق و محاسن کو سمجھنے والا کون ہے۔ اور یوں ورق گردانی اور عنوانہائے جلی کو نافہمانہ دیکھ لینا دوسری بات ہے، الہ آباد کی نمائش بازارِ مصر سے تو

---

[1] یہ مزاحیہ اشارہ کسی متصوفانہ اور موضوع روایت کی جانب ہے۔

(۸)

مولانا عبد الباری ندوی کے نام

(۱)

۱۳۔ میکلاوڈ اسٹریٹ، کلکتہ
(یکم فروری سنہ ۱۹۱۲ء[1])

صدیقی المحب۔ جس دن مولانا[2] پہنچے۔ اسی دن سے بیکار و معطل محض۔ مچھلی کا ایک کانٹا دل کی جگہ حلق میں چبھ گیا۔ عرصے کی تکالیف شاقہ و استعمال آلات متعددہ کے بعد اُترا۔ مگر اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ سارا حلق زخمی و ماؤف نہ گفتگو کر سکتا ہوں نہ کھا پی سکتا ہوں۔ افسوس کہ مولانا کی تشریف آوری سے کچھ مستفید نہ ہو سکا۔ آپ کی نسبت[3] مولانا نے گفتگو کی تھی لکھا ہوگا یا لکھیں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ارادہ کو فلسفہ نہ بنائیے۔ اس قدر کد و کاوش کی کیا ضرورت۔ پڑھنا ہے تو کلکتہ چلے آئیے انتظام ہو ہی جائے گا۔

مسٹر عبد الماجد[4] صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

ابو الکلام

---

[1] مکتوب پر مولانا آزادؒ کے قلم سے تاریخ درج نہ تھی، ڈاک خانہ کی مُہر میں روانگی کی تاریخ درج تھی۔

[2] مراد حضرت علامہ شبلی نعمانی ہیں۔

[3] مولوی عبد الباری صاحب کا ارادہ اس وقت کلکتہ جا کر انگریزی پڑھنے اور کسی اسکول میں داخل ہونے کا تھا۔

[4] حضرت مولانا عبد الماجد اس وقت کننگ کالج کے طالب علم تھے، اسی سال بی اے پاس کیا پھر ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا، علمی و ادبی اور تصنیفی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن دینی شغف اور اسلام سے دلچسپی کا وہ دور جس نے انھیں مولانا بنایا، بہت بعد میں شروع ہوا۔ اس وقت محض مسٹر عبد الماجد تھے۔ (ابو سلمان)

مولانا ہدایت حسین (مولانا ان کا لقب کا لعلم ہے) لکھنو جاتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ مولوی سید عبدالحی صاحب کا تذکرہ علمائے ہند[1] زیر تصنیف دیکھیں۔ کیونکہ . . . اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے لئے لکھنا چاہتے ہیں آپ سے ملیں گے۔ مولوی صاحب سے کہدیجئے کہ دکھلانے میں تجمل نہ کریں۔

ابوالکلام

---

[1] مولانا سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنو اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی موجودہ ناظم کے والد ماجد۔ ان کی ایک عظیم الشان کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" عربی میں تھی، جو دمشق میں طبع ہو چکی ہے غالباً "تذکرہ علمائے ہند" سے مقصود یہی تالیف ہے۔

(۱۰)

مولانا حکیم غلام غوث صاحب خانپوری کے نام

(۱)

مولانا غلام غوث صاحب کے صاحبزادے محمد عبدہٗ اُمّ الصّبیان کے مرض میں مبتلا تھے۔ مولانا موصوف نے حضرت مولانا آزادؒ سے دُعا کی درخواست کی تھی۔ جواب میں یہ مکتوب وصول ہوا۔

باسمہٖ سُبحانہٗ

۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

جناب الجلیل الاعزّ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

والا نامہ گرامی پہنچا۔ صاحب زادہ کی علالت کی خبر پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا۔ مجھ ایسے روسیاہ و عصیاں کار کی دُعا۔ اس بارگاہ میں کیا قبول ہوگی! تاہم نسبت اسلام وایمان سے مشرّف اور وعدہ صادق مصدوقؐ روحی فداہ سے شادکام ہوں یقین فرمایئے کہ جس وقت آپ کا خط ملا، وہ عصر کا وقت تھا۔ اس کے بعد ہی مسجد گیا اور عرصہ تک مصروفِ دعا رہا۔ اس کے بعد مغرب، اور پھر علے الخصوص عشاء کے وقت، قبل از وتر دیر تک توفیق تضرّع و توجہ حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں پر نظر فرماتے اور ہم کو ان آزمائشوں میں نہ ڈالے جن کی ہم میں طاقت نہیں۔

اُمید ہے بہت جلد آپ مژدۂ صحت سے شادکام فرمائیں گے۔

فقیر

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۹) (۲)

۱۳۔ میکلاوڈ اسٹریٹ، کلکتہ

۷ ۱۲/۳ء

مجبیّ الصدیق

مرحمت نامہ پہنچا۔ اب فی الجملہ آرام ہے۔ والحمد للہ علیٰ احسانہ۔
مولانا سے مشورہ کے بعد ایک آخری رائے قائم کر لیجیے۔[1]

ابوالکلام

---

[1] یعنی مولانا شبلی سے مشورہ کر کے اپنے قیام کلکتہ سے متعلق۔

دیکھیے، کہ جامع اور صحیح ہے۔ عائلہ کے لئے اُردو میں کوئی لفظ نہیں۔ اسی کو رائج کرنا چاہیے۔

انا الفقیر احمد المکنی بابی الکلام کان اللہ لہٗ

(۱۲)

خریداران "الہلال" کے نام

[ستمبر ۱۹۱۳ء میں "الہلال" سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی تھی جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ضبط کرلی گئی، اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ دو ہزار کی ضمانت ضبط کر لینے کے بعد دس ہزار کی ضمانت مانگی جاتی تھی، چنانچہ "الہلال" سے بھی مانگی گئی، یہ ضمانت بھی شاید داخل کردی جاتی مگر اس کے جلد ضبط ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لئے ضمانت داخل کرنے کی بجائے "الہلال" بند کرکے دوسرا اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ یہ نیا اخبار "البلاغ" کے نام سے جاری ہوا جس کا پہلا نمبر ۱۲/ نومبر ۱۹۱۵ء کو شائع ہوا تھا۔]

(اوائل فروری ۱۹۱۵ء)

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
زما السلام رسانید ہر کجا ہستند[1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس عاجز کی خدمات کی قبولیت کے لئے اپنے بندوں کے دل کھول دیئے ہیں اور انھیں مقبول و

---

[1] اس شعر کے مصرعہ ثانی کو مولانا نے دوسری جگہ "سلام ما برسانید ہر کجا مستند" لکھا ہے۔

(۱۱)

(۲)

[مکتوب الیہ نے "گھر کا حکیم یا ڈاکٹر" کے قسم کی ایک کتاب لکھی تھی، اور حضرت مولاناؒ سے اس پر مقدمہ یا تقریظ لکھنے کی گزارش کی تھی۔ حضرت مولاناؒ نے اس سے معذوری کا اظہار فرمایا۔

اس کتاب کا تاریخی نام "جواہر تہذیب" تھا۔ اور دوسرے نام کے بارے میں بھی حضرت مولاناؒ سے مشورہ کیا تھا۔ حضرتؒ نے "طبیب عائلہ" نام تجویز کیا۔ مکتوب الیہ نے اسی کی نسبت سے "العائلہ" نام رکھا۔ یہ کتاب ۱۹۱۴ء میں مولوی رشید احمد انصاری کے زیر اہتمام مطبع احمدی، علیگڈھ سے شائع ہوئی تھی]

باسمہ

اخی الجلیل الاعز! زادنا اللہ و ایاکم محبۃ الاسلام

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والا نامہ پہنچا۔ اپنی کوتاہ قلمیوں کے لئے نادم و خجل و خواستگار معافی ہوں۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔ یقین فرمایئے کہ جناب کے لطف و کرم کی فقیر کے دل میں بہت جگہ ہے، اور جب بھی کبھی احباب خاص، و بزرگان مخصوص یاد آتے ہیں تو ان میں جناب کا اسم سامی بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دورِ طغیان و فساد و غربتِ خیر و اہلِ خیر میں ہم سب کی اپنی محبت و قرب کا ذوق و حسنِ خاتمہ کی دولت عطا فرمائے۔

جناب کی تصنیف کی خبر سے نہایت مسرت ہوئی۔ کاش فقیر کو مہلت ملتی کہ مشورہ سے خدمت کر سکتا۔ لیکن اپنی حالت کیا عرض کروں، زندہ ہوں، اور اس کو فضل مخصوص حضرت الٰہی سمجھتا ہوں۔ .....

"جواہر تہذیب" تاریخی نام نہایت عمدہ ہے۔ دوسرے نام کی تلاش ہے تو "طبیب عائلہ"
۱۳۳۲

(۱۳)

سیّد افتخار عالم کے نام

[یہ مکتوب تاریخ نثر اُردو مرتبہ احسن مارہروی سے لیا گیا ہے۔ اس میں خط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ یعنی مکتوب نگار کا نام (از فقیر ابو الکلام) ابتدا میں اور تاریخ (۲۲ رجون ۱۹۱۵ء) اختتام میں درج ہے۔]

از فقیر ابوالکلام

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

تاخیر جواب کے لئے شرمندہ وخواستگار معافی، علالت وہجوم افکار وعدم قیام کلکتہ بلاشبہ نواب صاحب[1] سے امیر خسروؒ کے ہندی کلام علی الخصوص کرنیوں کے مجموعے کا ذکر کیا تھا گر وہ نسخہ میرے پاس نہیں ہے۔ نواب سیّد محمد آزاد (اودھ پنچ والے) کے پاس تھا اور عرصہ ہوا میں نے دیکھا تھا۔ نواب صاحب کے اصرار پر میں نے ان سے ذکر کیا، گر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالغفور شہبازؔ کے سامان کے ساتھ ضائع ہو گیا یا کم از کم عسیر الحصول ہے۔ اب آپ کے لئے پھر مزید تحقیق کرتا ہوں۔

(۲) حضرت امیر خسروؒ کے حالات عام ومتعارف کتابوں سے تو آپ نے ضرور فراہم کر لئے ہوں گے، باقی مخصوص کتابیں تو جہاں تک فقیر کے علم میں ہے، کسی ایسی کتاب کا وجود ہی نہیں ہے۔ مشہور ہے خواجہ حسن سجزی نے ایک کتاب "مجالس خسروی" لکھی تھی اور اس میں حضرت امیرؒ کے تمام حالات وسوانح جمع کئے تھے، نیز مخصوص ان مجالس کا حال جو حضرت نظام الدینؒ کی صحبت وارادت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک زمانے میں مَیں نے بڑی تلاش

---

[1] نواب صاحب سے مقصود یقیناً نواب محمد اسحاق خاں (ابن نواب مصطفٰے خاں شیفتہ) ہوں گے، جو امیر خسروؒ کی تمام تصانیف بالاہتمام شائع کرانا چاہتے تھے اور عملاً تمام مثنویاں شائع بھی ہوگئیں۔

محبوب بنا دیا ہے۔ اگر "الہلال" نے اپنی زندگی کے لئے دستِ سوال پھیلانا جائز سمجھا ہوتا تو دس بیس ہزار کی فراہمی میں دو چار دن سے زیادہ مدت نہ لگتی۔ لیکن اس نے اسے پسند نہ کیا اور یہ تمام امر تمام بزرگوں پر روشن ہے۔

"الہلال" کے دوبارہ جاری کرنے کے لئے اب تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اور صرف روپیہ کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے، اس لئے صرف اتنی تکلیف خریدارانِ "الہلال" کو دینا چاہتا ہوں کہ وہ چھ ماہ کی قیمت پیشگی مرحمت فرمائیں۔ جو "دفتر الہلال" کے ذمہ ان کا قرض حسنہ ہوگا اور جسے خریداری کے حساب میں مجرا کیا جائے گا۔ "الہلال" کی ششماہی قیمت اصل ۱۲؍ ہے لیکن وہ صرف چھ روپے بھیج دیں۔

بعض خریداروں کی قیمت ختم ہونے کے قریب ہے، بعضوں کا سال شروع ہوا ہے، لیکن یہ درخواست تمام خریداروں سے ہے، انھیں اپنے حساب کا خیال نہ کرنا چاہیئے، جس وقت ان کی پچھلی قیمت ختم ہو جائے گی، اس کے بعد ہی اس رقم کو ان کے حساب میں جمع کر لیا جائے گا۔ قیمت انھیں بہرحال آئندہ دینی ہی ہے۔

"الہلال" صرف اتنی ہی اعانت اپنے وسیع حلقہ معاونین سے چاہتا ہے، اگر انھوں نے ایسا کیا تو اس موقع پر دفتر کو روپیہ کی دقت کا سامنا نہ ہوگا۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے مشکلات رہا ہے۔ اگر اس تحریر کو دیکھتے ہی روپیہ آپ نے روانہ کر دیا تو ہفتہ کے اندر "الہلال" شائع ہو جائے گا۔

دوسری درخواست نئے خریداروں سے پیشگی قیمت بھجوانے کی ہے، جس سے بہتر، جائز طریقہ پریس کی اعانت کا اور کوئی نہیں۔

فقیر

ابوالکلام (ایڈیٹر الہلال)

۱۴۔ میکلوڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

(۱۴)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے نام

[نومبر ۱۹۱۸ء کے اواخر میں حضرت مولانا آزادؒ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس کے نام ایک خط میں لکھا کہ "وہ سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی کانفرنس کے پروگرام میں میری تقریر کے لئے وقت رکھیں اور میری تقریر کا موضوع "صراط مستقیم" ہوگا۔" حضرت مولاناؒ کے اس خط کے جواب میں صاحبزادہ مرحوم نے جو خط مولاناؒ کے نام بھیجا مندرجہ ذیل مکتوب اسی کا جواب ہے۔ پہلے صاحبزادہ مرحوم کا خط بھی درج کردیا ہے تاکہ حضرت مولاناؒ کے مکتوب کا پورا پس منظر سامنے آجائے۔]

(صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا خط)

میں گزشتہ پانچ ہفتوں میں والدہ صاحبہ کی علالت اور اپنے جوان گریجویٹ بھانجے کی علالت اور انتقال کے سبب سے سخت پریشانیوں میں رہا۔ اور نیز چونکہ آپ کے خط کے مضمون کے متعلق مجھ کو جناب والا آنریری سکریٹری صاحب کانفرنس اور دیگر ممبروں سے مشورہ کرنا تھا، اس لئے جواب میں دیر ہوگئی۔ معاف فرمائیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کے وجود کا مقصد تعلیمی تحریک کی اشاعت ان اصولوں کے مطابق ہے جو سرسیّد علیہ رحمۃ نے قائم کی اور جن پر علی گڈھ کی تحریک بنی ہے۔ پس کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جو کچھ بھی تعلیمی تجاویز پیش ہوں اور ان کے متعلق جو کچھ تقریریں ہوں ان سب میں اصلی فرض کو ملحوظ رہنا لازمی امر ہے۔ کانفرنس میں جو تعلیمی مسائل یا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق جو تجاویز پیش ہوں ان سے اتفاق یا اختلاف

کی لیکن بالکل ناکامی ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے بزرگوں کے سوانح کے لئے رجال و تراجم پر بالکل اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ تمام تر محنت ان کی تصنیفات کے مطالعہ و کاوش میں کرنی چاہیے، ضمناً ان سے ایسے ایسے سُراغ لگ جاتے ہیں کہ پوری لائف مرتب ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے آپ یہ کیجئے کہ کلیات نظم و نثر بہم پہنچایئے اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ من اوّلہ الیٰ آخرہ کر ڈالئے۔

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ "الہلال" جولائی سے جاری ہوگا[1]۔ تاخیر جواب کے لئے مکرر خواستگار معافی اور سوانح نذیر احمد مرحوم کے عدم تبصرہ نویسی پر متأسف، وان شاء اللہ براجراء دومین الہلال محوّل۔

۲۲ر جون ۱۹۱۵ء

---

[1] پہلی بار الہلال جولائی ۱۹۱۲ء سے نومبر ۱۹۱۴ء تک جاری رہا دوبارہ جولائی کے بجائے نومبر ۱۹۱۵ء میں یہ "البلاغ" کے نام سے جاری ہوا۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا کو رانچی میں نظربند کر دیا گیا اور "البلاغ" بھی بند ہو گیا۔

(حضرت مولاناؒ کی جانب سے خط کا جواب)

(الہلال آفس۔ کلکتہ

... جنوری سنہ ۱۹۱۶ء

مُحِبّی فی اللہ)

جس دن آپ کا والا نامہ پہنچا، اسی دن سے نزلہ و درد گلو میں مبتلا ہوں، تمام کام معطل ہیں، آج تھوڑی سی مہلت ملی تو سب سے پہلے آپ یاد آئے۔

افسوس ہے کہ مجھ کو ان حوادث کی خبر نہ تھی جن کا ذکر آپ نے آغاز خط میں کیا ہے۔ ورنہ تاخیر جواب کے لئے کسی طرح اظہار شکایت نہ کرتا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۞ اعظم اللہ اجرکم بمصائبکم۔

میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دیئے اور مصنوعی اور نمائشی عذرات سے بالکل کام نہ لیا جو آج کل ایسے مواقع میں عموماً اخفائے اصلیت کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں۔ یہی شان ایک مسلمان کی تمام معاملات میں ہونی چاہیئے۔ اگر ہم سب ایسا ہی کیا کریں تو نصف اندرونی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔

لیکن جناب نے اپنے خط میں (معاف فرمائیے گا) ترتیب مقدمات و طرز استدلال کے ایسے متعدد تسامحات جائز رکھے ہیں، جن کی وجہ سے مجھے عرض جواب میں بڑی ہی مشکل پیش آ گئی ہے۔ اگر ان امور کے متعلق لکھتا ہوں تو صفحوں کے صفحے چاہئیں، مگر نہ مجھے اس کی مہلت نہ آپ کو۔ اعراض کرتا ہوں تو جو خلط بحث آپ نے کر دیا ہے، وہ کسی مقصود کو صاف و واضح نہیں ہونے دیتا۔ ایک چیز آپ کی اور آپ کے ہم خیال بزرگوں کی خواہش ہے اور ایک چیز کسی کام کے اصول و مقصد اور شرائط وغیرہ کا مسئلہ۔ کچھ ضروری نہیں کہ پہلی چیز کی بنیاد ثانی الذکر ہی کی بنیاد پر رکھی جائے۔ آپ اگر دونوں مسئلوں کو الگ رکھتے تو بات

کرنے کا ہر ایک ممبر کو حق ہے۔ لیکن کانفرنس کے وجود کا جو مقصد اور موضوع ہے۔ اس پر کانفرنس کے پلیٹ فارم پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

اِس قدر تمہید کے بعد اب میں آپ کو آپ کی وہ تقریر یاد دلاتا ہوں جو گزشتہ سال راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس میں آپ نے فرمائی تھی۔ اور جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کانفرنس کی تعلیمی تحریک اس قسم کی ہے جیسے کہ کسی مُردہ کو موم روغن کے ذریعے سے زندہ کرنے کی کوشش کرنا۔ اِس سے مجھ کو بحث نہیں کہ آپ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا، وہ صحیح ہے یا کیا؟ لیکن یہ میں ضرور عرض کروں گا کہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اس قسم کی تقریر قطعاً ان مقاصد کے منافی ہے، جن کے لئے یہ کانفرنس قائم ہے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا کر کے راولپنڈی میں کانفرنس کا اجلاس اِس غرض سے کیا تھا کہ سرحد کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجّہ ہو۔ اور شمالی مغربی اضلاع میں جو اسلامی خِطّہ ہے اور جو جہل کی تاریکی کی وجہ سے نہایت پستی کی حالت میں ہے، اس میں تعلیم کے ذریعہ سے بیداری کے سامان پیدا ہوں۔ چنانچہ حتی الامکان مختلف تحریکوں اور لیکچروں کے ذریعہ سے حاضرین کو تعلیمی تحریک کی طرف مُتوجّہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن آپ نے آخری اجلاس میں جو تقریر فرمائی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو اثر کانفرنس کے مقاصد کی تائید میں پیدا ہوا تھا، وہ بہت کچھ زائل ہو گیا۔ ایسی حالت میں سب سے اوّل یہ امر صاف ہو جانا ضرُوری ہے کہ جس تعلیمی تحریک کی اشاعت کے لئے یہ کانفرنس قائم ہے اور جن اصُول کے مُطابق اور جن مقاصد کے لئے سر سیّد علیہ الرّحمہ نے اس کی بناء قائم کی تھی، ان کو آپ ہندوستان کے مُسلمانوں کے لئے مُفید اور ضرُوری سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور ان کو قوم میں مقبُول عام کرانے کی کوشش کرنا کانفرنس کے ممبروں کا فرض تصوّر کرتے ہیں یا نہیں؟ اس امر کی نسبت جواب آنے پر جناب کے اول خط کے متعلق جواب عرض کیا جائے گا۔ والسّلام۔

خاکسار
آفتاب احمد

آپ کے لئے بھی یہ دروازہ باز ہے۔ صراحۃ النص کا تو اصلی مطالبہ ہے، لیکن خیر، دلالۃ النص ہی سہی۔ کسی نہ کسی طرح یہ واضح کردیجیے کہ جناب کا پیش کردہ اعتقاد فلاں نص سرسیّد سے ماخوذ ہے۔

یاللعجب! آپ لوگ فخر کرتے ہیں، اگر ایک نصرانی پلیٹ فارم پر آکر بہت سی ایسی باتیں کہہ جائے جو آپ کے عقائد و اغراض کے بالکل ضد ہوں، لیکن آپ لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ کوئی مسلمان اختلاف نہیں کرسکتا؟

پھر کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ کا یہ مقدمہ کس طرح ہمیشہ پامال کیا جاچکا ہے، اور کتنی نظیریں اس کے لئے مخالف و ضد موجود ہیں؟

کیا بمبئی کانفرنس کے پریسیڈنٹ مسٹر بدرالدین طیب جی نہیں بنائے گئے، جو یکسر علی گڈھ کی تحریک ہی کے مخالف تھے؟ کیا انھوں نے اپنے اختتامی ایڈریس کے اندر وہ کچھ نہ کہا جو سرسیّد مرحوم کے مشن اور عقائد و اصولِ تعلیم کے سرتاسر خلاف تھا؟ ان سے یہ شرط نہیں کرائی گئی تھی!

سرسیّد مرحوم پردۂ نسواں کے کس قدر اشد شدید حامی تھے؟ اور خارجی تعلیم نسواں کے ولولوں پر کیسے غضبناک ہوجاتے تھے۔ حتیٰ کہ میر ممتاز علی کے رسالۂ حقوقِ نسواں کو، کو پھاڑ کر ردّی کے ٹوکرے میں ڈال دیا تھا، لیکن آپ کے پیشروؤں نے مسٹر طیب جی کو صدر بنایا! اور انھوں نے پردہ کی علانیہ مخالفت پریذیڈنشل ایڈریس میں کی۔

پھر دوسری دہلی کانفرنس کی صدارت کے لئے سر آغا خاں لائے گئے، انھوں نے مسلمانوں کے تنزّل کے جو اسباب اساسی بتلائے، ان میں عورتوں کا پردہ بھی تھا، کیا یہ سرسیّد کے عقائد کے خلاف نہ تھا؟

اسی پونا کانفرنس کا صدر آپ نے جسٹس عبدالرحیم کو بنایا ہے جو سرسیّدؒ کے بہت سے بنیادی اصولوں ہی کے مخالف ہیں۔ کیا ان سے بھی آپ نے یہ مقدمہ طے کرالیا ہے؟ آپ کو

زیادہ صاف اور روشن تھی۔

آپ نے کیسی تعجب انگیز غلطی کی ہے جب کہ خود ہی ایک مقدمہ قائم کیا ہے اور قبل اس کے کہ مخاطب تسلیم کرلے، یا اس کا مقدمہ مسلمہ ہونا ثابت ہوجائے، پوری شکل بھی قائم کرلی ہے اور پھر نتیجہ بھی نکال لیا ہے؟

آپ لکھتے ہیں کہ کانفرنس کا موضوع تعلیمی ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے اور اس کا نام ہی اس کے لئے شاہد!

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد!

لیکن اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "ان اصولوں کے مطابق جو سرسید مرحوم نے قائم کئے" گزارش ہے کہ مقدمہ کا یہ ٹکڑا کہاں سے ماخوذ ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ کانفرنس کے مقاصد کی فہرست، دفعات و قواعد، شرائط و ضوابط، عہد اوّل کی مجلسیں، ارکانِ اساسی کی تقریریں، خود سید صاحبؒ کی تقریر جو انھوں نے علی گڈھ کے دونوں جلسوں اور لکھنؤ میں کی، نیز اس کی تمام رپورٹیں، یہ تمام ذخیرہ موجود ہے۔ مَیں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ ان سے ثابت کر دکھائیں کہ خود سید صاحب مرحوم نے یہ کہاں لکھا ہے؟ اور کانفرنس کی تقریروں کے متعلق یہ فیصلہ امر و نہی کس نے قرار دیا ہے؟

بلا شبہ سرسید مرحوم اس کے بانی تھے۔ لیکن بانی ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسئلہ تعلیم کو انھوں نے ایک خاص اصول کے ماتحت کرکے کانفرنس کے حوالے کردیا ہے اور اب اس کے پلیٹ فارم پر اس کے ایک حرف سے بھی انحراف و اختلاف جائز نہیں؟

قرآنِ حکیم سے ہمارے مجتہدین و فقہاء مسائل کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس استخراج و استنباط کی انھوں نے متعدد قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک یہ کہ صاف صاف کسی آیت میں حکم ہو اس کو "صراحۃ النّص" کہیں گے۔ ایک یہ کہ صاف صاف حکم نہ ہو تو اس کے لئے "دلالۃ النّص" اور "اشارۃ النّص" وغیرہ اصطلاحات قائم کی ہیں۔

نیز یہ کہ اسلام میں تعلیم کی کوئی علحدہ دعوت نہیں ہے۔ اس کی دعوت ایک ہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ موجود ہے۔

لیکن معاف فرمائیے گا، یہ جو کچھ کہا گیا، اس کو آپ حضرات بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ قدیم و جدید جماعتوں میں آج کوئی گروہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس حقیقت کا صحیح اندازہ شناس اور محرم و خبردار ہو۔ گزشتہ صدی کے تمام مسائل اصلاح و دعوت میں سے آپ حضرات کو صرف سر سید مرحوم ہی کی تحریک کا حال معلوم ہے۔ اس کے استغراق سے مہلت نہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ مسئلہ "تحریک جدید" و "دعوت تعلیم جدید" (متعلق اہلِ اسلام) خود ایک موضوع مستقل ہو گیا ہے، اور گزشتہ صدی کے اندر تمام عالم اسلامی نے اس پر نظر ڈالی ہے۔ اور ایک وسیع لٹریچر اس کا موجود ہے۔ اس کے دیکھنے سے ایک شخص ان تمام مشارب و مذاہب و طرق و اسالیب کو معلوم کر سکتا ہے جو اس مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسلام کی دینی تعلیمات اور مسلمانوں کے قومی خصائص و مقومات کے علم صحیح کا اس پر اضافہ کر کے حقیقت شناسی کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔ میرے گزشتہ دس سال کے لیل و نہار، سفر و حضر، صحت و مرض ہر حال کے مطالعۂ دائمی کا ایک خاص موضوع یہ چیزیں رہی ہیں، آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ مختصر رسائل و اخبارات و مجلات عالم اسلامی کے سوا، خاص اس موضوع پر کم از کم پچاس کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جن کے وجود کا بھی خبرداران ہند کو علم نہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی الحمدللہ میں نے اس بارے میں ایک مجتہدانہ بصیرت پائی ہے اور اسلامی تاریخ کے استقرائی نتائج نے میری مدد کی ہے اور قرآن و سنت نے مجھے دلائل و براہین کے ساتھ بتلایا ہے کہ اس مسئلہ کی صحیح و سعید راہ کیا ہے۔ واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم

پس اس بارے میں میرا تخاطب آپ حضرات سے نہیں ہے اور نہ میں اس بارے میں آپ حضرات سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوع دوسرا ہے اور اس کی کائنات ہی دنیا

معلوم ہے کہ وہ ایڈریس میں کیا کہیں گے؟ آپ کو معلوم نہیں، مگر مجھے معلوم ہے۔

مدراس کانفرنس کا صدر ایک مسیحی عہدہ دار (جسٹس آیڈم) تھا۔ اس مقدمہ کا اثر زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے مذہب تعلیم سے انحراف نہ ہو۔ لیکن ایک مسیحی شخص کے متعلق تو یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا تھا کہ کہیں وہ نفس اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کہدے۔ آپ تو اس وقت اس جگہ پر نہ تھے، لیکن مرحوم محسن الملک کے کاغذات میں اس اقرارنامے کی تلاش کیجیے، جو انھوں نے جسٹس موصوف سے کرایا تھا!

پہلی علیگڑھ کانفرنس میں تو خود سرسید مرحوم نے مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ سے یہ مقدمہ لے نہ کیا تھا۔ حالانکہ بڑی ضرورت اس مقدمہ کی اس وقت تھی۔ معلوم نہیں آپ کو وہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں؟

معاف فرمایئے گا، آپ نے یہ ایک اصولی سوال چھیڑ دیا ہے، اور اس کے معنے یہ ہیں کہ آل انڈیا کانفرنس جس کو تمام مسلمانوں کی نیابت دی جاتی ہے، اپنے پلیٹ فارم کے لیے ایک خاص مذہب رکھتی ہے؛ اور جو اس کے خلاف رائے رکھتا ہو، اسے وہاں قدم رکھنے کا حق نہیں۔ یہ کانفرنس کا ایک خطرناک انتقال ہے اور ضروری ہے کہ ایک بار اس مسئلے کو پبلک کے سامنے ٹھیک ٹھیک فیصل کرلیا جائے۔ آج تک کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوا تھا۔

(۲) بہرحال یہ تو آپ کا مقدمہ ہے۔ رہی اصل حقیقت، تو یہ بھی صحیح نہیں کہ میں نے راولپنڈی کانفرنس میں کانفرنس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کا رد کیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد عام طور پر مسئلہ دعوت و اصلاح کا مبحث تھا، اور یہ دکھانا مقصود تھا کہ مسلمانوں کی ہر دعوت کو اصولاً مذہبی ہونا چاہیے۔ اور اسی کے واسطے سے تعلیم بھی پھیلانی چاہیے۔ یہ نہیں ہونی چاہیے کہ مذہب سے الگ رہ کر ایک مستقل تعلیمی دعوت قرار دی جائے، جس میں کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

تعلق ہے اور نہ کچھ اس کی بحث ہے۔ یہ ایک خالص مذہبی موضوع ہے اور از سرتا پا قرآن و سُنّت سے متعلق۔

الحمدللہ کہ خدا نے ہندوستان کے ہر گوشے کو میری آواز کی پذیرائی کے لئے آمادہ کر دیا ہے اور ہر جگہ ہزار ہا دل پیدا کر دیئے ہیں جو میری ہر آواز کے استقبال کے لئے مستعد ہیں۔

وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ کوئی روک جو آپ حضرات اس کے لئے پیدا کریں، سُودمند نہیں ہو سکتی، اور گیند کی قوت جذب کا فعل جس قُوّت سے ہوتا ہے، اتنی ہی طاقت سے قوّتِ دفع جواب بھی دیتی ہے۔ راولپنڈی میں خود آپ لوگوں نے میری مخالفت کر کے پبلک کو اپنے سے بدظن کرایا، اور پھر اس کے نتائج لازمی ہیں علی الخصُوص پونا کو تو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کانفرنس کا پنڈال آپ مجھ پر بند کر کے دیکھ لیں، میں کسی اور گوشے میں خُدا اور اس کے رسولؐ کا پیغام مُسلمانوں کو پہنچا سکتا ہوں۔ میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لئے ایک بہت ہی بڑی عجیب و غریب دولت ہے، جس سے محرُوم ہو کر لُٹ جاؤں گا، تو اس کی حماقت بہت ہی افسوسناک ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقریر روک کر کوئی بھی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، تو بسم اللہ، اس کا بھی تجربہ ہو جائے، جیسا کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کر چکے ہیں۔ مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ان تعلیمات کو کہنا، لکھنا، مدوّن کرنا ہے، جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے، اور میرا معاملہ اب وہاں تک پہنچ گیا ہے کہ آپ لوگوں کے یہ ارادے اس کے لئے بالکل خارج از بحث ہیں۔

مولوی نذیر احمد مرحُوم کا ترجمۃ القرآن آپ کے پاس شاید ہوگا، اس میں سورۂ جن کو نکالئے اور کسی وقت، فرصت ملے تو اس آیت پر غور کیجئے: وَ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ

سے بالکل مختلف ہے، جس میں آپ لوگ بستے ہیں۔ موجودہ مسئلے سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور یہ بالکل بے سود تھا کہ آپ نے اپنی خواہش کو کانفرنس کے ایک اصول کی شکل میں پیش کر دیا۔

آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ آپ سر سید مرحوم کے مشن کے داعی ہیں۔ سر سید کا بڑا کارنامہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ انھوں نے تقلید کا قلع قمع کیا اور اجتہاد رائے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن آپ لوگ خود ہی ایک بدترین تقلید اعمی میں گرفتار ہو گئے ہیں اور یہ تقلید اس تقلید سے ہزار درجہ افسوسناک ہے جو مقلدین فقہ ہدایہ یا مقلدین تفسیر جلالین و مدارک کی بیان کی جاتی ہے تاہم میں اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا، کیونکہ کہنا بیکار ہے "تقلید" کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ سوال کا جواب نہیں مل سکتا:

ولکن لاحیاۃ لمن تنادی

(۳) بہر حال آپ نے میرے (شخص خاص کے) معاملے کو کانفرنس کا اصولی مسئلہ بنا کر ایک اہم بحث چھیڑ دی ہے، جس کو اگر صاف نہ کیا گیا تو کانفرنس کے دروازوں پر مسلمانوں کے لئے قفل چڑھا دیئے جائیں گے۔ اس کا صاف کرنا تو اب ناگزیر ہو گیا ہے۔ لیکن اب ان دو چار دنوں کے اندر آپ کے لئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخصی معاملے کو کسی اصولِ موضوعہ کے حوالے کر کے الگ ہو جائیں۔

(۴) سردست اس مسئلہ کو یوں صاف کیا جا سکتا ہے کہ آپ مجھ سے شخصًا دریافت کر لیں کہ آئندہ کانفرنس میں کس موضوع پر تقریر کروں گا؟ اور پھر اس سے اندازہ کر لیں کہ یہ تقریر کیسی ہوگی۔

میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ اب بالتشریح لکھتا ہوں کہ میری تقریر کا موضوع "صراطِ مستقیم" ہوگا۔ اس کی تشریح اور وہ بیانات جو قرآن حکیم نے صراطِ مستقیم کے متعلق کہے ہیں، اس موضوع کے کسی حصّہ کو نہ تو سر سیدؒ کے تعلیمی مشن سے کوئی

مجسم تصویر دنیا کو دکھلا دی۔ قرآن نے ان کامل انسانوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور پوری استقامت کے ساتھ اس پر جم گئے ہیں، پھر وعدہ کیا ہے کہ ایسی پاک ہستیوں کے لئے نہ تو کوئی چیز ڈرانے والی ہے اور نہ غمگین کرنے والی۔ مولوی حسرت نے اور آپ نے ثابت کر دیا کہ ایسے کامل انسانوں سے مسلمانوں کی بستیاں ابھی بالکل خالی نہیں ہوئی ہیں۔ یہ مقام یوسفی کا کامل ترین درجہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے دو راہیں کھولی گئی تھیں۔ آزادی اور معصیت، قیدخانہ اور طاعتِ حق۔ انھوں نے آخری راہ اختیار کی اور فرمایا "رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ" خدایا قیدخانہ مجھ کو کہیں زیادہ محبوب ہے اس چیز سے جس کی طرف مجھ کو بلایا جا رہا ہے۔" الحمدللہ کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے حسرت کو مقامِ یوسفی کے کامل اتباع کی توفیق دی اور اس فضیلت میں کوئی دوسرا ان کا شریک و نظیر نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

البتہ موجودہ عہد سے اس مقام کے فہم و قدر شناسی کی امید نہیں۔ یہ عہد صرف تخم ریزی کا ہے، جو کاشتکاری کے کاموں میں سب سے زیادہ محنت طلب اور مشکل وقت ہے۔ فصل کاٹنے کا وقت نہیں ہے۔ جب وہ وقت آئے گا تو دنیا ان لوگوں کو یاد کرے گی جنھوں نے بیج بونے کی محنت اپنے ذمہ لی تھی اور پھل کھانے کی لذت آنے والوں کے لئے چھوڑ دی تھی۔ اس وقت آسمان و زمین ان لوگوں کی بڑائی پر شہادت دیں گے اور وہی دنیا جو اس وقت سو رہی ہے، اٹھے گی تا کہ ان کی پرستش کرے۔ حسرت جو کچھ کر رہا ہے ہندوستان اس کو پچاس برس بعد سمجھ سکے گا۔ اس وقت اس سے زیادہ امید نہ رکھئے کہ چند اخباروں میں دو چار مضمون نکل جائیں، اور وقت کی حالت دیکھتے ہوئے یہ بھی خلاف توقع ہے۔ جو حالت اس بارے میں دنیا کی متفقہ تاریخ بتاتی ہے اس کا مقتضی تو یہ ہے کہ ہر طرف سے تحسین کی جگہ ملامت کی صدائیں اٹھیں اور لوگ کہیں کہ انّہٗ لمجنون۔ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ اقوام و ممالک کی اصلاح و خدمت کا اصل منبع و سرچشمہ انبیاء کرامؑ کی زندگی اور ان کا پاک

يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ٥

ابو الکلام کان اللہ لہٗ

(۱۵)

بیگم مولانا حسرت موہانی کے نام

[۱۹۱۶ء میں مولانا حسرت موہانی کو حکومت نے گرفتار کیا تھا انھیں دو سال قید کی سزا ہوئی ۔ تقریباً ایک سال کے بعد حکومت نے انھیں بعض شرائط پر رہا کرنا چاہا لیکن یہ شرائط قید سے بدتر صورت پیدا کرنے والی تھیں اس لئے مولانا حسرت موہانیؒ نے ان شرائط پر رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ اسی سلسلے میں بیگم حسرت نے حکومت کو ایک خط لکھا جس میں لکھا کہ "حکومت کی پیش کردہ شرائط رہائی سے قید بہرحال بہتر ہے، حسرت نے رہائی سے انکار کر دیا، اچھا کیا۔ مجھے ان سے یہی توقع تھی۔"

مولانا آزادؒ اس زمانہ میں رانچی میں نظر بند تھے۔ اس مکتوب میں انھوں نے مولانا حسرت کی رہائی کے سلسلے میں حکومت کے کمیونک، اور بیگم حسرت کے خط کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی مجبوری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے]

تحیۃ وسلاما

اخبارات میں صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ کا مولوی حسرت کے متعلق کمیونک نظر سے گزرا اور آپ کا خط بھی جو سنٹرل بیورو نے شائع کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَنْ لَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا کی

(۱۶)

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ کے نام

(۱)

سند خلافت

[حضرت مولانا آزادؒ کے نزدیک قیام نظام جماعت اور انتخاب امام کا مسئلہ مسلمانوں کی جماعتی اور اسلامی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا تھا اس کے بغیر ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی ان کے نزدیک "حیاتِ غیر شرعی و جاہلی" تھی اس دعوت کو انھوں نے "الہلال" میں پیش کیا، اپنی تقریروں اور خطبات میں اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) کا خطبۂ صدارت اسی مسئلہ پر مشتمل ہے۔

حضرت مولاناؒ نے پہلے منصب امامت کے لئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹا کو منتخب کیا تھا اور ان کو اس منصب کے قبول کر لینے پر آمادہ بھی کر لیا تھا لیکن ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز تشریف لے گئے وہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور پھر مالٹا کے جزیرہ میں قید کر دیئے گئے اور اس طرح کام کا نقشہ یکسر پلٹ گیا۔ ۱۹۱۶ء میں مولانا آزادؒ بھی رانچی میں نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن انھوں نے اپنی ذاتی ذمہ داری پر تنظیم جماعت کے کام کو جاری رکھا۔ نظر بندی کے زمانہ ہی میں مولانا ابو المحاسن محمد سجاد کو صوبہ بہار میں کام کا ذمہ دار بنایا اور رہائی کے بعد مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو یوپی میں کام کرنے کی ذمہ داری تفویض ہوئی۔ انھوں نے مولاناؒ کے مشورہ سے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایا اور کام شروع کر دیا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں مولاناؒ نے یہ اہم کام جمعیۃ العلماء ہند کے سپرد کر دیا اور خود اس ذمہ داری

نمونہ ہے۔ سو ان کا حال جو قرآن نے بتلایا ہے، وہ معلوم ہے۔ جب کہ وہ اپنی قوم کو زندگی اور کامیابی بخشنا چاہتے تھے تو قوم پتھروں کی بارش سے ان کا استقبال کرتی تھی۔

جب میں آپ کے عزم و استقامت اور اس کے ساتھ تنہائی و کس مپرسی کو سوچتی ہوں تو کہہ نہیں سکتا کہ قلب کا کیا حال ہوتا ہے؟ یہ اللہ ہی کی مدد ہے اور اس کے رُوح القدس کا القا، جس نے آپ کو ان مصائب و شدائد میں بھی وہ درجۂ عزم بخشا ہے جو کسی ایک مَرد کو بھی آج نصیب نہیں۔

افسوس میں خود مجبور و معطّل ہو رہا ہوں اور اپنے وجُودِ ناکارہ کو آپ کے لئے کچھ سود مند نہیں پاتا۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں کیونکر آپ کے لئے مفید ہو سکتا ہوں؟ کوئی ضرورت، کوئی کام، کوئی خدمت مجھے لکھیئے شاید میں کچھ کر سکوں اور اس طرح اپنے قلبِ نادم و خجل کو تسکین دے سکوں۔ آپ کی مالی حالت آج کل کیسی ہے؟ مصارفِ ضروریات کا کیا انتظام ہے، مکان قائم ہے یا نہیں، اگر قائم ہے تو کیوں کر اس کا انتظام ہوا ہے؟ امید ہے کہ ان اُمور کو مُفصّل لکھیں گی۔

آپ نے فوٹو کی نسبت لکھا تھا۔ یہاں ایک شخص[1] نے اپنے شوق سے لیا تھا۔ میں نے ایک کاپی کے لئے اس کو کہا ہے کہ آپ کو بھیج دے۔ میں تو اس کو ایک محض بے کار شے سمجھتا ہوں تعجب ہے کہ آپ کو اس کے لئے اصرار ہے۔

مخلص

ابوالکلام والخیر

---

[1] غالباً فضل الدین احمد مرتب "تذکرہ" مراد ہیں جو مولانا آزادؒ کو اپنا تذکرہ لکھنے پر آمادہ کرنے کے لئے رانچی میں کچھ دنوں تک مقیم رہے تھے اور مولاناؒ کا فوٹو بھی حاصل کیا تھا۔ مولانا کی یہی تصویر تذکرہ کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ الہلال پریس میں شائع ہوئی۔

[الفاظ بیعت کا مسودہ بھی مولانا آزادؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ درج ذیل ہے۔]

آمَنْتُ بِاللّٰہِ وَبِمَا جَآءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ، وَآمَنْتُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ وَبِمَا جَآءَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ، وَاَسْلَمْتُ وَاَقُوْلُ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے بواسطۂ خلفاء و تابعین اس بات پر کہ:

(۱) اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا، اگر استطاعت پائی۔

(۲) پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا، اگر استطاعت پائی۔

(۳) ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا، برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کروں گا۔

(۴) میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

(۵) اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے، اپنے مال سے، اپنے اہل و عیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسولؐ کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں گا۔ اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب و سنت کے مطابق دیا جائے گا سمع و طاعت کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

سے بری الذمّہ ہو گئے۔

ذیل کی تحریر... مولانا نے ملیح آبادی مرحوم کو بطور "سند خلافت" لکھ کر دی تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشادِ سلوکِ سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالبِ صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

فقیر

ابوالکلام ۔ کان اللہ لہٗ

۱۴ر شعبان ۔ ۱۳۳۸ھ[1]

---

[1] مطابق ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء بروز جمعہ۔

معاملۂ تنظیم جماعت من کل الوجوہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات و تفصیلات بھی طے پاگئیں اب بجز توسیع دائرۂ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے؛ اور وہ توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔

حسرت صاحب سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رائے و فکر کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کا اصلی جوہر استقامت عمل ہے۔ پس ان امور میں ان کی رائے پر اعتماد بے سود ہوگا۔[1]

آپ نے لکھنؤ کے جو حالات لکھے ہیں، ان کو پڑھ کر سخت قلق ہوا افسوس: بہتر سے بہتر نیکی کو بھی یہ لوگ بلاآمیزش بدی کے نہیں انجام دے سکتے۔ ان لوگوں میں ایک شخص بھی نہیں جو اس مسئلہ کی اہمیت و حقیقت اور منصبِ امامت کے فرائض و مہمات، اور پھر موجودہ حالات کی بناء پر مشکلات و صعوباتِ راہ کا نکتہ شناس ہو۔ معہذا، اگر یہ لوگ اصول کو تسلیم کرلیں اور کسی نہ کسی شخص کو متفقہ طور پر منتخب کرلیں، تو بہرحال موجودہ طوائف الملوکی سے تو بہتر ہوگا۔

بہرحال ہمارا دائرۂ عمل مکمل ہوچکا ہے۔ پنجاب، سندھ، بنگال بالکل متفق و متحد ہے، اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہوگیا ہے۔ ان لوگوں کے فیصلے کا انتظار بے سود تھا اور بے سود ہے۔

مفصل خط کل یا پرسوں لکھوں گا، روپیہ کے لئے بمبئی لکھ دیا ہے، وہاں سے بذریعہ تار وصول ہوجائے گا۔ بمبئی سے مقصود خلافت کمیٹی نہیں ہے، دوسرا انتظام ہے۔[2] اور چونکہ پوری طرح تنظیم ہوگئی ہے، اس لئے انشاء اللہ آئندہ مالی مشکلات پیش نہیں آئیں گی۔ پوری طرح مطمئن، فارغ البال رہیں۔

اب میں اس کے قطعاً خلاف ہوں کہ آپ "عالمِ اسلامی" وغیرہ اخبارات

---

[1] مسئلہ امامت کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی سے بھی مکتوب الیہ نے بات چیت کی تھی اور اس کی رپورٹ حضرت مولانا کو بھیجی تھی۔

[2] مکتوب الیہ کی روایت کے مطابق مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد علی ایم اے مرحوم کے ذریعے سے ایک لاکھ روپیہ تکمیلِ تنظیم کے لئے مل گیا تھا، دوسرے انتظام سے مقصود یہی انتظام تھا۔

(۱۷) (۲)

۱۱؍مئی سنہ ۱۹۲۰ء

مُحبّی فی اللہ!

السّلام علیکم۔ وفقنا اللہ وایّاکم کما یحبہٗ ویرضاہ

خط پہنچا۔ باوجُود عزمِ مصمم فیض آباد نہ پہنچ سکا۔ عین وقت پر موانع پیش آئے۔ قلب کی شکایت کی وجہ سے اِس موسم میں سفر نہایت دشوار ہوگیا ہے۔ تاہم ضرورتیں ناگزیر اور انشاء اللہ ۱۳؍ یا ۱۴؍مئی کو پنجاب میل سے روانگی ضروری، بصورتِ ثانی ۱۵؍ کو پہنچوں گا۔[۱]

ابوالکلام

[۱] اس زمانے میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھنؤ میں مقیم تھے۔ (ابوسلمان)

(۱۸) (۳)

۱۳؍جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

مُحبّی فے اللہ!

السّلام علیکم۔ آپ کے تمام خطوط یکجا ملے۔ گزشتہ ماہ کے اواخر میں بمبئی گیا تھا، تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صُورت اختیار کرلیں۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی بیمار پڑ گیا، ایک ہفتہ سے زائد عرصہ اس میں ضائع ہوگیا، چونکہ ارادہ زیادہ قیام کا نہ تھا۔ اس لئے ڈاک کلکتہ سے نہ منگوائی۔ کل یہاں (کلکتہ) پہنچا اور آج ڈاک میں آپ کے خطوط ملے۔ بحمد اللہ

واقف ہیں۔ لیکن آپ خاص طور پر تاکید کر دیجئے گا۔ لکھنؤ میں بعض تاجر باہر بھیجنے کا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اُسے کہدیا جائے۔ قیمت خواہ کتنی ہی زیادہ ہو، لیکن پھل عمدہ ہوں۔ روپیہ آپ دے دیں۔ آپ کو ضرورت ہوگی تو میں یہاں سے بھیج دوں گا۔

ابوالکلام

(۲۰)

(۵)

آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ براہِ عنایت لکھنؤ میں کسی کاروباں شخص سے کہدیں کہ ایک رضائی تیار کرکے کلکتہ بھیج دے۔ رضائی لکھنؤ سے باہر اچھی تیار نہیں ہو سکتی، اور جگہ کے دھینے ہلکی روئی بچھا ہی نہیں سکتے۔ فرد صوفیانہ مگر عمدہ قسم کی ہو، اَستر صندلی رنگ کا، سُرخ نہ ہو۔ کنارے کی مغزی اودی ریشمی، ایک عزیز کی فرمائش ہے اور تحفۃً دینا مقصود ہے۔ بیس پچیس روپیہ تک کی لاگت آئے تو مضائقہ نہیں، بلکہ دو چار اور سہی۔ لیکن عمدہ اور خوشنما ہو۔ روئی اتنی دی جائے کہ جتنی کہ عموماً رضائی میں دی جاتی ہے۔ تاخیر نہ ہو۔[۱]

(۲۱)

(۶)

[مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے حضرت مولانا آزادؒ کی امامت کے بارے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی رائے معلوم کی۔ اُنھوں نے تحریر فرمایا کہ میں خود بارِ امامت کا اہل نہیں، مولانا محمود حسنؒ (شیخ الہند) بھی اس کے

۱؎ یہ تحریر بھی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام تھی۔

کی اشاعت کی فکر کریں۔ اخبار اگر اعلیٰ پیمانہ پر نکلے تو مفید ہوگا اور وہ بحالتِ موجودہ ممکن اور نہ بصورت تہیۂ اسباب مفید۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ایک دو ماہ صرف ایک ہی کام میں مشغول رہیں، یعنی دعوتِ تبلیغ۔ اس کے بعد انشاء اللہ ایک دوسری زندگی کو اپنے لئے آمادہ پائیں گے۔ آپ کے لئے جو امور پیش نظر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا وقت جلد لائے۔ یاد رکھیے کام ایک ہی مرتبہ کرنا چاہیئے اور اعلیٰ پیمانے پر کرنا چاہیئے، بےسروسامانی میں متعدد چھوٹے چھوٹے کاموں کو شروع کرنا، اپنے مستقبل کو نقصان پہنچانا ہے۔ مولوی عثمان صاحب آج کل کن اشغال میں ہیں!

ابوالکلام

(۱۹)

(۴)

برادرِ عزیز!

السّلام علیکم۔ کل مفصّل خط آپ کو لکھوں گا۔ سردست ایک کام کر دیجئے حکیم صاحب[۲] کو لکھنؤ کے خربوزے مطلوب ہیں، کسی واقف کار سے مدد لیجئے اور ایک من عمدہ سفیدہ لے کر اور اچھی طرح ٹوکرے میں رکھ کر بذریعۂ ریلوے پارسل بھیج دیجئے۔ بلٹی پوسٹ ماسٹر کاٹھ گودام کے نام بھیجی جائے اور ساتھ لکھ دیا جائے کہ ٹوکرا وصول کر کے حکیم صاحب کے یہاں بھجوا دیا جائے۔ ٹوکرے میں خربوزوں کو عمدہ طور پر رکھنا چاہیئے۔ وہاں لوگ اس سے

---

[۱] مکتوب الیہ لکھنؤ سے ایک اخبار "عالم اسلامی" نکالنا چاہتے تھے، لیکن مولانا آزادؒ اس سے نہ مطمئن تھے نہ متفق۔ اس لئے ان کی تجویز کی تائید نہیں فرمائی۔ مولاناؒ کے نزدیک اس وقت دعوت و تبلیغ امامت وقت کا سب سے اہم مسئلہ تھا، اس کی طرف متوجہ کیا۔ [۲] حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم مراد ہیں۔

پسندیدہ نظروں سے دیکھا نہ اس کے مالی معاملات میں اپنی ذمہ داری محسوس کی. اس لئے جن مصائب و تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، ان کا اندازہ مولانا آزادؒ کے رقعات سے ہوتا ہے. مالی اعتبار سے ایک مون بھی اطمینان کی صورت پیدا نہ ہو سکی بلکہ ابھی مدرسہ کا باقاعدہ افتتاح بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ گیا جیسا کہ ۳۰ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۲ ر دسمبر ۱۹۲۰ء کے رقعہ سے عیاں ہے.]

(۲۲)

(۷)

[مکتوب الیہ ابھی لکھنو ہی میں تھے اور تنظیم جماعت کے کاموں میں مصروف تھے کہ مولانا آزادؒ کا خط پہنچا]

۲۱ر ستمبر ۱۹۲۰ء

مجبّی فے اللہ!

السلام علیکم ۔ ادھر عرصہ سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا، مولوی عثمان صاحب بھی رانچی کے لئے نہیں آئے[1] بالفعل مدارس کا معاملہ ایک نئی فوری شکل اختیار کر رہا ہے۔ ترکِ موالات کے سلسلے میں سرکاری مدارس سے علیحدگی، علی الخصوص عربی سرکاری مدارس سے نہایت ضروری ہے۔ بنگال میں اس کا مواد بالکل مہیا ہے۔ لیکن ضرورت نئی تعلیم گاہوں کے

---

[1] مولانا آزادؒ رانچی میں نظر بند تھے تو وہاں ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا تھا، اس میں ایک مدرّس کی جگہ کے لئے مولوی عثمان صاحب نے وعدہ کیا تھا۔

متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں۔ ان کی امامت بسروچشم قبول کرنے پر آمادہ ہوں، لیکن تحریک اپنی جانب سے کرنا نہیں چاہتا۔

مولانا آزادؒ نے جواباً تحریر فرمایا۔]

"مولوی عبدالباری کا خط دیکھا ؎

یارما ایں دارد و آں نیز ہم

سردست اس قصہ کو تہ کیجئے اور کام کئے جائیے۔ پنجاب، سندھ، بنگال، میں تنظیم قریب مکمل ہے۔"

(۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء)

مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد (مسجد ناخدا) کلکتہ

[مدرسہ اسلامیہ تحریک ترک موالات کے زمانے میں (اواخر ۱۹۲۰ء میں) قائم ہو چکا تھا۔ لیکن اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۳ دسمبر ۱۹۲۰ء کو گاندھی جی سے کرایا گیا۔ اس موقع پر گاندھی جی نے ایک تقریر بھی کی تھی اور معائنہ کے رجسٹر میں اردو میں یہ جملہ تحریر کیا: "میں مدرسے کی ترقی کے لئے دُآ (دعا) کرتا ہوں۔"

مولانا آزادؒ مدرسہ کے نگراں، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مہتمم اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس تھے۔ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)۔

اخراجات اور مدرسین کی تنخواہوں وغیرہ کا دارومدار اس وقف پر تھا جو جامع مسجد کے مدرسہ کے لئے مخصوص تھا اگرچہ فنڈ میں روپیہ کی کمی نہ تھی لیکن متولیوں کو نہ تو تعلیم سے دلچسپی تھی نہ قومی زندگی میں اس قسم کے مدارس کی اہمیت کا احساس تھا۔ انھوں نے نہ تو مدرسہ کے اجراء و قیام کو

منگوالیں۔

دارالعلوم ندوہ سے کچھ لوگ مل سکیں تو کوشش کیجئے۔ ضرورت ہوئی تو عارضی طور پر آپ کو بھی آجانا پڑے گا۔ بالفعل خیال یہ ہے کہ یہاں کے تمام طلبہ میں آمادگی پیدا ہو گئی ہے، اس کو فوراً کام میں لایا جائے۔ بنگال میں نہایت کثرت سے عربی مدارس ہیں اور سب سرکاری ہیں۔ بنگال کے علاوہ اور کہیں عربی تعلیم گورنمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کم ازکم دو ہزار طلبہ مشغول تعلیم ہیں۔ اتنی بڑی جماعت نے اگر عملاً اقدام کیا، تو تمام ملک پر اس کا بہت بڑا اثر پڑے گا۔ علاوہ بریں وہ مدت کی تمنائیں بر آئیں گی جو اصلاحِ تعلیم کے بارے میں آج تک ناکام رہیں[1]

ابوالکلام

---

[1] قومی مدارس کے قیام سے مولانا آزاد کے پیش نظر تین مقاصد تھے:

۱۔ حکومت برطانیہ کو شکست دینا۔

۲۔ حکومت کے اثر سے پاک آزاد قومی ماحول میں تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا۔

۳۔ نظام ونصاب تعلیم میں قومی نقطۂ نظر سے اصلاحات کرنا تاکہ ایسے علماء پیدا ہوں جو وقت کے تقاضوں کو سمجھ سکیں اور ان کا جواب دے سکیں۔

انتظام کی ہے۔

بالفعل ارادہ ہے کہ مدرسہ جامع مسجد کلکتہ جلد سے جلد کھول دیا جائے۔ روپے کا انتظام ہو چکا ہے، دو سو طلبا تیار ہیں۔ صرف ضرورت اساتذہ اور معلّمین کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس بارے میں سعی کیجئے اور تمام کاموں پر اس کو مقدّم رکھیئے۔

بالفعل دو جگہوں کے لئے مدّرسین کا پورا اسٹاف مطلوب ہے۔ کلکتہ کے لئے اور رانچی کے لئے۔ آٹھ مدّرسین یہاں ہوں گے اور اتنے ہی رانچی میں۔

عربی ادب کی ابتدائی کتابوں سے لے کر درجۂ تکمیل کے علوم تک کے لئے مدّرسین مطلوب ہیں۔ ابتدائی درجوں کے لئے چنداں فکر نہیں ہے۔ لیکن کم از کم دو بہتر مدرّس کلکتہ کے لئے اور دو رانچی کے لئے ضروری ہیں۔ ان میں سے دو شخص پرنسپل ہونے کی بھی صلاحیت رکھتے ہوں۔

وقت و ضرورت اور کام کا مقتضاء تو یہ تھا کہ علماء ہندوستان کی پوری تاریخ میں کم از کم ایک نمونہ تو ایثارِ نفسی کا دکھاتے اور اس کام کو ایک عظیم و جلیل خدمتِ دینی سمجھ کر بلامعاوضہ وقت دینے کے لئے تیار ہو جاتے لیکن اس اُمید کو تو وہم و گمان میں بھی جگہ نہیں مل سکتی۔ کاش اتنا ہی ہو جائے کہ مناسب تنخواہیں لیں مگر دوسری جگہوں پر اس کو ترجیح دیں۔ بالفعل طے پایا ہے کہ تیس سے سو روپے تک تنخواہیں دی جائیں۔

بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ علماء کی جستجو کی جاتی ہے تو ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔ آپ لکھیئے کہ لکھنؤ میں کتنے آدمی مل سکتے ہیں؟ اور مقامات میں کون کون؟ علماء میں جن لوگوں کو وقت کی خدمات کا ذوق ہو، ان کے لئے بہترین موقع ہے۔ قیام وغیرہ کے تمام انتظامات بہ احسن وجوہ کر دیئے جائیں گے تقرر عارضی نہ ہوگا، انشاء اللہ ہر طرح قابل اطمینان۔ میں کسی ایسے معاملے میں تو ہاتھ نہیں ڈالتا جو عارضی ہو۔ ضرورت ہو تو آپ لکھنؤ سے باہر بھی چلے جائیں اور زبانی گفتگو کر کے انتظام کریں۔ روپیہ کی ضرورت ہو تو تار دے کر مجھ سے

(۴۲)

(۹)

[مکتوب الیہ اس زمانہ میں لکھنؤ سے کلکتہ آگئے تھے، مولانا آزادؒ کے ساتھ قیام اور ان کے کاموں میں شریک و معاون تھے۔]

الٰہ آباد۔

۲۹ر نومبر ۲۰ء

اخ العزیز!

السّلام علیکم۔ اُمید ہے کہ آپ باطمینان مشغول کار ہوں گے۔ دہلی میں مولانا محمود حسن صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مولوی شبیر احمد اور مولوی حسین احمد دونوں کو اجازت دے چکے ہیں۔ مولوی شبیر احمد بالکل تیار ہو گئے تھے، لیکن بعد کو اُنھوں نے محسوس کیا کہ یہاں سے علٰحدگی ان کے بعض خاص مقاصد کے لئے مُضِر ہے۔ مولانا کے ساتھ ایک پوری جماعت اصحاب اغراض کی لگی ہوئی ہے۔ غرض ایک ہے اور غرض مند متعدد، اس لئے رقیبانہ کشمکش ہو رہی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہی تنہا رہے اور دوسرا الگ ہو جائے اور اس طرح ذاتی اغراض و مفاد بلا زحمت حاصل ہوں۔ اس کشمکش میں ایک فریق مولوی شبیر احمد بھی ہیں، پہلے اُنھوں نے خیال کیا تھا کہ مدرسہ کی ریاست ان کے قبضے میں آتی ہے، اس لئے بلا تامل آمادہ ہو گئے۔ اب سوچتے ہیں کہ یہ علٰحدگی مولانا حسین احمد کے حلقے کے منافع و مفاد سے انھیں کہیں الگ نہ کر دے اور دوسرے اس پر قابض نہ ہو جائیں۔ اس لئے متردّد ہو رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی حُسین احمد صاحب لے لئے جائیں۔ مولوی شبیر سے زیادہ متین و سنجیدہ معلوم ہوتے ہیں اور درس و تدریس میں بھی کم نہ ہوں گے۔ وہ بخوشی تیار ہو گئے ہیں صرف ایک ہفتہ کی مہلت چاہی ہے۔ مولوی عبد اللہ مصری کو کہہ آیا تھا کہ انتظار کریں اور پھر اپنے ساتھ کلکتہ

(۲۳)

(۸)

۳۰ ستمبر ۲۰ء

حُبّی فی اللہ!

السّلام علیکم۔ خط پہنچا۔ مولوی سید علی صاحب کو ضرور آمادہ کیجئے۔ جو رقم وہاں مل رہی ہے اس سے اس قدر زیادہ کا انتظام ہو جائے گا کہ کلکتہ و لکھنؤ کے مخارج کا فرق پورا ہو جائے۔

مولوی ناظر حسن چھتاری کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ مولوی انور شاہ صاحب دیوبند سے آنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے اگر معقول مشاہرہ ہو۔ پس بہتر ہے کہ آپ فوراً دیوبند چلے جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے بھی زور ڈلوائیں اور مدرسہ جامع مسجد کلکتہ کی صدارت کے لئے انھیں آمادہ کریں۔ اگر یہ آجائیں تو کلکتہ میں رہیں۔ مولوی سید علی رانچی کے صدر مدرس کر دیئے جائیں۔ اگرچہ مولوی سید علی کے مذاقِ علمی کا حال معلوم نہیں۔ ادب سے تو انھیں ذوق ہے۔

خط میں قیام کی نسبت جو لکھا تھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر تمام مدرسین آگئے تو ان کے قیام وغیرہ کے لئے مکان کا انتظام ہم خود کر دیں گے۔ ایک دو شخصوں کے لئے دقت ہوتی ہے، جماعت ہو تو آسانی ہے۔ بہر حال قیام کی نسبت آپ وعدہ کر لیں، جو تنخواہیں مل رہی ہیں ان سے زیادہ رقوم منظور کر لیجئے۔ دیوبند آپ فوراً جائیں اور مولانا محمود حسن صاحب سے طالبِ اعانت ہوں۔ ان سے مشورہ لیجئے اور خطوط۔ متعدد آدمی دیوبندی حلقے کے ہاتھ آجائیں گے۔ مقصود تعجیل ہے، زیادہ تاخیر میں اتلافِ کار کا خوف ہے۔ ممکن ہے طلبہ کی مستعدی ضعیف پڑ جائے۔

ابوالکلام

متولی سے بھی اس بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔ وظائف کی نسبت وعدہ لے لیا ہے۔

ابوالکلام

(۲۶)

(۱۱)

[مولانا ملیح آبادی مدرسہ کی ضروریات کے لئے روپیہ لینے، جامع مسجد کے متولی سیٹھ احمد زکریا کے مکان پر گئے۔ لیکن اس نے نہ صرف ملنے سے انکار کردیا بلکہ مولانا آزادؒ کے خط کا جواب دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ملازم سے مدرسہ کے حساب کا رجسٹر منگوانا چاہا تو بھی اس نے ترشروئی سے جواب دیا اور انکار کردیا۔ مولانا ملیح آبادی خفیف ہوکر چلے آئے اور مولاناؒ کو کیفیت لکھ بھیجی۔ مولاناؒ نے یہ جواب دیا۔]

۱۳ر جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

افسوس ہے کہ اس نالائق کے یہاں جاکر آپ کو یہ ناگوار واقعہ پیش آیا۔ خیر آیندہ آپ کو جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ آج صبح میں نے متولیوں سے احتیاطاً کہہ دیا تھا کہ اوقاف مدرسہ کی وصولی کا تعلق آیندہ، عبداللطیف یا احمد سے ہم نہیں رکھ سکتے۔ وہ بطورِ خود انتظام کریں۔ حاجی محمد زکریا نے اس غرض سے کل چار بجے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ انشاء اللہ یہ تمام مشکلات دُور ہو جائیں گی۔

ابوالکلام

لے جائیں۔ غالباً اب وہ روانہ ہوگئے ہوں گے یا روانگی کے لئے آمادہ ہوں گے۔ آپ طلباء میں اعلان کردیں کہ جمعیۃ العلماء کے جلسے اور مولوی محمود حسن صاحب کی علالت کی وجہ سے تاخیر ہوگئی، اب مولوی حسین احمد آرہے ہیں، جو پندرہ[1] سال تک مدینہ منورہ میں درس حدیث دیتے رہے ہیں اور تمام حلقہ دیوبند میں مولانا[1] کے بعد ہر طرح بہتر و افضل ہیں۔

جیسا کہ پہلے سے خیال تھا، جمعیۃ العلماء سے بجز اس کے کوئی فائدہ نہ ہوا کہ ترک موالات پر ایک فتوای طیار ہوگیا، اور یہ بہرحال ایک مفید اور ضروری کام ہوا۔

امید ہے آپ مطمئن اور خوش حال ہوں گے۔ اگر مولوی حسین احمد صاحب اب تک نہ آئے ہوں تو ایک تار مولانا محمود حسن صاحب بذریعہ ڈاکٹر انصاری دریا گنج، دہلی کے نام بھیج دیجئے کہ مولوی حسین احمد صاحب جلد آئیں۔ میں انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں کلکتہ پہنچا ہوں، خط کا جواب آپ بانکی پور کے پتے سے بذریعہ مسٹر مظہر الحق صاحب روانہ کریں۔

ابوالکلام

(۲۵)

(۱۰)

[مولانا ملیح آبادی نے مدرسہ کی ضروریات اور طلباء کی اعانت کے لئے روپیہ کی ضرورت کا اظہار کیا تھا۔]

۳۰ ربیع الاول[2] ۱۳۳۹ھ

کل صبح مجھے اندازاً بتا دیجئے کہ بالفعل ان طلبہ کی اعانت کے لئے کس قدر چاہیئے تاکہ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ پھر انشاء اللہ جنوری میں تمام انتظام ہو جائیں گے۔ آج

---

[1] حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مراد ہیں۔

[2] مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۲۰ء۔

ابوالکلام

(۲۹)

(۱۴)

۲۷ رجمادی الثانی [۱۳۳۹ھ[1]]

کل میں اسی غرض سے ملنا چاہتا تھا، مگر آپ موجود نہ تھے۔ مہینہ اگر ختم ہوگیا ہے تو تنخواہ کی حسب معمول فہرست لکھنی چاہیئے اور تنخواہیں حسب معمول بانٹ دینی چاہئیں۔ پرسوں متولیوں سے گفتگو ہوگئی، عارضی طور پر وہ ابھی روپیہ دیتے رہیں گے، اور مستقل انتظام اپنی کمیٹی کی منظوری کے بعد کریں گے۔ پس اگر تنخواہ کا بل بن جائے تو وہاں بھیج دیا جائے۔ باقی رہی آپ کی رقم تو اس کو بھی ماہ گزشتہ کے قرض کی رقم میں دکھا دیجئے۔[2]

طالب علم کو آپ ماہ آئندہ کی رقم وظائف دے سکتے ہیں، جو بل میں مجموعی درج ہوگی۔[3]

ابوالکلام

(۳۰)

(۱۵)

[مولانا ملیح آبادی مدرسۂ اسلامیہ کے مہتمم تھے لیکن مدرسہ کے بعض طلباء کی عمر اور ان کی داڑھی کے مقابلے میں بقیمت بہتر ہونے کے باوجود بصورت کہتر تھے، آپ نے بصورت بھی بہتر بننے کی خاطر مولانا آزادؒ کا جبہ

---

[1] مطابق ۷ر مارچ ۱۹۲۱ء

[2] غالباً مولانا ملیح آبادی کی بھی کچھ تنخواہ مقرر کر دی گئی تھی، اس کی ادائیگی کے لئے انھوں نے لکھا تھا۔

[3] مدرسہ کا ایک طالب علم کسی شخص کا مقروض تھا، اس نے قرض کی ادائیگی کے لئے کچھ رقم مانگی تھی۔

(۲۷)

(۱۲)

[کتابوں کی تجلید، میز، کرسی اور دیگر ضروریات مدرسہ کے لئے روپیہ طلب کرنے پر مولانا کا جواب:]

لیکن بالفعل روپیہ بالکل نہیں ہے آج سہ پہر کو خود اسی غرض سے جانے والا ہوں۔

ابوالکلام

(۲۸)

(۱۳)

[ترک موالات کے زمانہ میں انگریزی کپڑے اور ہر قسم کے مال کا بائیکاٹ کیا گیا۔ ہر شخص جس کے اندر ذراسی قومی غیرت و حمیت بھی تھی، اس نے دیسی کھڈی کا بنا ہوا کپڑا پہننا شروع کر دیا تھا۔ گھر گھر چرخے چلائے جاتے تھے اور قومی اسکولوں میں بھی ان کا چلانا سکھایا جاتا تھا۔ گویا کہ چرخا قومی نشان بن گیا تھا مدرسہ اسلامیہ کے طلبا نے بھی چرخوں کے لئے اصرار کیا نیز درخواست کی کہ سالانہ امتحان ۱۵ ر رجب کی بجائے یکم شعبان سے لیا جائے۔]

[۲۷ ر جمادی الثانی مطابق ۷ ر مارچ ۱۹۲۱ء سے قبل]

مجھے صبح چار بجے سے سخت پیچش ہو گئی ہے اور طبیعت معطل ہے۔ اگر مولوی منیر الزماں کے یہاں چرخے عمدہ ہیں، تو آج ہی پانچ چرخے وہاں سے منگوا لئے جائیں، قیمت ان کو دے دی جائے گی یا یوں کہیئے کہ جس قدر ان کے پاس ہوں، خلافت کمیٹی خرید لے اور کمیٹی سے حسب ضرورت مدرسے کے لئے لے لئے جائیں۔

فضل دین سے کہہ دیجئے امتحان کی مدت بڑھا دی جا سکتی ہے مجھے کوئی عذر نہیں۔

اعلان کر دیا گیا تھا۔ مولانا ملیح آبادی بھی لکھنؤ آگئے تھے اور ملیح آباد جانے والے تھے کہ مولانا آزادؒ کا خط پہنچا۔]

۲۵ اپریل ۱۹۲۱ء[1]

صدیقی العزیز!

السّلام علیکم۔ لکھنؤ میں شیعہ کانفرنس ہے۔ بعض مصالح کی بناء پر ارادہ کر رہا تھا کہ اس میں شریک ہوں، لیکن اب وہ خود بُلا رہے ہیں اور شرکت ضروری ہے۔ میں بدھ (۲۸) کو روانہ ہوں گا اور جمعرات (۲۹) کی سہ پہر کو میل ٹرین سے پہنچوں گا۔ اُمید ہے آپ سے ملاقات ہو۔ خط اس لئے لکھتا ہوں کہ آپ ملیح آباد نہ چلے جائیں۔ لکھنؤ میں موجود رہیں۔ اگر کانفرنس والے مُصر ہوئے تو میں وہیں ٹھہروں گا۔ ورنہ فرنگی محل یا علی میاںؒ کے یہاں۔

ابوالکلام

(۳۳)

(۱۸)

[جامع مسجد کلکتہ کے متولیوں کے درمیان ایک اختلاف میں مولانا آزادؒ کو فریقین نے حکم بنایا تھا۔ اس سلسلے میں مولاناؒ کا یہ رقعہ ہے]

[اوائل جولائی ۱۹۲۱ء]

مدرسہ میں انگریزی وحساب جو شخص پڑھاتے ہیں، غالباً محمد یوسف نام ہے، ان سے آج کہہ دیجئے گا کہ متولیانِ مسجد فیصلہ مقدمہ کے لئے متقاضی ہیں اس لئے جمعرات کے دن ۹ بجے کا وقت مقرر کیا گیا ہے۔ تمام مُدعیانِ مقدمہ کو بھی اطلاع دے دیں۔ اگر کسی وجہ سے مدعی تاخیر چاہتے ہیں، تو اب میں خود اور تاخیر نہیں کر سکتا، ان کو چاہیئے کہ خود حاجی محمد زکریا سے

---

[1] مطابق ۱۷ شعبان ۱۳۳۹ھ۔

[2] نواب علی حسن خاں ابن نواب مولانا صدیق حسن خاں آف بھوپال۔

مانگ کر استعمال کرنا شروع کیا، لیکن بات بنی نہیں۔ جُبہ مولانا نے کو اس تحریر کے ساتھ واپس کیا کہ: "جبہ واپس ہے، آپ کو بھی ضرورت ہوگی، جناب کا نیا جُبہ جب سِل جائے گا تو یہ ..... میرے کام آئے گا۔ مولانا بھی یہ بات سمجھ گئے اور اس تحریر کے ساتھ جُبہ واپس کیا۔]

اس محبت کے لئے شکر گزار ہوں! سر دست ایک جُبہ تو میرے پاس ہے، البتہ اس وضع کا سلوانا چاہتا ہوں۔ آپ کے پاس رہے جب کپڑا لیا جائے گا، تو نمونے کے لئے درزی کو دے دیں گے۔

ابوالکلام

(۳۱)

(۱۹)

[آخری چہار شنبہ کی تعطیل کے لئے مدرسہ کے طلبہ کے اصرار پر مولانا نے مندرجہ ذیل جواب لکھا، اس کی حیثیت ایک فتوٰی کی ہے اور اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔ آخری چہار شنبہ ۲۷ رجب ۱۳۳۹ھ (مطابق ۶ر اپریل ۱۹۲۱ء) کو تھا۔]

آخری چہار شنبے کا تخیل، مشرکین جاہلیت کے خیالات کا بقایا ہے جس کی نسبت حدیث ہے لا ھول ولا صفر۔ لیکن اگر تعطیل کی رسم ہے تو بلا اقرار تعطیل کر دیجئے۔

ابوالکلام

(۳۲)

(۱۷)

[مدرسہ اسلامیہ کے سالانہ امتحانات کے بعد جیسا کہ قاعدہ تھا وائل شوال تک کے لئے تعطیلات کر دی جاتی ہیں، شعبان کے دوسرے ہفتہ میں تعطیلات کا

اس وقت اِس درجہ پریشان خاطر ہوں کہ فضل دین صاحب سے حساب کے چند الفاظ سُننے سے بھی اُکتا گیا۔ اب ان کو گاڑی منگوا دیجئے اور کرایہ بدرالدین سے گاڑی والے کو دلا دیجئے تاکہ واپسی میں زحمت نہ ہو۔ اور میری طرف سے معذرت کردیجئے۔

ابوالکلام

[ذیل میں مولانا آزادؒ کے چند رقعات درج ہیں۔ ان پر تاریخ نہیں پڑی ہوئی ہے نہ ایسے واضح قرائن موجود ہیں جن سے ماہ و تاریخ کا تعین کیا جاسکے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ رقعات بھی ۱۹۲۱ء ہی کے ہیں۔
نمبر (۲۱) سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قبل از ۱۵ر نومبر ۱۹۲۱ء کا ہے کہ اس زمانہ میں بیعت کا سلسلہ زور و شور کے ساتھ جاری تھا۔]

(۳۶)

(۲۱)

میں ایک بجے سے نکلا ہوا اب واپس آیا ہوں۔ مٹیا برج کے جلسے میں نہایت پریشانی پیش آئی۔ اس کے بعد بھی تمام وقت مغز پاشی میں صرف ہوا۔ اِس لئے اور لوگوں سے بھی نہ مل سکا اور بیعت کے لئے کل شام کو بُلایا۔ اگر یہ بھی کل بعدِ مغرب آجائیں، تو اطمینان کے ساتھ یہ معاملہ انجام پائے۔

ابوالکلام

(۳۷)

(۲۲)

السلام علیکم

مسافر ایرانی کے لئے خلافت کمیٹی والوں سے کہہ دیا ہے، وہاں سے ساٹھ روپے آج سہ پہر تک ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ وہ آج شام کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو جائیں اور

بل کر کوئی عذر کریں اور چند دنوں کی تاخیر کے طلب گار ہوں۔ مثلاً وہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام مُدّعی موجود نہیں، یا اس دن نہیں آسکتے، دوسرا دن مقرر کیا جائے۔

ابوالکلام

(۳۴)

(۱۹)

[مدرسہ کے اخراجات کے لئے روپیہ طلب کرنے پر]

۱۰ر نومبر ۱۹۲۱ء

السّلام علیکم

مُرسل ہیں، آپ مختار ہیں، جس طرح مناسب سمجھیں، طلباء کو اِس سے مدد دیں اور اس رقم کو درج حساب کرلیں۔ یہ میں نے اپنے پاس سے دی ہے، فنڈ سے مطلوب ہوگی۔

ابوالکلام

(۳۵)

(۲۰)

[حضرت مولاناؒ کا یہ رقعہ ۲۳ر ستمبر اور ۱۵ر نومبر ۱۹۲۱ء کی درمیانی مدت کا ہے۔ "پیغام" اس وقت جاری تھا فضل الدّین احمد اس کے منیجر تھے۔ ۱۵ر نومبر سے قبل مولاناؒ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے تھے جہاں ان کی صدارت میں جمعیۃ العُلماء ہند کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ یکم دسمبر کو مولاناؒ واپس ہوئے تو اس وقت مولانا ملیح آبادی گرفتار ہو چکے تھے۔]

سردست کونسی ملازمت ہے، جس کا انتظام کیا جاسکتا ہے؟ ملاقات کے لئے جب انھوں نے کہا تھا، تو آپ کم سے کم میرے اوقات کا لحاظ رکھتے، مدرسہ میں بالفعل کوئی گنجائش نہیں۔ اور کوئی مدرسہ میرے ہاتھ میں نہیں کاش اس وقت پیدل آنے کی زحمت ان کو نہ دی گئی ہوتی

نے اعلیٰ پیمانہ پر پُورا کیا۔" اگر کہا جائے کہ اِس سے پیشتر یا اس کے بعد ویسا عربی اخبار ہندوستان و پاکستان سے کبھی جاری نہ ہوا تو یہ بالکل بجا ہوگا۔" (مولانا غلام رسُول مہرؔ) اس کے بند ہونے کی وجہ کے بارے میں مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں "ہندوستان میں اس کے زیادہ خریدار مہیّا نہ ہونے اور ۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت و ترک موالات کا جوش باقی نہ رہنے کی وجہ سے پرچہ بند ہوگیا۔"

"الجامعہ" کے ابتدائی دو نمبر مولانا آزادؒ کی غیر موجودگی میں شائع ہوتے تھے اس سلسلے کے مولانا آزادؒ کے دو تاریخی خطوط پیش کئے جاتے ہیں "الجامعہ" کے متعلق ایک خط مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے نام بھی تھا جو اگرچہ شائع ہو چکا ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر شامل کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام:۔]

ملتان

مارچ [۱۹۲۳ء]

اخ العزیز!

السّلام علیکم

لکھنؤ میں دستی خط ملا تھا، وہاں سے آگرہ آگیا، آگرہ کا قصد تھا نہ ضرورت، لیکن ایسی صُورت پیش آگئی کہ گئے بغیر چارہ نہ تھا، وہاں سے لاہور آیا اور لاہور میں الجامعہ دیکھا۔ مجھے رسالے کی ترتیب اور مجمُوعی ہیئت کی طرف سے تشویش تھی، لیکن بحمداللہ کہ وہ بلا وجہ ثابت ہوئی۔ نہایت خوش اسلوبی سے آپ نے یہ کام سرانجام دے دیا۔ البتہ طباعت کی غلطیاں اور حرُوف کا التباس جابجا ہے۔ خصوصًا و اور د کا التباس، اور مرکب الفاظ کے حرُوف کی تقدیم و تاخیر۔ آئندہ زیادہ غور کے ساتھ پروف دیکھئے گا تو غلطیاں کم

آغا صفدر صاحب سکریٹری خلافت کمیٹی سے ملیں۔ وہ آگے کے لئے ان کا انتظام کردیں گے اور وہاں کسی طرح کی زحمت پیش نہ آئے گی۔ آغا صفدر سے ان کو اپنے حالات بیان کردینے چاہئیں۔ مزید اعتماد کے لئے خلافت کمیٹی بنگال کی جانب سے ایک خط بھی روپیہ کے ساتھ ان کو مل جائے گا۔

ابوالکلام

(۳۸)

(۲۳)

[ایک صاحب مولانا آزادؒ سے ملے اور بڑی لمبی چوڑی اسکیمیں سامنے رکھیں۔ لیکن مولاناؒ نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ دوسرے روز انھوں نے اپنی چند مجبوریاں ظاہر کیں۔ اسی سلسلے میں ملیح آبادی کو یہ رقعہ لکھا]

نیچے وہ سرحدی شخص آیا ہے، آپ اسے تنہائی میں یہ پندرہ روپے دے دیں اور میری جانب سے کہدیں کہ آپ کے مصارف کے لئے دیئے گئے ہیں، قبول کیجئے اور روانہ ہوجائیے۔ باقی اور کوئی انتظام بالفعل نہیں ہوسکتا، ان امور کا خیال ترک کردیں۔

[ابوالکلام]

(۳۹)

(۲۴)

["الجامعہ" عربی کا ایک ماہنامہ تھا جو کلکتہ سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زیرنگرانی اپریل ۱۹۲۳ء سے جون ۱۹۲۴ء تک جاری رہا تھا۔ رسالہ کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے تمام ضروری حالات مصر و عرب اور دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچائے جائیں اور اس طرح بین الملی روابط مستحکم کئے جائیں۔ یہ مقصد "الجامعہ"

(۴۰)

(۲۵)

[مولانا آزادؒ ابھی سفر ہی میں تھے مولانا ملیح آبادی نے "الجامعہ" کا دوسرا نمبر بھی شائع کر دیا۔ اسے دیکھ کر مولاناؒ نے یہ خط لکھا۔]

لاہور

۱۹/ اپریل [۱۹۲۳ء]

اخ العزیز!

السّلام علیکم۔ اسی وقت آپ کا خط ملا اور اسی وقت جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ نے دوسرا نمبر نکالنے کے لئے جو اہتمام کیا، اس نے آپ کی مستعدی کا نقش میرے دل پر ثبت کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ سید رشید رضا کا مضمون آپ رسالے میں شائع کر رہے ہیں اور بالکل محسوس نہیں کرتے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

لکھنؤ میں جب آپ کا خط آیا اور آپ نے سید کے مضمون کا حال لکھا تو میں سمجھا تھا کہ انھوں نے اتحادیوں[1] کے خلاف شکایتیں کی ہوں گی اور نوٹ میں ان کا جواب دے دینا کافی ہوگا۔ اس لئے لکھا تھا کہ کمپوز کرا لیجئے۔ کلکتہ آکر دیکھوں گا اور نوٹ کے ساتھ شائع ہو جائے گا، لیکن اب اصل مضمون دیکھتا ہوں تو دوسرا ہی عالم نظر آتا ہے۔ نہ صرف متفرنجین ترک بلکہ اثنائے جنگ کی عثمانی گورنمنٹ پر سخت الزامات لگاتے ہیں، "الحاد و تشریع ترکی کا ملزم ٹھہرایا ہے" "حاکمیۃ ملیۃ" کو (جو اس وقت بھی انگورہ کی طاقتور پارٹی ہے) لازم خلافت بیان کیا ہے۔ جمال پاشا کے فرضی مظالم کا اعادہ ہے۔ ثورۂ حجاز کے لئے طبیعی ہونے کا ادّعا ہے۔ اور بحیثیتِ مجموعی اتنی ناتمام حق گوئی بھی نہیں ہے، جتنی "حقائق جلیہ" وغیرہ مقالات "المنار" میں تھی۔ تعجب ہے کہ الجامعہ کے دوسرے

---

[1] ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے رکن انور پاشا وغیرہ۔ ملیح آبادی

رہیں گی۔ اب بڑی دِقت دوسرے نمبر کی ہے، میرا یہ سفر گو آخری سفر ہے، لیکن قصد اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا۔ خیال تھا کہ نو دس اپریل تک واپس پہنچ جاؤں، لیکن اب بمشکل ۱۵/۱۶ر تک واپس ہو سکتا ہوں۔

نہیں معلوم ملتان سے کب رہائی ہو اور اس کے بعد لاہور میں پنجاب کا جھگڑا کب چکے؟ بڑی دِقت یہ پیش آگئی ہے کہ مجھ سے پہلے پنڈت نہرو[1] اور مسٹر داس پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک ترتیب عمل شروع کر چکے ہیں۔ میں اس ترتیب کو اب بدل نہیں سکتا، اور وہ نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ فیصلہ سے بہت دُور کرنے والی۔ بہرحال ارادے سے زیادہ قیام کرنا پڑے گا۔

لکھنؤ، آگرہ اور لاہور میں بے انتہا کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح لکھنے کا موقع ملے، لیکن بالکل نہیں ملا، حتے کہ آگرہ کے متعلق ایک مختصر بیان پریس میں دینے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ لوگ کسی ترتیب و تنظیم کے عادی نہیں ہیں۔ رات کو ایک بجے دو بجے سونے کو مہلت ملتی ہے اور پھر صبح سے جلسے اور جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ نیند کے اوقات کے مختل ہو جانے کی وجہ سے دماغ کام نہیں دیتا۔

بہرحال کوشش کر رہا ہوں کہ چند ضروری چیزیں لکھ کر بھیج دوں۔ آپ بددل اور پریشان نہ ہوں۔ اگر مضمون نہ بھیج سکا، تو مجبوراً دوسرے نمبر کی تاخیر گوارا کر لیجیے گا، اس کے سوا چارہ نہیں، کوئی مضائقہ نہیں اگر آئندہ نمبر پہلی مئی کو ڈبل نکلے۔ اس کے بعد پھر ایسی صورت پیش نہ آئے گی۔ جوں ہی یہ سفر ختم ہوا ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہوں گا۔

[ابوالکلام]

---

[1] ان سے مراد جواہر لال نہیں بلکہ موتی لال نہرو ہیں۔

بیٹھ رہوں پھر ان مشکلات کا خاتمہ ہوجائے گا۔

گاندھی جی کی تصویر پر جو الفاظ مدح و توصیف کے لکھے ہیں، مثلاً القلُ و کا فی حیاتہ، طاھرالذیل، لقی القلب، یہ بھی سخت اعتراضات کا موجب ہوں گے۔ خدارا اِن چیزوں میں احتیاط و حزم سے کام لیجئے[1]۔ صرف "قاعدِ حرکۂ ہندیہ سلمیہ" اور نام کافی ہے۔ امید ہے کہ نئے فارم میں اس کا لحاظ رہے گا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ تاخیر آپ پر بہت شاق گزرے گی۔ لیکن کیا کروں، اس معاملہ میں مجبور ہوں۔ سید رشید رضا کا مضمون کسی حال میں بھی قابلِ اشاعت نہیں ہے۔ یا تو لوح پر سے میرا نام الگ کردیجئے یا یہ مضمون شائع نہ کیجئے۔

اگر فارم بدل کر رسالہ شائع نہ کرسکیں، تو میرا انتظار کریں اس کے سوا چارہ نہیں کہ ڈبل نمبر نکالا جائے۔

فارسی مضمون کے لئے پریشان نہ ہوں اور "اسرارِ بے خودی" وغیرہ چھاپ کر رسالے کو مضحکہ انگیز نہ بنائیں سب باتیں اپنے وقت پر ہوجائیں گی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ رسالے کی ضخامت دو[2] جز رکھی جائے۔ کم کردی جاسکتی ہے۔

میں اس سفر میں بُری طرح پھنسا۔ بے کار وقت گیا۔ اُمید ہے کہ پرسوں یعنی سنیچر کو روانہ ہوسکوں۔

ابوالکلام

---

[1] مولانا آزادؒ نے گاندھی جی کی تصویر پر کلمۂ توصیف کے بارے میں جس حزم و احتیاط کی ہدایت کی وہ ان کی بصیرت اور کمال دوراندیشی پر دال ہے۔

نمبر میں شائع کر رہے ہیں اور اس نوٹ کو کافی سمجھتے ہیں جو ابتدا میں درج کیا گیا ہے۔
نوٹ میں آپ ان واقعات اور طریقِ استدلال کا کچھ ذکر نہیں کرتے، صرف یہ کہتے ہیں کہ ترک اور عرب دونوں نے ایسا کیا ہے، اور ان کا مقصود تمام ترکوں کا عام الحاد نہیں ہے بلکہ بعض کا۔ ہر شخص اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ الجامعہ ان کے تمام افکار سے متفق اور تمام بیان کردہ واقعات کا مصدّق ہے۔ صرف عام و بعض کی توجیہ ضروری سمجھتا ہے۔ نیز ترکوں کی طرح عرب بھی اس کے نزدیک جنسیت کے ملزم ہیں۔

علاوہ بریں آپ نے لکھا ہے کہ ترکوں میں جدید مدنیۃ ملعونہ سے جنسیت پیدا ہوئی، یہ بھی صحیح نہیں۔

غور کیجئے اگر اس مضمون کا ترجمہ ہندوستان میں اخبارات شائع کر دیں، تو مسئلہ خلافت کی تحریک پر کیا اثر پڑے گا؟ جدید انقلاب خلافت کے بعد سے تمام یورپین اخبارات تو یہی کہہ رہے ہیں کہ ینگ ٹرک ملحد ہیں، اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ اسی کی ایک شہادت آپ نے بھی دے دی۔ ایسی شہادت جس میں یہاں تک لکھا ہے کہ اباحوا لمهتك كن افجور النساء المسلمات۔ عام مسلمانوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ ہندوستان کے علماء تو پہلے سے نوجوان ترکوں کے خلاف مستعد ہو رہے ہیں۔

خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے، اور یہ مضمون شائع نہ کیجئے۔ دوسرا نمبر شائع نہ ہو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن ایک نیا فتنہ نہیں پیدا کرنا چاہیئے۔ اور نہ اباطیل و اکاذیب کی اشاعت میں حصّہ لینا چاہیئے۔ یہ کچھ فرض نہیں کہ ان کا ہی مضمون ضرور شائع ہو۔ اگر وہ پسند کریں گے، کوئی اور تحریر بھیج دیں گے۔ نہیں بھیجیں گے تو ان کی مرضی۔

بہر حال اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ ابتداء کا ایک فارم بدل دیا جائے اور اس میں کوئی اور مضمون دے دیا جائے اگر اور کوئی مضمون نہ ہو تو پھر ایک نمبر "حکم حمل سلاح علی المسلم" کا دے دیجئے۔ اس مرتبہ میں کلکتہ پہنچ جاؤں اور مطمئن ہو کر

مکان کا انتظام نہ ہو، یہ تمام کمرے حاضر ہیں۔ آپ یہاں قیام کیجئے۔ ہرگز ہرگز یہاں سے تبدیلی مقصود نہیں ہے۔

[ابوالکلام]

(۴۲)

(۲۷)

[" الجامعہ" اور "پیام" بند ہو جانے کے بعد مولانا ملیح آبادی بے کار ہو گئے اور مولانا آزاد کی جانب سے جو رقم ہر ماہ ملتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ مولانا ملیح آبادی نے اپنی بے کاری کی شکایت کی۔ مولانا کا درج ذیل مکتوب اسی شکایت کا جواب ہے۔]

۳۰ر جولائی ۱۹۲۵ء

عزیزی! کئی باتیں بالکل صاف ہیں۔

۱۔ کام شروع ہونے میں اتنی دیر نہیں، جتنی آپ سمجھتے ہیں۔

۲۔ میرا خیال یہی ہے کہ آپ ایک عزیز کی طرح میرے ساتھ ہیں، اور یہ بالکل ٹھیک ہے کہ کام نہ ہونے کی صورت میں بھی مجھے آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ میری جانب سے اس لئے اس میں سستی ہوئی کہ میں نے دیکھا آپ نے تھوڑا بہت باہر کا کام جاری رکھا ہے[۱]۔

۳۔ میں ۳۰ روپیہ آپ کو کل بھیج دوں گا۔ اگست کے خاتمہ میں بھی آپ ۳۰ اپنی لازمی ضروریات کے لئے لے لیں اور اگر ستمبر میں کام نہ شروع ہو تو اس میں بھی۔ یہ ضروری ہے کہ اکتوبر سے زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔ یہ بھی اس صورت میں کہ میں باہر جاؤں،

---

[۱] مولانا ملیح آبادی نے الہلال بک ایجنسی کے لئے ابن تیمیہ اور ابن قیم (رحمہا اللہ) کی بعض کتابوں کے ترجمہ کرنا شروع کر دیئے تھے اور اس سے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی، مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔

(۱۴۱)

(۲۶)

[مولانا آزادؒ رپن اسٹریٹ کے مکان سے اواخر ۱۹۲۵ء میں بالی گنج، سرکلر روڈ کی ایک کوٹھی میں اُٹھ آئے تھے کوٹھی کے احاطہ میں پریس کی مشینوں کے لئے شیڈ ڈال دیا گیا تھا اور اخبار (پیام) کے عملے کے لئے کمرے تیار کر دیئے گئے تھے، ان میں سے ایک کمرے میں جو مالی کی کوٹھری کے پاس تھا، مولانا ملیح آبادی کو اُٹھ جانے کا حکم ہوا۔ مولانا ملیح آبادی نے اس کو ناپسند کیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ایک رُقعے میں مولاناؒ سے بھی کر دیا۔ مولاناؒ نے اس رقعہ کا درج ذیل جواب دیا۔]

[۱۹۲۵ء]

استغفراللہ، یہ تو بڑی مُصیبت ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک نیا قصہ پیدا ہو جائے۔ خُدا کی قسم میرے وہم وگمان میں بھی آج تک یہ مسئلہ نہیں آیا کہ وہاں چلے جائیں۔ خود بدرالدین[1] نے آکر کہا کہ وہ کہتے ہیں، وہ کمرہ تیار کر دیا جائے تو میں جاؤں گا۔ نیز دروازہ پر چک کے لئے کہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں مکان تو کب کا تیار ہو چکا ہے، چک منگوا دو۔ بہرحال میرا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ آپ "ناگواری" کے ساتھ وہاں قیام نہ کریں۔ مالی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ جگہ دروازے کے پاس ہی رہے گی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکے گی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ کوئی بات بھی میری خاطر ناگواری سے کریں۔ اسی بدرالدین نے جھوٹ سچ آکر مجھ سے کہا کہ نہیں آپ وہاں قیام کریں گے حالانکہ میں نے مکان کی جستجو کے لئے کہدیا تھا جو خود آپ ہی کی تجویز تھی۔ جب تک

---

[1] بدرالدین مولانا آزادؒ کے سالے تھے مولاناؒ کے ساتھ ہی رہتے تھے، خنازیر کے مرض میں مبتلا ہوتے مولاناؒ نے ہر چند علاج میں سعی فرمائی لیکن ۱۹۲۸ء میں عین جوانی میں انتقال کیا۔

[ابوالکلام]

(۴۴)

(۲۹)

[۱۹۲۶ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا ملیح آبادی بیمار ہوئے اور دو ماہ تک صاحبِ فراش رہے جب طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تو ملیح آباد تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پھر بیمار پڑ گئے۔ کلکتہ واپسی کا ارادہ بھی ترک کر دیا اس کی اطلاع مولاناؒ کو دی، ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرمایا کہ "الگ کام کرنا چاہتا ہوں لمبی مدت تک ساتھ رہا ہے، لوگ مجھے آپ کا آدمی سمجھنے لگے ہیں، اور میں نہیں چاہتا کہ آئندہ لوگوں کو میری وجہ سے آپ پر اعتراض کرنے کا موقع ملے لہذا اجازت دیجئے کہ اعلان کر دوں، آپ میرے خیالات اور کاموں کے ذمہ دار نہیں ہیں۔" مولاناؒ کا جواب درج ذیل ہے۔]

[وسط مئی ۱۹۲۶ء]

عزیزی! السلام علیکم

سفر سے واپس آیا تو ڈاک میں آپ کا کارڈ اور خط ملا۔ افسوس میں کس خیال میں تھا اور آپ کس طرف جا رہے ہیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ کا یہ ارادہ ہے۔ اگر ہوتی تو میں یہیں آپ سے گفتگو کرتا اور آپ کا اضطراب دُور ہو جاتا۔ آپ نے اس تمام عرصے میں اچھی طرح اس بات کا اندازہ کر لیا ہے کہ میں نے کبھی کسی ذاتی انتفاع کے خیال سے نہ تو آپ کو باصرار روکنا چاہا نہ کسی دوسری مشغولیت کے اختیار کرنے میں حائل ہوا۔ البتہ ہمیشہ اپنے دل کی محبت اور چاہت کی وجہ سے اس کا خواہش مند ضرور رہا کہ حتی الامکان آپ جُدا نہ ہوں۔ آپ نے بھی ہمیشہ ایسے ہی جذبات ظاہر کیے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ کئی سال کا زمانہ یکجائی میں گزر گیا۔ اب بھی میرے دل کا وہی حال ہے

ورنہ ستمبر میں اجراء لازمی ہے۔

۴۔ کام شروع ہونے پر آپ کے لئے اِس سے زیادہ رقم قطعاً ہونی چاہیئے، جو پچھلے دنوں آپ لیتے رہے، لیکن کیا آپ اس کے یقین کے لئے وقت اور مجھ پر اعتماد کریں گے۔

[ابوالکلام]

(۴۳)

(۲۸)

[مولاناؒ کے پچھلے خط کے بعد مولانا ملیح آبادی نے پوچھا تھا کہ آئندہ ان کے کاموں اور ذمہ داریوں کی نوعیت کیا ہوگی یعنی کیا کام کریں گے، کتنا وقت دیں گے اور کس قدر تنخواہ ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن گفتگو ناتمام رہ گئی۔ پھر ملیح آبادی آئے تو مولاناؒ مصروف تھے اور جب مولاناؒ نے یاد فرمایا تو ملیح آبادی موجود نہیں تھے۔ اِس پر مولاناؒ نے یہ خط لکھا۔ اگرچہ اس مکتوب پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ پچھلے مکتوب کے بعد ہی لکھا گیا ہے۔]

اخ العزیز!

کل آپ سے باتیں ناتمام رہ گئیں، دن کو دوبارہ دریافت کیا، لیکن معلوم ہوا کہ آپ باہر ہیں۔ دوپہر کو آپ آئے لیکن شوکت صاحب کا جھگڑا چل رہا تھا، باتیں نہ ہو سکیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے خیالات لکھ کر مجھے دے دیں۔ اور میں ان کا جواب لکھ کر آپ کو دے دوں۔ آپ نے کل دریافت کیا تھا کہ میرے کاموں کی صورت کیا ہوگی؟ غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ صاف صاف معلوم اور طے ہو جائے کہ اب آپ کے تعلق اور مشغولیت کی نوعیت کیا ہے؟ اگر یہی بات ہے تو جو کچھ آپ کے پیش نظر ہو، آپ خواہ زبانی خواہ بذریعہ تحریر بتلادیں تاکہ حالتِ منتظرہ باقی نہ رہے۔

نکل سکے یا نہیں، پہلی جولائی سے کم از کم پچھتّر روپیہ کا آپ کے لئے ضرور انتظام ہوجائے۔ پھر اس سفر میں بعض اشخاص نے ایک خاص اسلوب کے اخبار کے فوری اجراء پر زور دیا تو میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے آپ کی ایڈیٹری میں دے دوں اور اپنی صرف نگرانی رکھوں۔ نیز کوئی ایسی صورت تجویز کرلی جائے کہ اخبار کی وجہ سے آپ کو مالی ترقی کا کافی موقع مل جائے، چنانچہ کلکتہ آکر ارادہ کررہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں کہ آپ کے خط نے دوسری صورت پیدا کردی۔

عزیزم! بلاشبہ کاموں کے تعطّل سے جو نتائج پیدا ہوئے، ان کی آپ کو شکایت ہے اور یقیناً وہ شکایت حق بجانب ہے، لیکن اگر یہ تعطل آپ کے لئے نقصان دہ ہوا تو یقیناً میرے لئے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوا۔ آپ ایک لمحہ کے لئے بھی ان نقصانات کا اندازہ نہیں کرسکتے جو مجھے برداشت کرنا پڑے اور کررہا ہوں۔ بلاشبہ مجھے حق نہیں کہ اپنے نقصانات کے لئے، جو میری ہی غلطی کا نتیجہ ہیں، آپ کو اظہار ہمدردی پر مجبور کروں، لیکن، کیا آپ کے لئے موزوں ہے کہ آپ صرف اپنے ہی کو دیکھیں اور میرے لئے آپ کے اندر کوئی جذبہ نہ ہو؟ آپ کو تو یقیناً ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ جس کی محبّت واخلاص پر مجھے اب تک اعتماد رہا ہے اور علم اللہ جسے اپنا ایک عزیز و حبیب یقین کرتا ہوں۔ مان لیجئے، کسی وجہ سے آپ علٰحدہ بھی ہونا چاہتے تھے، تو کم ازکم اِس موقع پر تو آپ ایسا نہ کرتے، جب ضرورت تھی کہ آپ ایسا عزیز و مخلص میرا ہاتھ بٹاتے۔

یقین کیجئے، مجھ پر آپ کی اس وقت کی علیحدگی اس لئے زیادہ شاق گزر رہی ہے کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بے کاری سے بے دل ہو کر جارہے ہیں اور مجھے آپ کے لئے ان باتوں کے انجام دینے کا موقعہ نہیں مِلا ہے، جو انجام دینا چاہتا تھا۔ میں آپ کو اپنے ایک عزیز کی طرح مخاطب کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر علٰحدہ ہی ہونا چاہتے ہو تو کم ازکم اس وقت علٰحدہ نہ ہو۔ جہاں اتنا وقت نکل گیا، وہاں چند مہینوں کا بسر کرنا کچھ مشکل نہ

وہی خواہش ہے اور وہی جذبہ، اور میں نہیں جانتا کہ اس گفتگو کے بعد جو آخری مرتبہ آپ کی آئندہ زندگی اور کاموں کے متعلق ہوئی، نئی بات کونسی پیدا ہو گئی ہے، جس کی وجہ سے آپ علٰحدگی کا قصد کر رہے ہیں؟ تاہم اگر آپ نے ارادہ مُصمم کر ہی لیا ہے، تو میرے لئے بجز اس کے کیا رہ جاتا ہے کہ ہر حال میں آپ کی بہتری اور فلاح کا خواہشمند رہوں اور دُعاء کروں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی کے لئے بہتر مشغولیت کا سامان کر دے۔

باقی رہی یہ بات کہ اس کی نسبت کوئی ایسا اعلان ہو جائے کہ آیندہ آپ کے کام میری طرف منسوب نہ کئے جائیں، تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خواہ کسی پیرائے میں یہ بات لکھی جائے، بے اعتمادی کے اثر سے خالی نہ ہوگی، اور جب درحقیقت کوئی ایسی صورت درپیش نہیں تو ضرورت کیا ہے کہ خواہ مخواہ کوئی اعلان کیا جائے؟

البتہ میں اپنے دل کی محبت سے مجبور ہو کر اتنا ضرور لکھوں گا کہ آپ اگر علٰحدہ نہ ہوں تو یہ بہتر ہے۔ میں نے پچھلی گفتگو کے دَوران میں تمام امُور واضح کر دیئے تھے۔ پس اگر اپنی آئندہ مالی ضرُوریات کا خیال ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس گفتگو کے بعد آپ کو کیوں پریشانی ہوئی؟ اِس گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ دو تین ماہ کے اندر کام شروع نہ ہو تو یہ ضرُوری ہوگا کہ آپ کو ایک مقررہ رقم وصُول کرنے کا حق ہو۔ افسوس ہے کہ آپ بیمار ہو گئے۔ جہاز جانے کا موقع بھی باقی نہ رہا[۱]۔ اب آپ کو دیکھنا تھا کہ کوئی انتظام ہوتا ہے یا نہیں، اگر نہ ہوتا تو آپ ہی کر لیتے، جو اس وقت کرنا چاہتے ہیں۔

آپ جس وقت جا رہے تھے، میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آپ ایک ماہ وطن میں رہیں گے۔ اس لئے ضرُوری ہے کہ پہلی جولائی سے آپ کی نئی مشغولیت شروع ہو جائے۔ میں نے قطعی ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ پریس جاری ہو یا نہ ہو، اخبار وغیرہ

[۱] موتمر کا اجلاس ۲ر جون ۲۶ء کو ہونے والا تھا، مولانا آزادؒ خود بھی جانے کا ارادہ تھا اور مولانا ملیح آبادی کو بھی بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا ملیح آبادی بیمار ہو کر اپنے وطن چلے گئے اور مولاناؒ خود بھی نہ جا سکے۔

گرایا جاتے۔ وہ دہرہ دون جارہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے وہاں بھجوادو۔ اگر لکھنؤ کی بات پکی نہ نکلی تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ دہرہ دون چلا جائے۔ دونوں صورتوں میں ضرورت ہو گی کہ کوئی شخص ساتھ ہو، کیا آپ کی صحت ایسی ہے کہ آپ اس میں مدد دے سکیں؟

اپنے والد صاحب اور بھائیوں کو دعائے خیر پہنچا دیں۔ ہاں! آپ نے شرف الدین کی بھیجی ہوئی کتابوں کی نسبت لکھا، میں جب آپ کی موجودگی میں دہلی سے آیا، تو میں نے دو کتابیں، اوپر میز پر، شرف الدین کی بھیجی ہوئی پائی تھیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ یہ آپ کی منگوائی ہوئی ہیں یا کس طرح آئی ہیں۔ شرف الدین کتابیں بھیجتے رہتے ہیں، میں نے خیال کیا انھوں نے بھیج دیا ہوگا۔ اب آپ کے کارڈ سے معلوم ہوا کہ آپ نے منگوائی تھیں۔ بہرحال آپ کو اندیشہ کیوں ہے؟ دونوں کتابیں رجسٹرڈ بھیج رہا ہوں وصول کر لیجیے۔

[ابوالکلام]

(۴۵)

(۳۰)

۳۰ر مئی ۲۶ء

عزیزی! السلام علیکم

عرصہ ہوا ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ اب تک جواب کا انتظار ہے۔ خدا کرے مانع بخیر ہو۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ بذاتِ خود پریس کی تکمیل و اجرا کی سعی کروں۔ چنانچہ اب خدا خدا کر کے کام شروع ہو گیا ہے۔ اُمید ہے ایک ہفتہ کے اندر مشین روم اور مشینیں مکمل ہو جائیں گی۔ ایک ہفتہ اور موٹر وغیرہ میں لگ جائے گا۔ اس کے بعد پریس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ پہلی جولائی سے اخبارات نکالے جا سکتے ہیں۔ کاتبوں وغیرہ

ہوگا۔ میں کم از کم اس طرح کام میں آپ کو لگا دیکھوں جس طرح چاہتا ہوں کہ آپ کام کریں۔ اور آپ کی استعداد صحیح طور پر ملک و قوم کی خدمت کے لئے کام آتے۔ اگر کسی وجہ سے آیندہ آپ کو یہی منظور ہوا، تو آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ زیادہ نہیں تو اس سال کے آخر تک یہ ارادہ موقوف رکھو۔

مجھے اُمید ہے کہ اتنے عرصے تک محبّت و اعتماد نے آپ کو مجھ سے قریب رکھا، آپ میرے اس حق سے انکار نہیں کریں گے کہ آپ سے بزور کہوں کہ علٰحدہ نہ ہوں اور اس ارادے سے باز آجائیں۔ جتنے دن طبیعت چاہے وطن میں رہو۔ پہلی جولائی تک میرے پاس چلے آؤ۔ پریس شروع ہوا یا نہ ہو، پچھتّر روپیہ جولائی سے آپ کے مصارف کے لئے مہیّا ہوتے رہیں گے۔ کام کی تعداد یا وقت وغیرہ کا آپ نے ذکر کیا تھا اس بارے میں کوئی مطالبہ نہیں، جس طرح جی میں آئے کرو۔ سرِدست لکھنے پڑھنے کے متعدد کام موجود ہیں۔

لیکن اگر وہ اخبار نکل گیا، جس کا اب قطعی ارادہ ہے اور مجبوراً اس کی ذمہ داری مجھے قبول کرلینی پڑی، تو پھر انشاء اللہ دوسری ہی صورت پیش آجائے گی اور پچھتّر کی جگہ زیادہ سے زیادہ جو رقم ہو سکے گی، آپ کے لئے ہو جائے گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ جوں ہی طبیعت چُست چاق ہو جائے، آپ آجائیں۔ اس اثنا میں جتنی رقم مطلوب ہو، لکھ دیجئے، میں اس کا فوراً انتظام کر دوں گا۔

افسوس بدرالدین کی طبیعت درست نہیں ہوئی۔ بخار روز آتا ہے اور خنازیر کا مادہ موجود ہے۔ بعض لوگوں سے اِدھر مشورہ کیا، تو معلوم ہوا کہ لکھنؤ میڈیکل کالج ہاسپٹل میں اس کا کوئی اکسپرٹ موجود ہے یا خصوصیت کے ساتھ علاج کا انتظام ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو مناسب ہے کہ لکھنؤ بھیج دیا جائے۔ میں نے تحقیق کے لئے خط لکھوایا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حکیم اجمل خان صاحب کا یونانی علاج

پھر کیا کوشش عمل میں آسکتی ہے، اگر عین اس زمانے میں جب کہ اخبار کا دوسرا تیسرا نمبر نکل رہا ہو اور کوشش کی جارہی ہو کہ راہ پر آئے، کام کرنے والے سفر کی حالت میں ہوں؟

باقی رہا آپ کا مکان جانا یا رانچی جانا، تو اس میں دو[۲] باتیں سمجھ لینی چاہیئے۔

۱۔ کام کی ابتدا سعی و محنت چاہتی ہے۔ جب کام راہ پر آجاتا ہے تو پھر اس کی حالت بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ میں نے جو لکھا تھا، وہ اس تعجب کا نتیجہ تھا کہ ابھی تیسرا نمبر بھی نہیں نکلا ہے، اور ایک نمبر کو بھی وقت پر نکالنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی ہے، اور آپ کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کام کے انضباط کے بعد نقل و حرکت تو نہ اس میں کام مانع ہوگا اور نہ میں کسی حال میں مانع ہوسکتا ہوں۔ آپ ابھی چند دن ہوتے رانچی تشریف لے گئے۔ میں نے ایک لفظ بھی اعتراض کا کہا؟ آخر وہاں جا بھی رہے ہیں تو بدر الدین کے خیال سے۔

۲۔ البتہ جب کبھی ایک شخص کسی دوسری جگہ رہ کر مشغولیت اختیار کرے گا تو لازمی طور پر مکان سے دوری ہوگی اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے اندر ایاب و ذہاب نہ کرسکے گا۔ لوگوں نے اس بارے میں کوئی نہ کوئی طریق عمل اختیار کرلیا ہے اور وہ ناگزیر ہے۔

[ابوالکلام]

(۴۷)

(۳۲)

[درج ذیل رقعہ کا مضمون پچھلے رقعہ میں گزر چکا ہے اور اس پر نوٹ لکھا جاچکا ہے۔ آخری دو پیراگرافوں کا تعلق مولانا ملیح آبادی کی اس شکایت سے ہے جو اُنھوں نے رہائش کے بارے میں کی تھی فرماتے ہیں۔

کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنا تھا۔ جہاں تک جلد ممکن ہو پچھلے خط کا جواب دیں اور بتلائیں کب تک وہاں قیام کا قصد ہے؟

افسوس ہے غریب بدرالدین کی صحت کا اب تک وہی حال ہے۔ لکھنؤ سے اب تک جواب نہیں آیا۔ کل پھر بعض احباب کو خط لکھا ہے۔ اگر معلوم ہو کہ کنگ جارجز ہاسپٹل میں خنازیر کا اکسپرٹ ڈاکٹر ہے، تو ارادہ ہے لکھنؤ بھیج دوں۔

اپنے والد اور بھائیوں کو سلام اور دُعائے خیر پہنچا دیں۔

[ابوالکلام]

(۴۶)

(۳۱)

[مولانا ملیح آبادی نے رانچی جانے کا خیال ظاہر کیا تھا، جہاں مولانا آزادؒ کے سالے بدرالدین بیماری کی وجہ سے تبدیل آب و ہوا کے لئے گئے ہوئے تھے، چونکہ مولانا ملیح آبادی کو بدرالدین سے دِلی لگاؤ تھا، اس لئے اس جانے کے لئے بے چین تھے، دوسری طرف الہلال کے اجراء کو تھوڑے دن ہوئے تھے، پہلا پرچہ ۱۰ر جون کو شائع ہوا تھا۔ . . . کام کی ابتداء اور سعی و محنت کی طالب تھی، مولانا آزادؒ ابھی ان کا کہیں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ یہی بات مولاناؒ کے پورے رقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔]

[۲ر جولائی ۲۷ء]

میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ تاخیر کے بے شمار اسباب جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اب انھیں دُور کرنا چاہیئے یا قائم رکھنا چاہیئے؟ اگر دُور کرنا چاہیئے تو یقیناً ضروری ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ وقت پر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے، تاکہ نظم قائم ہو جائے۔

چاہئیں۔

پس ذمہ دار کام کے آپ ہیں۔ کم از کم میں اب تک ایسا ہی خیال کرتا رہا ہوں۔ اگر آپ اس صورت حال پر مطمئن ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس حالت میں آپ کو لکھنو، یا ملیح آباد، یا رانچی یا کہیں بھی ایک دن کے لئے یا دو کے لئے یا پانچ کے لئے چلا جانا چاہیئے۔ اور آپ اِس نقل و حرکت کے ساتھ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے تو مجھے اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں، آپ شوق سے جا سکتے ہیں۔ میری طرف سے کوئی روک نہیں۔

اور یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ "یہاں مجھے تکلیف ہے۔ معمولی معمولی باتوں کی تکلیف ہے، بار بار کہتے کہتے رُک جاتا ہوں" تو یہ میرے لئے نہایت ہی عجیب بات ہے، اس وقت تک میرے علم میں نہیں آئی۔ میرے علم میں آپ کی جو تکلیفیں آئیں، میں انھیں دُور کرنا اپنا فرض سمجھوں گا۔ بشرطیکہ میرے علم میں آئیں۔ لیکن اگر آپ مجھے نہ کہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

باقی رہی یہ بات کہ آپ کو آرام کس حالت میں ہے؟ تو جس حالت میں ہو، اس کے سروسامان کا اِنتظام کیجیے۔ جنوری میں آپ نے کہا تھا کہ آپ یہاں نہیں رہیں گے۔ پھر جب میں نے کہا کہ اچھا اس کا اِنتظام کیا جائے، تو خود آپ نے کہا کہ ضرورت نہیں۔ اب اگر آپ چاہتے ہیں تو اِس کا انتظام کیا جائے۔ یقیناً زندگی کے لئے پہلی چیز قیام کا قابلِ اطمینان انتظام ہے۔ آپ کسی وقت بہ تفصیل مجھ سے گفتگو کر لیں، تاکہ جو صُورت پسندیدہ ہو، اختیار کیا جائے۔

[ابوالکلام]

"مولانا لکھ تو دیتے تھے کہ قیام کا دوسری جگہ بند وبست ہوجانے گر جائے
پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ میں پھر رُک جاتا تھا۔ کبھی کہتے' انتظام کی صورت
میں مصارف زیادہ ہوں گے اور بجٹ میں ابھی گنجائش نہیں۔ کبھی فرماتے،
علٰحدگی کا تصوّر بھی بے وفائی ہے اور آپ کو بے وفا نہیں ہونا چاہیئے
خود میرے دل کی بھی یہی حالت تھی کہ ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا ؎
روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم ان سے ولے ‏ مُڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے!

[۳؍جولائی ۲۷ء]

میں نے کل آپ کے خط کی پُشت پر لکھ دیا تھا۔ غالباً یہیں رہ گیا، پھر لکھتا ہوں۔
اس معاملہ میں میرے لئے مشکل ہے کہ میں کچھ کر سکوں۔ جنوری' فروری' مارچ'
اپریل' مئی کے نقصانات کے بعد اب کہیں پرچہ نکل سکا ہے اس کا یہ تیسرا نمبر ہے جو نکلے گا۔
کام کی ترتیب کا یہ حال ہے کہ اب تک ایک نمبر بھی وقت پر نہیں نکل سکا، جو نمبر اس
وقت زیر ترتیب ہے' اسے جمعہ کے دن نکلنا تھا اب وہ دوسرے جُمعہ تک بمشکل نکل
سکے گا، صرف یہ صُورت اب سمجھ میں آتی ہے کہ اسے ڈبل کرنے کی ذلّت گوارا کرلی جائے
اور کوشش کی جائے کہ آئندہ نمبر وقت پر نکلے۔ اس صُورت کی تعمیل صرف اس صُورت
میں ممکن ہے کہ جوں ہی کاتب خالی ہو' اسے فوراً دوسرے پرچے کے مضامین مل جائیں۔
ایک مرتبہ اگر کسی نہ کسی طرح سات دن کے اندر معاملہ آجاتے، تو پھر آئندہ چکّر قائم رہتا۔
آج اتوار ہے اور ڈاک آئے گی۔ اس سے مضامین اخذ کر کے فوراً تیار کر لئے جائیں۔
اور نیز جو چیزیں آئندہ نمبر کے لئے سوچی تھیں، تیار ہوجاتیں، تو ممکن تھا کہ آئندہ
نمبر سے وقت کی ترتیب قائم ہوجاتی۔

اس کے علاوہ یہ پرچہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ کم ازکم دو فارموں کی کاپیاں اور پروف
باقی ہیں۔ کاتب کا ہاتھ اگر کل شام کو خالی ہوجاتے، تو پرسوں سے اس کو مضامین دینے

پیدا کی جاتے۔ آپ کی یہ رائے کس درجہ تمسخر انگیز ہے جب کہ :

۱۔ کسی حسابی فرد میں کسی متعیّن دن ضروری رقوم کے اندراج کو ذلت وعزت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر ایک جگہ ایک بھنگی دس روپیہ لیتا ہو، اور میں ایک ہزار اپنی ضروریات کے لئے لیتا ہوں، تو یقیناً ایک کاغذ پر دونوں کا اندراج ہو سکتا ہے۔ اور آپ کی عقل کے سوا دنیا کی کوئی عقل اسے "کمپوزیٹروں کی صف" سے تعبیر نہیں کرے گی۔ گزشتہ ماہ سے منشی ابن حسن وہ دونوں رقمیں اسی میں درج کر کے بھجواتے ہیں، جو میں اپنی بہنوں کو بھیجتا ہوں۔ کیا اس سے وہ کمپوزیٹروں کی صف میں آگئیں؟ مکان کے کرایہ کی رقم کا اس میں اندراج ہوتا ہے، کیا اس سے مکان والا "کمپوزیٹروں کی صف" میں آگیا؟

۲۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ آپ نے اپنے جوشِ جستجوئے حیل میں پوری بات بھی نہیں سُنی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے وقت پر یہ معاملات یاد نہیں رہتے۔ پچھلی مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ کو روپیہ ایک دو دن کی تاخیر سے ملا اور آپ نے کہا کہ اس کی وجہ سے آپ کو دقت پیش آئی۔ اس مرتبہ بھی دیکھئے! آج ۱۲ ہے اور اگر آج آپ مجھ سے نہ کہتے تو مجھے بالکل خیال نہ تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے سنیچر کے دن منشی ابن الحسن صاحب سے (جب کہ وہ پیشگی رقوم محرّم کے خیال سے دلا رہے تھے) احتیاطاً یہ کہا کہ پرسوں جب تنخواہوں کا شیٹ آپ بنائیں، تو اس میں ایک خانہ میرے گھر کے مصارف کا بھی رکھ دیں اور اس میں ڈھائی سو روپیہ درج کر دیں۔ میں نے خیال کیا تھا کہ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو رجسٹر مصارف میں خودبخود پورے مصارف کا اندراج ہو جائے گا، دوسرے اسی وقت یہ رقوم دے دی جائیں گی۔ ان میں سو روپیہ آپ کو دینا تھا، ڈیڑھ سو باہر بھیجنے تھے۔ میں نے یہ کارروائی اس خیال سے کی تھی کہ بہتر ہو گی چنانچہ یہی بات آپ سے کہی جب آپ نے روپیہ کا ذکر کیا لیکن آپ نے اس کا

(۴۸)

(۳۳)

[الہلال (دورِ ثانی) جاری ہوگیا تو مولانا آزادؒ نے آمد و خرچ کے حسابات کی جانب توجہ دی۔ اخراجات کا رجسٹر بنوایا گیا اور اس میں خانگی اخراجات کے لئے رقم سے لے کر عملہ الہلال کی تنخواہوں اور مولانا آزادؒ کی بہنوں کو بھیجی جانے والی رقوم تک کا اندراج کیا گیا۔ اس میں مولانا ملیح آبادی کا نام بھی تھا، جب ان کے پاس تنخواہ کی وصولیابی کے دستخط کے لئے رجسٹر گیا تو ان کے دِل کو سخت دھکا لگا، دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور مولانا آزادؒ کو لکھا "میں تو اس وہم میں مبتلا تھا کہ آپ کے عزیزوں کی طرح رہتا ہوں، اس لئے مالی معاملات کی کبھی پرواہ نہ ہوئی لیکن آج رجسٹر نے بتایا کہ میں بھی ایک "نوکر" ہوں۔ اب مجھے طے کرنا ہے کہ نوکری کروں یا نہ کروں؟ اور کروں تو کتنی تنخواہ طلب کروں؟" اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا "یہاں میری گزر نہیں ہو سکتی" علیٰحدگی کے لئے ۱۵ دن کا نوٹس بھی دے دیا۔ مولاناؒ نے جواب میں مفصّل خط تحریر فرمایا لیکن جب شام کی چائے پر دونوں جمع ہوئے تو سارے گلے شکوے دُور ہو گئے۔ ع

جب گلے سے مل گئے سارے گِلے جاتے رہے

[۱۲؍ جولائی ۱۹۲۷ء]

عزیزی !

اگر آپ کا مقصود یہ ہے کہ آپ رہنا نہیں چاہتے، تو آپ کو وہی کرنا چاہیئے، جس پر آپ کی طبیعت مطمئن ہو، اور میں پسند نہیں کروں گا کہ آپ ایک دن بھی ناگواری خاطر کے ساتھ رہیں۔ لیکن یہ طریقہ تو کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے کہ ایک غلط اور بے اصل وجہ

(۴۹)

(۳۴)

[بدرالدین کو دیکھنے، رانچی جانے کے لئے مولانا ملیح آبادی نے پھر پرچہ لکھا، حالانکہ چند دنوں میں حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگئی تھی؛ مولانا آزادؔ کا خیال تھا کہ پچھلے خط کے بعد اُنھوں نے ملیح آباد یا رانچی جانے کا ارادہ فسخ کردیا ہوگا، لیکن جب پھر پرچہ پہنچا اور سفر کی اجازت چاہی تو مولاناؒ نے درج ذیل پرچہ لکھا، جس کے ایک ایک لفظ سے ناگواری ظاہر ہورہی ہے۔]

چونکہ آپ کی طبیعت جانے پر مائل ہے، اِس لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ طبیعت پر جبر کرکے رُکیں۔ بہتر ہے آپ آج رات چلے جائیں اور رانچی ہو آئیں۔ کوئی بات میرے کہنے سے بجبر نہ کیجئے۔

[ابوالکلام]

(۵۰)

(۳۵)

[مولانا ملیح آبادی قیامِ لکھنو کے زمانہ (سنہ ۱۹۲۰ء) میں ایک رسالہ ایڈٹ کرچکے تھے، پھر سنہ ۱۹۲۱ء میں پیغام کو ایڈٹ کیا، اس کے بعد سنہ ۲۳-۲۴ء میں الجامعہ (عربی) کو ایڈٹ کیا، اور پھر "پیام" بھی آپ ہی کی ادارت میں نکلا۔ آخرالذکر تینوں پرچے مولانا آزادؒ کی نگرانی میں تھے۔ لیکن مولانا آزادؒ کے سامنے جو صحافتی معیار تھا، اِس کے لئے مولانا ملیح آبادی اب بھی پوری طرح تیار نہ ہوسکے تھے، اس لئے ان کو نہ صرف پرچے کے نظم و ترتیب کے بارے میں ہدایات دیتے رہتے تھے بلکہ کتابت، کمپوزنگ اور الفاظ کے املا کے بارے میں بھی ہدایات دیتے رہتے تھے۔ جیساکہ مولاناؒ کے اس رقعہ سے

یہ مطلب قرار دیا۔ یہ آپ کی طبیعت اور دل کی خوبی ہے اور میری بدقسمتی۔

بہرحال اب آپ اتنی تکلیف اور کیجئے کہ اس کے ساتھ جو کاغذ بھیجتا ہوں، وہ منشی ابن الحسن صاحب کو بھیج کر ان سے کاغذ منگوا لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ اس "صف" میں آپ کا نام ہے یا نہیں؟۔

آپ نے میرے دلی جذبات کے ساتھ، جو آپ کے لئے رکھتا ہوں، بہت ہی سخت ناانصافی کی ہے۔ بہرحال اللہ تعالےٰ آپ کے لئے وہی کرے، جس میں آپ کی بہتری ہو۔

میرا آپ کا تعلق کاروباری نہ تھا، جس کے لئے پندرہ دن یا ایک ماہ کے نوٹس کا سوال ہو، دل کی محبّت کا تھا، اس کی تبدیلی کی صورت میں اپنے اوپر جبر کر کے کام کرنا کسی طرح بھی بہتر نہ ہوگا۔

میں آپ کے دل کی یہ حالت (جس کا اس وقت اچانک انکشاف ہوا) پوری طرح محسوس نہیں کر سکا تھا، لیکن یہ محسوس کر چکا تھا کہ آپ جم کر کسی ایک شغل میں نہیں رہ سکیں گے، اور کام کے متعلّق جو ارادے ظاہر کئے جا رہے ہیں، وہ سب چند دنوں کے اشتغال کے بعد رہ جائیں گے۔ بایں ہمہ آپ کی اس گفتگو سے جو آپ نے ڈسمبر میں کی تھی، میں نے اثر قبول کرنے سے انکار نہیں کیا۔ اس میں پیغام کا حصہ ہو چکا، الہلال کا باقی تھا، اب وہ بھی ہو چکا۔

خیر ان باتوں کا تذکرہ بے سود ہے۔ میں ہر حال میں آپ کی بہتری چاہوں گا اور جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔

ابوالکلام

تو یہ بات دُور ہو جائے گی۔ مثلاً "ہوا" اور "ہوگیا" "کہا" اور "کہہ دیا" کا فرق تو واضح ہے لیکن بول چال اور کتابت میں کس جگہ کیا ہونا چاہیئے، یہ ذوق پر موقوف ہے۔ اور تھوڑی سی توجہ سے ایک قاعدہ کی طرح قلم جاری ہو سکتا ہے۔

ہاں! مصری، یورپین الفاظ کی تعریب کرتے ہوتے عموماً "واو" کی آواز "ف" سے نکالتے ہیں، مثلاً "ہارورڈ" کی جگہ "ہارفرڈ" "پنسلونیا" کی جگہ "پنسلفانیا"۔ اس لئے نقل اسماء میں احتیاط کے ساتھ اصلیت معلوم کرنی چاہیئے۔

آئندہ نمبر کی ترتیب حسب ذیل ہوگی:

۱۔ دوسرے صفحے سے "مقالات"[1] شروع ہوگا۔ لیلی مجنون کا بقیہ حصہ نمبر ۲ کے عنوان سے درج ہوگا۔ یہ غالباً پانچ کالم سے زیادہ نہ ہو۔ ممکن ہے اس پر پہلا فارم ختم ہو جاتے۔

۲۔ "آثارِ عتیقہ"[2] میں منارۂ اسکندریہ کمپوز شدہ ہے، اس میں صرف عرب مورخین کی تصریحات بڑھانی ہیں۔ لیکن اگر اس کے دونوں فوٹو بن کر آگئے تو پھر اس نمبر میں اتنا ہی دے دینا کافی ہوگا۔

۳۔ اس کے بعد ایک نئی سُرخی "مشرق کی تاریخ جدید کی تاریخی شخصیتیں" شروع کی جاتے۔ اس میں جمال الدین کا تذکرہ ہوگا۔ لیکن اس مرتبہ بہت ہی مختصر تبصرہ کرنا ہے۔ کیونکہ سات آٹھ مختلف قسم کے فوٹو طیار ہیں۔ اس کے دو مُصوّر صفحے مرتب ہوں گے۔ مضمون میں لکھ دوں گا۔

۴۔ اس کے بعد باب التفسیر ہوگا۔

۵۔ اس کے بعد برید فرنگ، جس کے مضامین کچھ دیتے ہیں، کچھ بھیجتا ہوں۔

---

[1] "مقالات" الہلال کا ایک مستقل عنوان تھا۔ [2] الہلال کا ایک مستقل عنوان۔

ظاہر ہوتا ہے۔]

[۱۹ر اگست یا اس سے ایک دو روز بعد، ۱۹۲۷ء]

عزیزی!

ترجمہ وکتابت میں چند امور کا لحاظ رکھنا چاہیے:

۱۔ بلاضرورت انگریزی اسماء و مصطلحات استعمال نہ کیجیے۔ مثلاً رپورٹ، کانفرنس، پارلیمنٹ، ایڈیٹر وغیرہ، ان کے لیے روداد، بیان، موتمر، مجلس، یا مجلسی حکومت وغیرہ الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ مسودہ لکھتے وقت رسم الخط کا خیال رکھیے تاکہ کاتب اور کمپوزیٹروں پر بھی زور چل سکے۔ پہلے "الہلال" کا رسم الخط مقرر تھا، اب نہیں ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں مثلاً حتی الامکان ہر مرکب لفظ مستقلاً لکھنا چاہیے یعنی "سمجھکر" کی جگہ "سمجھ کر" "پہنچکر" کی جگہ "پہنچ کر" وغیر ذلک۔ ہائے مخلوط وغیر مخلوط میں فرق کیجیے۔ "کھانا" "انھیں" وغیرہ کو دو چشمی سے مگر "نہیں" "کہیں" کو دو چشمی سے نہ لکھا جائے۔

علامات قرأت کا بھی نظر ثانی میں خیال رکھیے اب فل اسٹاپ کی جگہ "۔" کی علامت اختیار کرلی گئی ہے۔ پس وقف کامل کی جگہ خط نہیں ہونا چاہیے۔ ڈیش (چھوٹا) دینا چاہیے۔

اگر تین الفاظ مسلسل آجائیں اور دو میں کاما اور تیسرے میں عطف ہو جیسے ہندوستان، مصر اور سوڈان، تو اس صورت میں آخری عطف کے ساتھ بھی کاما ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ اسلوب تحریر و انسجام الفاظ کا معاملہ ہے، جس کے لیے آپ کی تحریر میں کوئی ایک سطح قائم نہیں ہوئی ہے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں گے،

چھپوالیں۔

۶۔ آپ (مولوی عبدالرزاق صاحب) دو نمبروں کے لئے مواد طیار کریں، مذاکرہ علمیہ، مکمل ترجمہ علم الاجتماع، ترجمہ تقریر مصطفےٰ فاضل، مصر، ٹرکی وغیرہ کی چٹھیاں، ادبیات میں افسانہ یا کوئی اور چیز، احادیث کا ایک مختصر مجموعہ، جس میں صرف اخلاق، حکمت و موعظت کی احادیث ہوں، مثلاً اتفاق اجتماعی، اطاعت امیر، مکارم اخلاق، عفو و درگزر، تسامح، تحمل مصائب، مصابرہ، عزم، ثباتِ ایمان و عقائد، امر بالمعروف وغیرہ۔ یہ اس طرح لکھی جائیں کہ پہلے اصل احادیث مع تخریج، پھر ترجمہ، پھر پانچ پانچ سطروں کی جگہ سادی۔

[ابوالکلام]

(۵۲)

(۳۷)

[۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو الہلال (دورِ ثانی) کا آخری نمبر شائع ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا ملیح آبادی بھی مولاناؒ سے جدا ہو گئے، اور اپنے ایک عرب دوست سید محمد عمری کی کوٹھی پر رہنے لگے۔ اس زمانے میں آپ کا مشغلہ مصر کے اخبارات المقطم، الاھرام اور البلاغ کی نامہ نگاری تھا۔ نہرو رپورٹ شائع ہوئی تو بعض مسلم اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن مولانا آزادؒ کا خیال تھا کہ اس کو یک قلم منسوخ کر دینا مناسب نہیں، بعض ترمیمات کے بعد قبول کر لینا چاہیئے۔ اسی سلسلے میں حضرت مولاناؒ نے، ملیح آبادی کو بلایا اور نہرو رپورٹ کے متعلق گفتگو فرمائی اور جب انھیں بھی ہم خیال پایا تو رپورٹ کی حمایت میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کرنے کی ہدایت فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ یہ

۶۔ اس کے بعد بصائر و حکم، برید مشرق ضروری ہیں، اور اس کے علاوہ تاریخی وادبی مضامین درج کئے جاسکتے ہیں، جو زبانی دریافت کر لیجئے گا۔

میں چاہتا ہوں اب بتدریج آپ پرچہ خود مرتب کرنے لگیں، یعنی میرا تعلق آپ سے ہو، آپ کا پرچے سے۔ ترتیب، تصحیح، تصاویر کا انتخاب، ان کی نشست وغیرہ میں ٹھیک کرکے آپ کو بتلا رہوں۔

[ابوالکلام]

(۵۱)

(۳۶)

یاد داشت

[اگست ۲۷ء][1]

۱۔ علم الاجتماع کا جس قدر ترجمہ ہو جائے، کمپوزیٹروں کو دے دیا جائے اور صفحات بنا دیئے جائیں۔

۲۔ منشی عباس علی سے کہا جائے کہ اس پرچے کے اختتام کے بعد (جو کل پرسوں نکل رہا ہے) پہلے "جامع الشواہد" کی بقیہ کاپیاں از سرِ نو لکھیں اور تصحیح کے بعد چھپوائی جائیں۔

۳۔ اس کے بعد الہلال کے صفحات، اشتہارات دو دو تین مرتبہ کے لئے لکھ لیں۔

۴۔ پھر الہلال کے لئے "سیاحت فی الارض" تعاویر زغلول (بہ عنوان ادبیات) اور عہد عباسیہ لکھیں۔

۵۔ مشین ٹائپ پر دو تین ہفتے کے لئے ٹائٹل پیج کے دونوں رُخ بہ تبدیلی نمبر

---

[1] اس یادداشت کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکا لیکن چونکہ سعد پاشا زغلول اور تاریخ عہد عباسیہ کا ایک صفحہ ۴ ستمبر کے پرچہ میں شائع ہوا تھا اس لئے میرا خیال ہے کہ ۱۹ اگست کے بعد یہ یادداشت لکھی گئی ہوگی۔

دہلی

۱۸ر اکتوبر ۱۹۲۸ء

عزیزی! ایک مضمون اس غرض سے بھیج چکا ہوں کہ آپ اپنے دستخط سے اخبارات میں بھیج دیں۔ امید ہے کہ آپ بھیج چکے ہوں گے۔ آج میں نے آپ کا مضمون زمیندار میں دیکھا، مضمون بہت اچھا ہے اور ان مسائل پر بحث کرنے کا یہ عنوان و اسلوب بالکل صحیح اور موثر ہے۔ اس عنوان و اسلوب سے جاری رکھیے۔

البتہ ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، نہرو رپورٹ کی حمایت کرتے ہوئے کوئی بات ایسی نہیں لکھنی چاہیئے کہ لوگوں کو مبالغے کا گمان ہو، رپورٹ اور کانفرنس نے مسلمانوں کے حقوق کے لئے جو اصول و مبادیات قرار دے دیتے ہیں؛ صحیح ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو آزادانہ جدوجہد اور سیاسی و اجتماعی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی، بلاشبہ اکثریت چاہے تو اس سے بھی زیادہ امتیازات دے سکتی ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ کوئی جماعت امتیازات بخشنے کو طیار نہیں ہوسکتی اور ہندوستان جیسے ملک میں معیار یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک جماعت نے دوسری جماعت کو کوئی خاص امتیاز دیا یا نہیں، بلکہ یہی ہوسکتا ہے کہ کسی جماعت کی آزادانہ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں رکھی گئی ہیں یا نہیں؟

بس یہ جو آپ نے ایک دو جگہ لکھا ہے کہ نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کو جس قدر دیا گیا ہے، اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے" یا "کیا مخالفانہ شور و شغب اس لئے ہے کہ ہندوؤں کو دبا کر کچھ اور لے لیا جائے" اس میں نہرو رپورٹ کے اس پہلو کا جس درجہ اعتراف پایا جاتا ہے، اسے کسی قدر معتدل کر دینا چاہیئے، اور ہمیشہ یہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ کافی اور تسلی بخش ہے، نہ یہ کہ بہت زیادہ ہے۔

علاوہ بریں یہ بات بھی واضح کر دیجئے کہ نہرو رپورٹ میں ابھی جزئی ترمیم و

تحریک چونکہ کانگریس کے موقتہ مقاصد کے لئے ہوگی، اس لئے کانگریس کی طرف سے اس کی اُجرت بھی دی جائے گی مولانا ملیح آبادی نے اس معاملت کو پسند نہیں کیا تو مولانا رحؒ نے ان کو بتایا کہ ہر سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں اور انجمنوں میں ایک مخصوص فنڈ ہوتا ہے جس سے جماعت اور اس کے مقاصد کی نشر و اشاعت ہوتی ہے۔ اس کے لئے جماعت ایک شعبہ قائم کرتی ہے، اس کا اسٹاف مقرر کیا جاتا ہے اور اس پر اخراجات ہوتے ہیں۔ کسی جماعت یا انجمن کے شعبۂ نشر و اشاعت سے منسلک ہونا اور تنخواہ پانا نہ اخلاقی طور پر معیوب ہے نہ قانونی طور پر جرم ہے۔ پس اگر کوئی شخص اس وابستگی اور تعلق کے بغیر کسی جماعت کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے کام کرتا ہے اس میں اپنا وقت صرف کرتا ہے، محنت کرتا ہے تو اس کا کوئی معاوضہ بصورت رقم لینا کیونکر ناپسندیدہ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ کانگریس کے ان مقاصد سے متفق ہیں تو آپ کو اس کا معاوضہ قبول کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیئے۔ بالآخر مولانا ملیح آبادی قائل ہوگئے اور ایک سلسلۂ مضامین شروع کر دیا۔ مولانا نے اسی سلسلے کے کسی مضمون کے انداز بیان کی جانب اشارہ کیا ہے، اور آیندہ محتاط انداز بیان اختیار کرنے کی ہدایت کی ہے اس کے بعد والے مکتوب میں بھی شخصاً حیثیت کسی کی برائی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مولاناؒ کے یہ دونوں مکتوب تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سے نہرو رپورٹ کے بارے میں مولانا رحؒ کی صحیح رائے معلوم ہوتی ہے اور سیاسی معاملات میں اختلاف کے حدود بھی متعین ہوجاتے ہیں۔ اس مکتوب کی ابتدائی سطروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں مولاناؒ نے خود بھی کچھ مضامین لکھے تھے اور مولانا ملیح آبادی کے نام سے شائع کرائے تھے۔]

جائیں تو اسے بھجوا لیں، یا معین[1] کو دے دیں، وہ روپیہ لادے گا۔

یہاں بعض اشخاص نے مجھ سے کہا ہے کہ آپ نے کسی مضمون میں شوکت علی صاحب کو بہت برا بھلا لکھا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی کوئی تحریر اس قسم کی نہ نکلی ہوگی۔ بہرحال اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ شخصاً کسی شخص کی برائی نہ کی جائے۔ اور جو کچھ لکھا جائے اعتدال سے باہر نہ ہو۔

سلسلہ بلا انقطاع جاری رکھیئے۔

میں نے آپ کے آئندہ کاموں کی نسبت ایک اور تجویز سوچی ہے۔ غالباً نومبر کے آخر تک آپ لکھنؤ سے واپس آجائیں گے، اس وقت زبانی کہوں گا۔ اگر آپ ۱۱ر نومبر تک لکھنؤ پہنچ جائیں تو ۱۲ر کو لکھنؤ میں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے کی وجہ سے وہاں جانا پڑے گا۔ غالباً میں ۱۲ر کو پہنچوں اور ۱۳ر تک ٹھہروں۔ اگر آپ ایک دن کے لئے ملیح آباد سے لکھنؤ آجائیں تو بہت بہتر ہو۔

ابوالکلام

---

[1] معین الدین مرحوم؛ مولانا کی سالی کا لڑکا، بڑا ہونہار اور صالح نوجوان تھا۔ رشیؔد الدین

تغیر کی پوری گنجائش باقی ہے، اور مسائل پر مزید غور و فکر کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے، چنانچہ خود ابوالکلام نے اپنے مضامین میں متعدد امور سے اختلاف کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ کمیٹی کو مزید غور و فکر سے انکار نہیں۔ نیز پروِنشل مسلم لیگ نے بھی اپنی تجویز میں چار باتوں کو مزید غور و فکر کا محتاج ظاہر کیا ہے۔ پس اگر کسی شخص یا جماعت کو اختلاف ہے، تو یہ اختلاف کسی طرح بھی قابل اعتراض نہیں۔ لیکن یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ جزئی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے قتل عام کا شور مچادیا جائے۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان مسائل کی نسبت صحیح رائے قائم نہیں کرسکیں گے، اور غلطیوں کا شکار ہو جائیں گے۔

آپ نے اس دن ایک باورچی کا ذکر کیا تھا کہ وہ آپ کے یہاں آیا ہے، مگر آپ چاہتے ہیں کہیں رکھوادیں۔ اگر وہ چپاتی اور معمولی سالن پکالیتا ہو، تو کیوں نہ اُسے یہاں بھیج دیجئے۔ جو تنخواہ اس سے طے کر لیجئے گا، وہ دے دی جائے گی۔

ابوالکلام

(۵۳)

(۴۸)

دہلی

۴ر نومبر ۲۸ء

عزیزی!

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ مطلوبہ رقم آپ کو نہیں بھیجی گئی ہے۔ جن لوگوں کو بھیجنا تھا، وہ سفر میں ہیں، اور یہاں سے واپس جاکر بھیجیں گے۔ چونکہ آپ نے کہا تھا کہ ۱۰ ر نومبر[1] کو لکھنؤ جانے کا قصد ہے، اس لئے میں نے خیال کیا، آپ کو زرِ نقد کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ کو ~~سنت~~ کا چیک اپنے پاس سے بھیج دیتا ہوں۔ وہاں کی رقم خود وصول کر لوں گا۔ یہ چیک امپیریل بینک کے نام ہے۔ آپ کسی ضرورت سے کلکتہ

[1] یہاں مولانا ۱۰ ستمبر لکھ گئے تھے جو صحیح نہ تھا، میں نے تصحیح کردی ہے۔

بلاشبہ یہ ضروری ہے کہ ابتداء میں وہ مقبول نہ ہوگا اور خسارہ کا تحمّل ہونا پڑے گا، لیکن میں اس کے لئے طیار ہوں۔

جرمنی اور امریکا میں خطِ عربی کا لینوٹائپ اور ٹاتپوگراف مشین بن گئی ہے، یعنی وہ مشین، ...... جس میں بیک وقت حرف ڈھلتا اور مرتب ہو جاتا ہے، اور ہر مرتبہ نیا حرف میسّر آجاتا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا مقصد حروفِ عربیہ، ترکیہ کی اشاعت ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے ڈھالنے کی فونڈری یہاں بنائی جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا، اس کی اشاعت نہیں ہو سکتی۔

یہ ادارہ کسی تجارتی مقصد سے نہیں ہے۔ تجارتی فوائد اس کام میں مل سکتے ہیں، جس کی ملک میں طلب ہو، لیکن یہ تو ایسی چیز ہے، جو یہاں مطلوب ہونے کی جگہ یکسّر غیر مقبول و مطرود ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اتحادِ شعبِ اُمّت اور وحدتِ مُسلمین کے لئے ہندوستان کو بھی حرُوفِ عربیہ و ترکیہ کے سلسلے میں منسلک کر دیا جائے، اگرچہ اس راہ میں کتنا ہی نقصان ہو۔

پس یہ بے جا نہیں اگر میں اخوانِ ترکیہ سے اس میں مساعدۃ کا امیدوار رہوں اور خاص طور پر آپ کو لکھتا ہوں کہ اس بارے میں کوشش کر کے مجھے صُورتِ حال سے مطلع کیجئے۔ اس کام کے لئے ضروری ہے کہ آستانہ کے کارخانہ ہائے حرُوف سازی سے حروف ڈھالنے کے امہات حاصل کئے جائیں اور یہاں ان سے کام لیا جائے۔ میں اس کے لئے بھی طیار ہوں کہ اگر وہاں سے کوئی ماہرِ فن، ہندوستان آکر اس کام کو انجام تک پہنچا دے، تو اس کے معاوضہ و مصارف کا میں متحمّل ہوں۔

پس آپ وہاں مشورہ کیجئے اور بالتفصیل لکھئے کہ اس مقصد میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اس بارے میں وہاں کے ارکانِ حکومت سے استدعا کریں، لیکن بعد کو ہم نے خیال کیا کہ بہتر ہوگا آپ کے ذریعے سے پہلے صُورتِ حال معلوم کریں۔

[ابوالکلام]

(۵۴)

عمر رضا کے نام

[درج ذیل مکتوب کی تاریخ تحریر کا تعین نہیں کر سکا لیکن اغلب خیال ہے کہ یہ خط مولانا ملیح آبادی کے زمانہ قیام کا ہے اس لئے کہ انہی کو مولانا نے یہ خط دیا تھا کہ عربی میں ترجمہ کر کے عمر رضا[1] کو بھیج دیں اور ترجمہ "ثورۃ الہند"[2] کے لئے شکریہ ادا کر دیں۔ مولانا کا خط درج ذیل ہے۔

مولانا کے اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک خط طباعۃ کی وحدت، اور اردو ٹائپ کے مسئلے کو کس درجہ اہمیت حاصل تھی۔]

ایک عرصہ سے میرا خیال ہے کہ تمام عالم اسلامی کے خط طباعۃ کی وحدۃ کے لئے سعی کرنا وقت کی مہمات میں سے ہے۔ کیونکہ مقومات امۃ میں سے ایک اہم ترین چیز زبان اور خط کی بھی وحدۃ ہے۔ ہندوستان میں لغۃ ہندیہ جو عربی و فارسی ترکی کی پیداوار ہے، بہت ترقی کر چکی ہے، لیکن اب تک اس کی طباعۃ خط نستعلیق فارسی میں محدود ہے، اور ٹائپ کی جگہ سنگی مطابع سے کام لیا جاتا ہے۔

میں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" ٹائپ میں نکالا لیکن وہ ٹائپ یہیں کا طیار کردہ تھا۔ اور اس لئے خطِ نسخ عربی کی جگہ خط فارسی کا تھا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ترکی کی طرح ہندوستانی کے لئے بھی ترکی کا عربی ٹائپ رائج کیا جاتے۔ اور وسیع پیمانے پر ایک مطبعہ قائم کیا جائے

---

[1] ترکی کی ایک مشہور علمی شخصیت۔ مولانا ملیح آبادی کے دوست تھے اور قسطنطنیہ سے انور پاشا مرحوم کی نگرانی میں شائع ہونے والے اخبار جہانِ اسلام کے عربی و فارسی حصے کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اردو حصہ کچھ دنوں تک مولانا ملیح آبادی ایڈٹ کرتے رہے تھے۔ [2] مولانا ملیح آبادی نے قول فیصل (کلکتہ کی عدالت میں مولانا آزاد کا بیان ۱۹۲۲ء) کا ترجمہ عربی میں کیا تھا اور ثورۃ الہند کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ عمر رضا نے اس کو ترکی زبان میں منتقل کر کے شائع کیا تھا۔

۲: شہاب ثاقب" کے "رجوماً للشیاطین" ہونے کی نسبت دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں۔

اولاً۔ کائناتِ ہستی کے جس قدر حوادث و اعمال ہیں، اس کے علل و مقاصد کے بارے میں ہماری معلومات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں، یعنی اس حد سے جو ہمارے حواس کے تفحص و تعلق کی آخری حد ہے۔ اس حد سے آگے جو کچھ ہے، وہ ہمارے لئے غیر معلوم و مجہول ہے، اور جو غیر معلوم و مجہول ہے، اس کے لئے ہماری حیثیت یہی ہو سکتی ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ منع و نفی کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ امید کرتا ہوں بات آپ پر واضح ہو گئی ہوگی۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک خاص حد تک ہماری نظر و ادراک کے لئے روشن ہے، اس کے بعد تاریکی ہے۔ جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے ہماری سیرِ نظری کے قدم رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے؟ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اور اس لئے ہماری حیثیت صرف یہ ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ کسی بات کے لئے نہ تو مثبت ہو سکتے ہیں نہ مانع و منکر۔ قدیم و جدید عہد کے تمام اکابرِ علم و نظر نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ علم و بیان کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک انسان وحیِ الٰہی کے ساتھ آتا ہے اور کہتا ہے جس حد کے بعد سے تمہارے لئے تاریکی ہے، میرے لئے روشنی ہے۔ جس کے بعد سے تمہارے لئے عدم علم ہے، میرے لئے بصیرت و برہان ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارا سرمایۂ یقین ختم ہو جاتا ہے، میری یقینیات شروع ہوتی ہیں۔ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰي بَصِيْرَةٍ، اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔[1] پس ایسی حالت میں ہمارے لئے علم و راستی کی

---

[1] اے پیغمبر! تم کہہ دو، میری راہ تو یہ ہے۔ میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں (اور اسی راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے، وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں (۱۲-۱۰۸)

(۵۵)

جناب مولوی ضیاء اللہ خانصاحب رامپوری کے نام

[مکتوب الیہ نے حضرت مولانا سے بعض سماوی قسم کے سوالات کئے تھے، جن کی نوعیت جوابات سے ظاہر ہے۔ مولانا نے جواب میں جو کچھ فرمایا وہ مولانا ہی کے بقول "مختصر لفظوں میں جو کچھ کہا گیا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔" بلاشبہ یہ مکتوب مولانا کے چند اہم مکاتیب میں سے ایک ہے۔ مکتوب کی ابتدائی سطروں کا تعلق اس سوال سے ہے کہ "عربی سیکھنے کے لئے ابتدائی کتابیں کون سی مناسب ہوں گی؟"

۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ
۲ر اگست سنہ ۱۹۲۰ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا۔ جن تعلیمی رسائل کے متعلق دہلی میں ذکر کیا تھا۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

القراۃ الرشیدۃ۔ جزء اول سے جزء چہارم تک ۔ مطبوعہ قاہرہ۔

فوائد الانشاء۔ اول و ثانی۔

ھدایۃ الطالب الی قواعد العربیۃ۔ اول و ثانی۔

مبادیات کے لئے یہ سلسلہ مفید ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں یہ رسائل بھیج دوں۔ اگر میں بھیج سکتا تو تحفۃً بھیج دیتا۔ لیکن میرے کتب خانہ میں اس کا ایک ایک نسخہ ہے۔ ایک سے زیادہ نسخے نہیں ہیں۔ آپ مولوی شرف الدین تاجرانِ کتب عربیہ، بھنڈی بازار کو لکھیے، وہ آپ کو بھیج دیں گے۔ میں بھی کتابیں آج کل انھیں کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

اور تمام تغیرات و حوادث عالم کی طرح اس حادثے میں بھی ماورائے نظر علم، افعال و خواص معنویہ، پوشیدہ ہیں یا نہیں؟ پھر اگر وحی الٰہی نے اس بارے میں کچھ بتلایا ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ اسے تسلیم کریں۔ کیونکہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی علم و یقین موجود ہی نہیں ہے۔

یہ اصل عظیم پیشِ نظر رکھے گا تو اس راہ کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔

یہ علم کلام، متکلمین کا علم کلام نہیں ہے، کتاب و سنت کا علم کلام ہے۔

۳۔ باقی رہی یہ بات کہ بعض احادیث میں "نجوم" کی پیدائش کا مقصد بعض خاص امور بیان کئے گئے ہیں، اور بقیہ کی نفی کی گئی ہے، تو اس بارے میں بھی ایک اصل پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ احادیث پر موقوف نہیں، خود قرآن میں بھی جا بجا اس طرح کی تصریحات موجود ہیں۔ جن میں بعض اشیا۔ و مصنوعات کے مقاصد تخلیق بیان کئے گئے ہیں، اور اسلوبِ بیان بظاہر مفید حصر ہے۔ مثلاً یہی تخلیقِ نجوم، یا مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ[1]۔ وغیر ذلک۔ تو اگرچہ ان مقامات میں حصر پایا جاتا ہے، لیکن وہ علے الاطلاق نہیں ہے۔ خاص حالات سے مقید ہے، اور یہ تقیید خود کتاب و سنت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ نزول قرآن کے وقت طرح طرح کے توہماتِ باطلہ مخالفین میں پھیلے ہوتے تھے اور اس وقت تک پھیلے ہوتے ہیں۔ جہل و اصنام پرستی کی وجہ سے لوگ خیال کرتے تھے کہ اجرام سماویہ دیوتا ہیں، اور باشندگان کرۂ ارض کے تمام نتائج و تأثرات کا سررشتہ ان ہی کے ہاتھ ہے۔ بابل، یونان، مصر اور ہندوستان کا فن نجوم (جوتش) ان ہی

---

[1] (اے پیغمبر!) لوگ تم سے (مہینوں کی) چاندرات کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے کہدو، یہ اشارہ کے لئے وقت کا حساب ہے۔ (۲-۱۸۹)

دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ شخص اپنے تمام اقوال و اعمال میں صادق ہے تو اسے قبول کریں۔ کاذب ہے تو انکار کردیں لیکن وہ (یعنی صادق) جو کچھ بیان کرتاہے، اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ جن حدود کے معاملات بیان کرتا ہے، ان کے لئے ہمارا موقف عدم علم کا ہے اور اس کا دعویٰ علم و بصیرت کا ہے ہم وہاں کے لئے جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ شک سے زیادہ نہیں ہے، اور وہ جو کچھ کہتاہے، اس کی بنیاد علم و یقین پر ہے۔ ہم شک کی بناء پر علم و یقین کو جھٹلا نہیں سکتے۔

مختصر لفظوں میں جو کچھ کہدیا گیاہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔

ثانیاً۔ انبیاء کرام اور کتب سماویہ کے تمام بیانات، جو ماوراء محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کردی جاتی ہے، اور غلط طریقوں سے تطبیق عقل و نقل کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں تطبیق کی گنجائش ہی نہیں اور عقل اپنی حدود سے باہر سے معلومات رکھتی ہی نہیں کہ معارفِ نقلیہ کے موافق ہوں یا مخالف ہوں۔ عقل لاعلمی کے سکوت میں ہے۔ نقل علم و یقین کے ساتھ متکلم ہے پس تعارض کب ہوا کہ تطبیق کا سوال پیدا ہو؟

"شہاب ثاقب" وغیرہ کے متعلق بھی جس قدر امور بطریق صحیح کتاب و سنت سے ثابت ہیں اسی قسم کے معارف میں داخل ہیں، جو بلاشبہ عقل انسانی نے ایک خاص حد تک پہنچ کر یہ بات معلوم کرلی ہے کہ شہاب ثاقب کس طرح ٹوٹتے ہیں، اور فضا میں کیا کیا محرکات ان کے سقوط کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کے لئے علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے یا نہیں ہے؟

میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ واحمہا کالدیباج انما سماء کہ فریا واما رضہ مجہول۔
پس سماء الدنیا کے معنے ہوتے، زمین کے اوپر کی فضا۔

مولوی افضال الحق صاحب[1] کو اور اگر ملاقات ہو تو ان کے والد بزرگوار کو میرا سلام شوق پہنچا دیں۔

ابوالکلام

---

[1] مولوی افضال الحق اور ان کے والد بزرگوار مولانا فضل حق رامپور کے رہنے والے تھے۔ مولانا فضل حق اپنے وقت کے منطق و فلسفہ کے مشہور عالم تھے۔ ایک زمانے میں رامپور کی علوم مشرقی کی مشہور درسگاہ "اورنٹیل کالج" کے پرنسپل تھے۔ مولوی افضال الحق صاحب بھی اس کالج میں استاذ ہو گئے تھے۔

عقائدِ باطلہ کا ایک مدوّن مجموعہ ہے۔ عرب جاہلیہ میں کیا کیا اوہام پھیلے ہوئے تھے۔ پس جہاں کہیں اجرام سماویہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ان کی تخلیق کا کوئی ایسا مقصد بیان کر دیا گیا ہے، جو زیادہ واضح اور اقرب الی العقول ہے اور ساتھ ہی یہ کہدیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہے، بے اصل ہے۔ یعنی جو خرافات لوگوں میں مشہور ہیں، ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کے حقیقی مقاصد اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ اَھِلّۃ کی نسبت فرمایا: ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ۔ کیونکہ یہ سب سے زیادہ واضح اور اوقع فی النفس بات تھی۔ مقصود یہ تھا کہ تم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مہینوں کی چاندرات کی نسبت جس قدر اوہام و خرافات بنا رکھے ہیں۔ ان کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ تو اوقات معلوم کرنے کا سامان ہے اور بس۔

حضرت ابراہیم[1] کی وفات اور کسوف مدینہ والی حدیث پر نظر ڈالیے۔ صرف اتنی بات پر کسوف کا معاملہ ختم کر دیا کہ یہ آیاتِ الٰہیہ میں سے ایک آیت ہے۔ اور تمام تر زور عوام کے .... بے اصل خیالات کے ازالے پر دیا گیا۔ کیونکہ انبیائے کرام کا مقصود اصلاحِ عقائد ہوتا ہے نہ کہ خواص و فوائد اجسام کی شرح و تنقید۔

بہر حال جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے اس میں نفی مطلق نہیں مقید ہے۔

۴۔ سماء الدنیا سے مقصود بلندی کا وہ نظارہ ہے جو ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے۔ یعنی فضا جسے یونانی اور اب اس کی وجہ سے انگریزی میں (ایٹما سفیر) کہتے ہیں۔ عربی میں سماء کے معنے اوپر کی چیز کے ہیں۔ مثلاً ساتر

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے جو بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ آپ کی وفات کے روز سورج گرہن پڑا تھا۔ جس کی نسبت مشرکین و کفار نے کہا تھا کہ سورج گرہن آپ کی وفات کی وجہ سے پڑا ہے۔ آنحضرت فداہ ابی و امی نے اس کی تردید فرما دی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بریلی۔ ۱۳ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ

بخدمت جناب مولانا احمد رضا خانصاحب بریلوی۔ دام مجدہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مسئلہ تحفظ وصیانت خلافت اسلامیہ، ترک موالات واعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ مسائل حاضرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں، چونکہ جمعیۃ العلماء کا جلسہ یہاں منعقد ہو رہا ہے، اور یہی مسائل اس میں زیر نظر وبیان ہیں۔ اس لئے میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ ونظر کا یہ مناسب بہتر موقع پیدا ہو گیا ہے۔ جناب جلسہ میں تشریف لائیں اور ان مسائل کی نسبت بطریق اصحاب علم وفن گفتگو فرمائیں۔ میں ہر طرح عرض وگزارش کے لئے آمادہ ومستعد ہوں۔

فقیر

ابوالکلام احمد کان اللہ لہٗ

(۵۶)

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے نام

[مارچ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ جلسہ بریلی میں ہورہا تھا اس موقع پر جماعت رضائے مصطفےٰ کی جانب سے ایک تحریر میں جمعیۃ العلماء اور جمعیۃ خلافت کے موقف و مسلک پر شدید اعتراضات کئے گئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکتوب کا یہی پس منظر ہے۔ استقبالیہ کمیٹی نے حضرت مولاناؒ کا یہ مکتوب جو حقیقتاً ایک "چیلنج" تھا، مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ ایک اشتہار کی صورت میں شائع کردیا۔

" بجواب تحریر جماعت "رضائے مصطفےٰ" موصولہ امروزہ مندرجہ بالا خط آج ۲۱ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ مطابق ۴ مارچ ۱۹۲۱ء کی شام کو جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب کی خدمت میں بھیجدیا گیا ہے۔ اب عام اطلاع کے لئے اس کی نقل شائع کی جاتی ہے "

مولانا آزادؒ کے اس چیلنج کو قبول کر لیا گیا۔ مولانا سید سلیمان اشرف مولانا حامد رضا خاں ابن مولانا احمد رضا خاں اور دیگر بریلوی مولوی شریک ہوئے۔ مولانا سلیمان اشرفؒ نے تقریر کی اور اپنے اعتراضات پیش کئے۔ جوابی تقریر مولانا آزادؒ نے کی اور ان کو پوری طرح مطمئن کردیا۔ حضرت سید سلیمان اشرفؒ نے اسی جلسہ میں اپنے اطمینان کا اظہار اور جمعیۃ العلماء ہند کے مسلک کا اعتراف کیا اور ہر طرح امداد و تعاون کا یقین دلایا]۔

(۵۸)

مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے نام[1]

[حضرت مفتی صاحبؒ اس زمانہ میں جمعیۃ العلماء ہند کے نائب صدر تھے اور اپنے علم و بصیرت اور سنجیدگی کی وجہ سے موافق و مخالف، حلقوں میں عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے نام مولانا آزادؒ کے اس خط کی ایک تاریخی حیثیت تھی۔ افسوس، کہ مکمل خط حاصل نہیں ہوسکا اس قدر اقتباس میسر آگیا، پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مکتوب ۴ر اور ۸ر دسمبر ۱۹۲۱ء کے درمیان لکھا گیا تھا]

بدایوں کے جلسہ (جمعیۃ) میں شرکت کا قطعی ارادہ تھا، لیکن یہاں پہنچ کر جو حالات دیکھے اور روز بروز ظہور پذیر ہو رہے ہیں، ان کے بعد بہت مشکل ہوگیا ہے کہ میں کلکتہ سے نکل سکوں۔ کلکتہ سے نکلنے کے یہ معنے ہوں گے کہ میں ایک بہترین مہلتِ عمل دیدہ و دانستہ ضائع کردوں۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ شاید سول نافرمانی کا عقدہ یہیں حل ہوگا۔ روز بروز ایک نئی شاہراہ کامیابی میرے سامنے کھلتی جارہی ہے۔ یقین کیجئے کہ بدایوں کے جلسے[2] میں عدم شرکت کا مجھے بھی نہایت افسوس ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ کلکتہ سے نکلنا کم از معصیت نہ ہوگا۔

---

[1] شاہجہان پوری ثم الدہلوی۔

[2] جمعیۃ العلماء کا جلسہ ۱۰ر ۱۱ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو ہونے والا تھا۔

(۵۷)

ڈپٹی پولیس کمشنر کلکتہ کے نام

[تحریک خلافت اور ترک موالات کا شباب تھا۔ ایک روز ڈپٹی پولس کمشنر کلکتہ کا ایک خط انگریزی میں مولانا کے نام پہنچا جس میں مولانا کو کمشنر پولس سے ملنے کا حکم دیا گیا تھا اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

یکم جولائی ۱۹۲۱ء

ڈیر سر!

شکر گزار ہوں گا، اگر آپ آج ۴ بجے شام کو "لال بازار" میں آکر کمشنر پولس سے مل لیں۔ براہِ عنایت معاملہ کو از حد ضروری خیال کریں۔

دستخط ڈپٹی پولس کمشنر کلکتہ

مولانا نے اپنے کسی آدمی کو درج ذیل مسودہ دیا کہ وہ اس کا انگریزی ترجمہ کرکے متعلقہ شخص کو بھیجدے۔]

"یکم جولائی ۱۹۲۱ء

مولانا کو آپ کی چھٹی ابھی چار بجے ملی۔ وہ دو ہفتوں سے بیمار ہیں اور دونوں پاؤں میں زخم ہوجانے کی وجہ سے نقل و حرکت نہیں کرسکتے۔ آج ۴ بجے مرزا پور پارک میں ایک جلسے کا اعلان اس امید سے کیا گیا تھا کہ اس وقت تک صحت یاب ہوجائیں گے۔ اعلان کی ذمہ داری محسوس کرکے کسی نہ کسی طرح اس میں شریک ہونا پڑے گا۔ لیکن وہ ملاقات کے لئے آنے کے قابل نہیں ہیں۔ یا تو آپ ان کی صحت کا انتظار کیجیے، یا پھر بذریعہ خط مقصد ملاقات سے مطلع کردیجیے۔"

دے گیا تھا، خیال تھا کہ جلد لکھنؤ سے واپس آجاؤں گا اور تمام مضامین میری موجودگی میں ترتیب پائیں گے۔ لیکن مجھے آگرہ اور پنجاب کا سفر پیش آگیا اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے اپنے شوق میں بلا انتظار پرچہ مرتب کرکے شائع کردیا۔ لاہور میں جب مجھے پرچہ ملا تو اشاعت کی جتنی خوشی ہوتی تھی، اتنا ہی اغلاط پر افسوس بھی ہوا۔ تاہم مولوی عبدالرزاق صاحب کو مستحق ملامت نہیں سمجھتا، وہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ بھی بہت ہے۔ ان کے شوق و مناسبت میں کلام نہیں، صرف ضرورت مشق کی ہے چند دنوں تک مشق جاری رہی تو قلم محفوظ ہوجائے گا۔

آپ نے "فاتحۃ الجامعہ" پر بھی تین نشان کئے ہیں۔ پہلی غلطی صریح کمپوز کی غلطی ہے۔ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ یعنی انما اللہ عوۃ الجامعۃ الشرقیہ میں ضمیر رہ گئی ہے۔ باقی رہے بقیہ دو مقام تو ان میں ایک کی نسبت بلاشبہ آپ کی اصلاح بالکل صحیح ہے۔ یعنی یتحد المتخاصمون کی جگہ یتصالح ہونا چاہئے۔ واقعی خصومت کے لئے اتحاد موزوں نہیں ہے، صلح موزوں ہے۔ لیکن دوسری اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ نے لکھا ہے کہ "سلزیل المقالات" کی جگہ "سنضیف" ہونا چاہئے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ سلزیل بھی صحیح ہے۔

بقیہ مضامین میں جو غلطیاں دکھلائی ہیں، ان میں زیادہ تر کمپوز اور تصحیح کی غلطیاں ہیں۔ مثلاً "وطنیین" وغیرہ، جمع میں ایک "ی" کی کمی۔ جاۃ کی جگہ غلط رسم الخط جائت، نتغان کی جگہ نتفاق وغیر ذلک۔ آپ کو کمپوزیٹروں کا حال معلوم ہے۔ جو اردو صحیح کمپوز نہیں کرسکتے وہ عربی میں جس قدر باعث مصائب ہوں کم ہے۔ بڑی دقت تصحیح کی ہے۔ مولوی عبدالرزاق ابھی تصحیح میں بہت کچے ہیں۔ غلطیاں رہ جاتی ہیں اور وہ تصحیح سے فارغ ہوجاتے ہیں۔

(۵۹)

علامہ سید سلیمان ندوی ؒ

(۱)

[یہ خط اس سے قبل "مکاتیب ابوالکلام" اور "تبرکاتِ آزاد" میں شامل کیا جا چکا ہے۔ یہاں اس کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مولانا آزادؒ کو عربی نہ آتی تھی، وہ اس پر نظر ڈال لیں تاکہ انھیں معلوم ہو جائے حضرت مولاناؒ ایک واقف سے عربی زبان و بیان اور ادب کی باریکیوں کے بارے میں کس طرح مخاطب فرماتے تھے، اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ عربی زبان و بیان کے مسئلے پر ایک ناواقف، واقف سے مخاطب ہے یا ایک واقف ہے!]

کلکتہ

۲۰ رمئی ۱۹۲۳ء

صدیقی العزیز! السّلام علیکم

آج مولوی عبدالرزاق صاحب نے آپ کا خط اور "الجامعہ" کا وہ نسخہ دکھایا، جس پر آپ نے پنسل سے اشارات کر کے بعض اغلاط واضح کئے ہیں، دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ کو اس کام کی صحت و خوبی کا اس درجہ خیال ہے۔ فی الحقیقت یہی سب سے بڑی مدد ہے جو ہم ایک دوسرے کی کر سکتے ہیں اور ہمیں باہم ایسی ہی توقع رکھنی چاہیئے۔

آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ "الجامعہ" کے دونوں نمبر میری عدم موجودگی میں نکلے ہیں۔ پہلے نمبر کے لئے میں صرف "فاتحۃ الجامعہ" اور "حرکۃ الخلافۃ و مطالبہا"

(۶۰)

(۲)

جمعیۃ خلافۃ کا تیسرا وفد، جس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے، شروع فروری ۱۹۲۶ء میں ہندوستان واپس آگیا تھا۔ ۷ر مارچ ۱۹۲۶ء کو دہلی میں جمعیۃ خلافۃ مرکزیہ کا اجلاس ہوا، جس میں وفد نے اپنی دو رپورٹیں پیش کیں، پہلی رپورٹ مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی کی مرتبہ تھی، دوسری رپورٹ مولانا ظفر علی خاں کی مرتب کی ہوئی تھی۔ دونوں رپورٹوں میں اختلاف تھا، یہ اختلاف جمعیۃ خلافۃ کے فیصلوں اور صدر خلافۃ مولانا آزاد کی یادداشت اور ہدایات کی تعبیر کے بارے میں بھی تھا۔ اور حجاز کے حالات کے تجزیہ کے بارے میں بھی تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ جمعیۃ خلافۃ کے حلقہ میں بھی انتشار اور بد نظمی کی صورت میں نکلا اور اس کا اثر عوام پر افسردگی اور بے دلی کی صورت میں پڑا۔ مولانا آزاد کے اس مکتوب میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے۔

ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مولانا آزاد کے نزدیک مسئلہ حجاز کو وہ اہمیت حاصل نہ رہی تھی جو اس سے قبل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ حجاز میں پوری طرح سلطان ابن سعود نے پیر جما لئے ہیں، اپنے مخالفوں پر قابو پالیا ہے اب انہیں اس قدر نہیں جھکایا جا سکتا کہ حجاز کی امارت سے دست بردار ہو جاتے، اور انتظام ایک مجلس کے سپرد کر دے جو عالم اسلامی کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ پھر اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس کی مخالفت بھی صحیح نہیں کہ اس سے انگریزوں کو تقویت پہنچے گی۔ اس لئے مولانا آزاد کا خیال تھا کہ اب مسئلہ حجاز کو اس کی حالت پر چھوڑ کر اپنی توجہ

لیکن چند غلطیاں واقعی کتابت اور تراکیب کی ہیں اور آپ کے اشارات بالکل صحیح ہیں۔ مثلاً انوی کا استعمال، انعقاد عقد کی جگہ، انفضا من نفض کی جگہ، من التشریح انفسهم میں مفعول کا حذف وغیرہ۔

لیکن ایک دو مقام پر آپ سے بھی تسامح ہوگیا ہے۔ مثلاً یهنئه هو کی جگہ یهنئه ایاه آپ نے لکھا ہے، حالانکہ یهنئه هو بھی صحیح نہیں ہے اور یهنئه ایاه بھی نہیں ہونا چاہیے۔ صرف یهنئه وہاں کافی اور صحیح ہے۔ اسی طرح بہ اہتمام زائد کی جگہ آپ نے بالغ بنا دیا ہے حالانکہ زائد بھی ٹھیک ہے اور امثال موجود ہیں۔ ایک جگہ محکوین میں، من نفس تلك الدولة کی جگہ بنفس ہے لیکن بہ ظاہر وہاں "من" ہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

بہ ہر حال اغلاط ضرور ہیں۔ خصوصاً بعض تراکیب کی۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ دوسرا نمبر اغلاط سے محفوظ ہے۔ لیکن شاید ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں۔ اس میں بھی نہ صرف کمپوز کی بہ کثرت غلطیاں ہیں بلکہ الفاظ وغیرہ کی بھی۔ الحركة الهندية میں ایک جگہ وكانوا يصرفون قواهم لکھ گئے ہیں، یعنی صرف بمعنے خرچ۔ یہ اُردو کا محاورہ ہے اور عربی میں لکھ گئے۔

اس سے بھی بڑھ کر غلطی یہ کی کہ سید رشید رضا کا مضمون بلا مناسب رد کے شائع کر دیا۔ بہتر یہ تھا کہ شائع ہی نہ کرتے یا میرے دیکھ لینے کے بعد شائع کرتے۔ یہ بات اس درجہ نامناسب ہوتی کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔

آپ آئندہ بھی جو اغلاط دیکھیں مولوی عبدالرزاق صاحب کو ضرور لکھ دیں یا مجھے مطلع کریں۔ اس کی بڑی ضرورت ہے، اس میں مضائقہ و تغافل نہ کیجیے گا۔

مولوی مسعود علی صاحب اور مولوی عبدالسلام صاحب کو سلام شوق۔

بے دلی، بدنظمی اور انتشار بڑھتا جاتا ہے۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ اب مسلمانوں کو پوری قوت ہندوستان کے اندر کے تعمیری کاموں پر خرچ کرنی چاہیئے، لیکن چونکہ کوئی معین راہِ عمل سامنے نہیں ہے، اس لئے مایوسی اور بے دلی بڑھتی جاتی ہے۔ دوسری طرف واقعہ نفس الامریہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی کمزوریوں کے نتائج اب اس درجہ آشکارا ہو چکے ہیں کہ ان کی طرف سے اب مزید غفلت کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم ہو گا۔ پچھلے دو تین برسوں کے اندر طرح طرح کے نئے ہنگامے اُٹھے لیکن جس تیزی سے اُٹھے تھے، اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی گئے، اور صورتِ حال میں کوئی مفید تبدیلی نہ پیدا ہوئی۔ اب حالت یہ ہے کہ ملک کی مایوسی اور بدنظمی انتہائی درجہ تک پہنچ چکی ہے، اور ان تمام لوگوں کے لئے جو صورتِ حال کا احساس رکھتے ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر نہیں ہیں، ایک فیصلہ کن سوال پیش آگیا ہے۔ ضروری ہے کہ موجودہ معلق اور منتظر حالت ختم کر دی جائے اور ایک آخری فیصلہ ہو جائے۔ یا تو ہمیں چاہیئے کہ جلد از جلد سعی و عمل کا قدم اُٹھائیں اور مسلمانانِ ہند کی جماعتی زندگی کو ایک سخت تاریک مستقبل سے بچا لیں، یا پھر ایک مدتِ دراز کے لئے ان تمام قومی امیدوں سے دستبردار ہو جائیں، جن کے رکھنے اور پرورش کرنے کے ہم آج تک مدعی رہے ہیں، میں امید کرتا ہوں کہ آپ کم از کم اس کے لئے تو تیار نہ ہوں گے کہ آخری صورتِ حال اختیار کریں۔

اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو خدارا اُٹھیئے، ایک مرتبہ، صرف ایک مرتبہ نئی ہمت، عزم سے کام لیجئے اور تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے قدمِ ہمت کے اُٹھتے ہی کس طرح تمام ملک آپ کی گرد راہ کو راہنما بنانے کے لئے تیار ہے۔ یقین کیجئے، ملک کی سرگرمیوں کے قوای شل نہیں ہو گئے ہیں، صرف تھوڑی سی

ہندوستان میں تعمیری کاموں اور مسلمانوں کے تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے کی کوششوں پر مبذول کرنا چاہیے اس طرف مولانا کے اس خط میں بھی اشارہ ہے۔

مولانا نے ۱۹ر اپریل ۱۹۲۶ء کو جمعیۃ خلافت کے جس جلسہ کے انعقاد کی خبر دی ہے وہ ۱۸ر ۱۹ر اور ۲۰ر اپریل کو ہوا تھا۔ اس کا سب سے اہم فیصلہ صرف یہ تھا کہ مؤتمر اسلامی کا اجلاس جو مکہ معظمہ میں ہونے والا تھا، اور جس میں حکومتِ حجاز کی تشکیل کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، اس میں شرکت کے لئے ایک وفد بھیجا جائے۔ مؤتمر کا اجلاس ۲ر جون ۱۹۲۶ء کو ہونے والا تھا لیکن بعض اسلامی ممالک کے نمائندے اس وقت تک نہ پہنچ سکے، اس لئے کئی مرتبہ کے التوا کے بعد ۷ر جون کو اس کا افتتاح ہوا۔

جمعیۃ خلافت مرکزیہ (ہند) کی جانب سے حسبِ ذیل افراد پر مشتمل ایک وفد نے شرکت کی تھی۔

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی (رئیس وفد) ۲۔ مولانا شوکت علی (رکن) ۳۔ مولانا محمد علی (رکن) ۴۔ شعیب قریشی (رکن و سکریٹری)۔

مولانا آزاد کی جانب سے تحریکِ خلافت میں دلچسپی لینے کی یہ آخری تحریک تھی، لیکن مولانا آزاد جس انداز پر خلافت کی تحریک کو لے جانا چاہتے تھے، اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔

جنابِ من!

السلام علیکم، جو صورت حال ملک کی ہو رہی ہے، وہ آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کا تعلق ہے، روز بروز افسردگی

تمام ذاتی کاموں کو انتہائی ابتری کی حالت میں چھوڑ کر برما گیا اور باوجود ملک کی افسردگی کے ۵۰ ہزار روپے کے فنڈ سے ہمارے نئے سال کا آغاز ہوگیا۔ یہ حالت ہر طرح امید افزا ہے۔ لیکن مجھے افسوس اور درد کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی کے حلقہ میں وہ مستعدی نہیں دیکھا، جس کے اعتماد پر میں نے یہ بار اپنے سر لیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اب سب کے علم میں آجائے کہ میں ۱۹۲۶ء کے بقیہ ایام ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ضروری ہے میں معلوم کرلوں کہ مطلوبہ کام انجام پاسکتا ہے یا نہیں اور ہمراہان کار آمادہ سفر ہیں یا درماندۂ کار؟ اگر کام کی امید نہیں تو بہتر ہے کہ میں اب بھی... یکسوئی کرلوں اور ان کاموں کے لئے ہمہ تن وقف ہوجاؤں، جن کے لئے اپنے آپ کو کمیٹی کے کاموں سے کہیں زیادہ موزوں اور بہت زیادہ مضطرب پاتا ہوں۔

بہرحال آئندہ جلسہ ہمارے لئے مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ اس فیصلہ میں مجھے اپنی زندگی اور اوقات کا فیصلہ ڈھونڈنا ہے۔ ملتجی ہوں کہ اس موقع پر کم سے کم اتنا تو کیجئے کہ تھوڑی سی زحمت برداشت کرکے آئیے اور جو کچھ مجھے عرض کرنا ہے، ایک مرتبہ سن لیجئے۔ اگر اس قدر گزارش حال پر بھی آپ کی جانب سے اغماض ہوا تو پھر مجھے یہ تصور کرلینے کی اجازت دے دیجئے کہ میری صدائے کار اور التجائے ہمرہی کا جواب آپ کی جانب سے ردِّ دعوت اور عدم سماعت ہے، اور میرے لئے بھی آپ کا آخری فیصلہ ہے۔ وفقنا اللہ سبحانہٗ وایاکم بما یحبہٗ ویرضاہ۔

اندکے با تو بگفتم غمِ دل ترسیدم ٭ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

فقیر ابوالکلام

کلکتہ

۲۵ مارچ ۱۹۲۶ء

تھکن پیدا ہو گئی، جس کو ہماری ایک جان دار حرکت قدم دور کر دے سکتی ہے۔ ساری مشکل اسی اولین قدم میں ہے، اگر یہ اُٹھ جاتے تو راستہ صاف ہے۔

اس باب میں ایک آخری فیصلہ کر دینے کے لئے ۱۹ اپریل ۲۹ء کو دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو، آپ اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں، اور ایک مرتبہ وہ چند باتیں میری زبان سے سُن لیں، جن کے سُنانے کے لئے میرا دل مضطرب ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ آئندہ بھی اپنا وقت دیں۔ یہ آپ کے ارادہ اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر موقوف ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک مرتبہ یہ سفر کر کے ہم سب اکٹھے ہو جائیں اور جو صورت حال درپیش ہے، اسے سُن لیں، میں جانتا ہوں آپ کے سفر کے لئے موانع ہوں گے، مگر میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان پر غالب آجائیں گے۔ یہ خلافت کمیٹی کے پچھلے جلسوں کی طرح محض رسمی تجاویز کا جلسہ نہیں ہے۔ یہ ایک آخری اور فیصلہ کُن اجتماع ہے۔ ہمیں سات کروڑ مسلمانوں کے لئے فیصلہ کرنا ہے کہ ان کی آئندہ قسمت روشنی کے حوالے کی جائے یا تاریکی کے؟ کس قدر درد اور قلق کی بات ہوگی، اگر آپ ایسے اجتماع کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

میں یہ بات بھی آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ میں نے اس افسردہ اور پُر آشوب سالی کی صدارت کی ذمہ داری چند ارادوں اور امیدوں کی بنا پر منظور کی تھی۔ میری بقیہ زندگی کے قلیل اوقات میں اب اس کی گنجائش نہیں رہی ہے کہ کانفرنسوں اور انجمنوں کی رسمی صدارتوں سے زیب و زینت پائیں، میں نے مجبور ہو کر اور کسی کو قدم نہ بڑھاتے پا کر یہ بار اُٹھایا اور اس لئے اُٹھایا کہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ مسلمانوں کی موجودہ خطرناک بدحالی و بدنظمی دُور کی جائے۔ اور ان کے سامنے ملک کے اندر کی قومی ضرورتیں نمایاں ہوں۔ میں اسی لئے اپنے

مدرسہ کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔ لیکن وہاں جو کچھ اصرار ہے، جلسہ اور وعظ گوئی پر ہے۔ میرے لئے یہ زیادہ سے زیادہ دشوار اور ناقابل برداشت کام، ان کے لئے یہی سب سے زیادہ ضروری۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تعمیل کروں۔ انشاء اللہ کوتاہی نہیں کروں گا۔ بڑی بات یہ بھی ہوگی کہ اعظم گڑھ آنے اور آپ لوگوں سے دار المصنفین میں ملنے کا قدیم ارادہ پورا ہوجائے گا۔ کاش سرائے میر میں یہ جلسہ کا معاملہ نہ ہوتا، میں جاتا، مدرسہ کو دیکھتا اور کارکنوں سے ملنے کی خوش وقتی حاصل کرتا۔

ابوالکلام

(۶۲)

(۴)

صدیقی العزیز! خط پہنچا۔

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی!

آپ نے میرے دل کا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اعظم گڑھ میں بھی جلسہ اور وعظ کی مصیبت آئے گی۔ یہ معاملہ میرے لئے ایک قطعاً ناقابل علاج ہوگیا ہے۔ میری کوئی سعی، کوئی فصاحت و بلاغت، کوئی بحث اس بارے میں سودمند نہیں ہوتی۔ میں اگر لوگوں سے کہوں کہ تقریر کرنا میرے لئے مہلک ہے، اور آدھ گھنٹہ کے بعد مر جاؤں گا، جب بھی لوگ بخوشی آمادہ ہو جائیں گے کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تک بکواس کرالیں، پھر ہجوم مصافحہ کی جگہ تجہیز و تکفین کا اہتمام کیوں نہ کرنا پڑے۔ کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اصل مقصد جس طرح میری زندہ لاش سے حاصل ہوسکتا ہے، مُردہ لاش سے بھی حاصل کرلیا جاسکتا ہے۔ شاید بعض

(۶۱)

(۳)

۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء

حبی فی اللہ السلام علیکم

معاف کیجیے گا، جواب میں تاخیر ہوئی۔ میں کلکتہ میں نہیں تھا۔ ڈاک یہیں جمع ہوتی گئی۔ آپ کا خط بھی اسی میں رہا۔ واپسی کے بعد علالت نے دو ہفتے تک مہلت نہیں دی، اب جواب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بلاشبہ آپ کی شکایت بجا ہے۔ ہمیشہ خیال رہا کہ اعظم گڑھ کے لئے وقت نکالوں اور ہمیشہ یہی ہوا کہ قدم نہ اٹھا سکا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے میرے لئے کون بلانا چاہتا ہے؟ جو بلاتا ہے، کسی جلسہ کے لئے، مدرسہ کے لئے اور وعظ و تقریر کے لئے اور میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی طبیعت پر اس درجہ گراں نہیں گزرتی، جس قدر جلسوں کی شرکت اور فرمائشی تقریریں۔ اگر میں اعظم گڑھ آؤں تو وہاں بھی یہی مصیبت ہوگی۔ آپ تک اس کے خواہش مند ہوں گے کہ ایک جلسہ اور تقریر ضرور ہونی چاہیئے۔

اس بارے میں اپنی طبیعت کا حال بیان نہیں کر سکتا، بیان کروں تو امید نہیں کہ احباب اسے سمجھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ اس بارے میں تمام دنیا کو شاکی پاتا ہوں، مگر میں بھی صورتِ حال پر قانع ہو گیا ہوں۔

اِدھر مدرسہ سرائے میر کے لئے مولوی رشید الدین صاحب[۱] نے اصرار شروع کیا۔ پھر لکھنؤ آئے اور اصرار کو انتہائی حد تک پہنچا دیا۔ میرے لئے بہت ہی دشوار تھا کہ ان کے اصرار کے مقابلے میں اپنی عذر خواہی پر قائم رہ سکوں۔ مدرسہ[۲] کے متعلق میرے تاثرات یہ ہیں کہ یہ ایک صحیح معنوں میں مخلصانہ کام انجام دیا گیا ہے۔ میں

---

[۱] برادر مولانا حمید الدین فراہی۔ [۲] مدرسہ سرائے میر

(۶۳)

وفد خلافت

(یادداشت)

[ستمبر ۱۹۲۴ء میں امیر عبدالعزیز ابن سعود کے ایک جرنیل خالد بن لوئی نے طائف پر قبضہ کرلیا۔ شریف حسین اپنے بیٹے امیر علی کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوکر مالٹا چلا گیا اور امیر علی نے مدینہ منورہ کا رُخ کیا اکتوبر میں مکہ مکرمہ بھی ابن سعود کے قبضہ میں آگیا، امیر علی جدہ جا بیٹھا۔ طائف اور مکہ میں ابن سعود کے بعض پُرجوش فوجیوں نے قبے گرا دیئے اور مزارات کو منہدم کردیا۔ شریفی حکومت نے ابن سعود کے خلاف سخت پروپاگنڈا کیا جس سے عالم اسلامی میں شدید بے چینی اور سلطان کے خلاف سخت بدگمانی پیدا ہوئی۔

ان حالات میں جمعیۃ خلافۃ کی مجلس عاملہ نے ۲۱، ۲۲ ستمبر ۱۹۲۵ء کو اپنے اجلاس پٹنہ میں طے کیا کہ ایک وفد مولانا سید سلیمان ندوی رح کی سرکردگی میں حجاز بھیجا جائے جس کے ممبران مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی اور شعیب قریشی ہوں۔ لیکن بعض اسباب کی بناء پر حضرت سید صاحب مرحوم، مولانا بدایونی اور سید خورشید حسین حجاز نہ جاسکے۔ باقی تین ارکان ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو جہانگیر نامی جہاز کے ذریعہ بمبئی سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے۔

مجلس خلافۃ کے فیصلہ کے مطابق مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو اس زمانہ میں جمعیۃ خلافۃ مرکزیہ کے صدر تھے، وفد کی رہنمائی کے لئے ایک یادداشت مرتب کی تھی۔ اس پر کوئی تاریخ نہیں پڑی تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ تحریر ۲۲ ستمبر اور ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کی درمیانی مدت کی ہے۔ یادداشت درج ذیل ہے۔]

اعتبار سے دوسری حالت زیادہ نافع اور نتیجہ خیز سمجھی جاتی ہو۔

آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے ان احساسات کو سمجھنے سے انکار نہیں کیا، یقین کیجئے، آپ کا خط پڑھ کر بے حد شکر گزار ہوا ہوں۔

میں خود چاہتا ہوں دار المصنّفین میں ٹھہروں اور بجز وہاں کے حلقہ کے اور کوئی دعوت التفات نہ دے۔ جب آپ نے اس طرف سے مطمئن کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں مستعجل ہوں۔ تین دن تو نہیں، دو دن ضرور وہاں صرف کر دوں گا۔

مولوی رشید الدین صاحب کہتے ہیں کہ جمعہ سرائے میر میں بسر ہو۔ پس یہ پروگرام سمجھئے کہ پہلے سرائے میر اور پھر دار المصنّفین میں ایک دن پہنچنا اور دوسرے دن روانہ ہو جانا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جگہ کا درمیانی فاصلہ بہت ہی کم ہے۔

مولوی مسعود علی صاحب کی مسرّت میں میری مسرّت کا انعکاس ہے۔ معلوم نہیں مولوی عبد السّلام صاحب بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں۔ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ابوالکلام

۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء

(۶۴)

مولانا ظفر علی خاں کے نام

(ا)

[وفد کے حجاز پہنچنے کے بعد، ارکانِ وفد کی آرا میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تھے، اور دوسری جانب مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی تھے، دونوں فریق اپنی رائے اور عمل کو جمعیۃ کے فیصلے اور مولانا آزاد کی مرتبہ یادداشت کے مطابق قرار دیتے تھے، فریقِ ثانی نے جمعیۃ خلافۃ کو مولانا ظفر علی خاں کے اختلاف سے مطلع کیا۔ جواب میں مولانا آزاد کا برقیہ وصول ہوا، برقیہ انگریزی میں تھا، مولانا ظفر علی خاں کا کیا ہوا ترجمہ درج ہے۔]

دہلی

۲ رجنوری ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

میں امید کرتا ہوں کہ آپ حجاز اور موتمر کے بارے میں کامل طور پر کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی ذاتی رائے بدل گئی ہے، تو شعیب اور عرفان کو وہاں چھوڑ کر تبادلۂ خیالات کے لئے یہاں لوٹ آیئے، تار سے جواب دیجئے۔

ابو الکلام

صدر جمعیۃ خلافۃ (ہند)

جیسا کہ معلوم ہے، وفد کے جانے کا مقصد یہ ہے کہ :

(الف) مسلمانانِ ہند کی جانب سے امیر ابن سعود کا شکریہ ادا کرے کہ انھوں نے ایک اہم خدمتِ اسلامی انجام دی ہے، کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ باقاعدہ منتخب وفد ان سے مل رہا ہے۔

(ب) مجوزہ مؤتمر اسلامی کے لئے امیر موصوف سے گفتگو اور اس باب میں ان کے افکار سے جمعیۃ خلافۃ کو وقتاً فوقتاً مطلع کرنا، اور اس امر پر غور کرنا کہ اس کے لئے ایک مجلس استقبالی کے قیام، اصول و قواعدِ ضروریہ نیابت اور بلاد اسلامیہ سے نامہ و پیام کے ضروری انتظامات کیونکر عمل میں آئیں؟

استقبالی کمیٹی جسے عربی میں "لجنۃ التحضیریہ" کہتے ہیں، نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کے اصول کیا ہوں؟ بلادِ اسلامیہ کی تقسیم کیونکر عمل میں آتے، نیابت اور انتخاب نمایندگان کے لئے کیا بنیادی قواعد ہوں؟ ان امور کے طے کرنے میں توقف کرنا چاہیئے۔ خلافت کمیٹی ایک یادداشت مرتب کرکے بہت جلد بھیجے گی۔ میں نے مصر سے خط و کتابت شروع کردی ہے اور امید ہے اس باب میں ہندوستان اور مصر دونوں مشترکہ کارروائی کریں گے۔

[ابوالکلام آزاد

صدر

جمعیۃ خلافۃِ مرکزیہ]

(۶۶)

سلطان ابن سعود کے نام

[مولانا آزادؒ کا ابن سعود کے نام یہ وہی خط ہے جس کا تذکرہ مولانا غلام رسول مہر صاحب کے نام ۱۲؍ مارچ سنہ ۱۹۲۶ کے خط میں کیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں "میں نے جو آخری خط براہِ راست ابن سعود کو بھیجا تھا" (نقشِ آزاد صـ۱۲) مولانا کے مشورہ کے مطابق موتمر کے اجلاس کی تاریخ ۲۰؍ ذلیقعدہ سنہ ۱۳۴۴ھ مطابق ۷؍ جون سنہ ۱۹۲۶ء مقرر کی گئی تھی۔ (نقشِ آزاد صـ۱۲)]

دہلی

۴؍ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء

سلطان ابن سعود، مکہ

سالانہ خلافت کانفرنس جو مسلمانانِ ہند کی نمائندہ تھی، حال میں کانپور میں منعقد ہوئی۔ تہ دل سے آپ کے پُرامن داخلہ مدینہ منورہ وجدہ پر مبارک باد دیتی ہے، اور شکرگزار ہے کہ حجاز شریفیوں کی بدنظمیوں سے پاک ہوگیا اور حجاز کے مستقبل کے بارے میں آپ کی پالیسی پر اظہار اطمینان کرتی ہے اور شرکت موتمر کے لئے تیار ہے۔ مہربانی کرکے اطلاع دیجئے کہ موسم حج انعقاد موتمر کے لئے مناسب ہوگا؟

ہم اس تجویز پر اب تک قائم ہیں جو اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں آپ کو بھیجی تھی اور اس پر خوش ہیں کہ آپ نے اپنے ربیع الآخر والے مکتوب میں اس پر رضامندی ظاہر کی ہے۔

ہمارے نمائندگان مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی انتظامات موتمر میں آپ کی مدد کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

ہر شخص آپ کے لئے، حجاز اور اسلام کے لئے دست بدعا ہے۔

ابوالکلام
صدر خلافہ

(۹۵)

(۲)

[مولانا ظفر علی خاں کو جب اس حقیقت کا علم ہوا کہ ان کے اختلاف اور رویہ کے متعلق جمعیۃ خلافۃ کو کئی تار دیئے گئے ہیں تو انھیں خیال پیدا ہوا کہ مبادا ان کے متعلق لاعلمی کی بناء پر کوئی غلط رائے قائم کرلی جائے، انھوں نے اپنے رویہ کے متعلق جمعیۃ خلافۃ کو لکھا کہ وہ اس کے فیصلہ کی حرفاً حرفاً تعمیل کر رہے ہیں، نیز ہدایات طلب کیں۔ جواب میں مولانا آزادؒ کا برقیہ وصول ہوا، اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ہے جو درج ذیل ہے۔ مولانا آزادؒ نے جس یادداشت کے بھیجنے کا تذکرہ کیا ہے، وہ نہیں بھیجی جاسکی۔ حتے کہ یہ وفد ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو واپسی کے لئے روانہ ہوگیا]

دہلی

۹ر جنوری ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

ہمارے مقاصد وہی ہیں، جن کا سلطان اعلان کرچکے ہیں، آئندہ حج کے موقع پر انعقاد موتمر کے متعلق زور دو۔ مستقبل کا فیصلہ صرف موتمر ہی کرسکتی ہے عربی یادداشت بھیج رہا ہوں۔ موتمر کے متعلق گفت وشنید جاری کرو۔

ابوالکلام آزاد

صدر خلافۃ

(۶۸)

پنڈت بنارسی داس چترویدی کے نام

جنابِ من!

مجھے اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ آپ ہندی کے چھوٹے چھوٹے رسالوں کا ایک نہایت مفید سِلسلہ شائع کر رہے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مذہب اور تاریخ و تہذیب کے سمجھنے کا موقع دیا جائے۔ اور وہ غلط فہمیاں دُور کی جائیں جو ناواقفیت اور تنگ نظری کی وجہ سے عام طور پر پھیل گئی ہیں۔ یہ وقت کا ایک نہایت ضروری کام ہے جس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے، اور میں خوش ہوں کہ آپ نے اور آپ کے دوستوں نے اس کی ضرورت بروقت محسوس کی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اور آپ یہ سِلسلہ زیادہ بہتری اور وسعت کے ساتھ جاری رکھیں گے۔

ابوالکلام۔ آزاد

کلکتہ۔ ۴۔ جنوری ۱۹۳۴ء۔

(۶۷)

ایم۔ ای زکریا بھاگلپوری کے نام

باسمہ

۲۰ر فروری ۱۹۳۰ء

حبیّ فی اللہ! السّلام علیکم۔ آپ کی پریشانیوں سے بے خبر نہیں ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ زمانہ بے مہر ہے اور اربابِ درد کی جیب خالی ہے۔ بہر حال جونہی کوئی ایسی صورت پیدا ہوئی کہ آپ کے لئے سود مند ہو، آپ کو اطلاع دوں گا۔

(۱) اکبر کا اَن پڑھ ہونا کوئی غلط فہمی نہیں ہے، بلکہ تاریخی واقعہ ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ اسے تعلیم یافتہ ثابت کیا جاتے۔ اس کی فطری ذہانت اور قدرتی استعداد کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ باوجود اَن پڑھ ہونے کے ملک داری کی حکمت و سیاست کی سب سے بہتر مثال قائم کر گیا۔

(۲) جنوبی اور وسط امریکہ کے آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں اس کا تعلق قدیم برّ اعظموں سے رہ چکا ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخی وثاقت کا تعلق ہے، قطع و جزم کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کولمبس سے پہلے کسی سیاح نے اسے دریافت کیا ہو۔ اندلس کی تاریخ میں دو عرب بھائیوں کی داستان ملاحی بیان کی گئی ہے، اور بعض لوگوں کا خیال ہے، یہ دونوں بھائی امریکہ تک پہنچ گئے تھے، لیکن یہ محض ایک قیاس ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ریڈ انڈین کا اطلاق امریکہ کی وطنی اقوام پر کیا گیا ہے اور ان کی تاریخ اس وقت تک تاریکی میں ہے۔

(۴) مذہب کا مقصود انسان کی روحانی سعادت و نجات اور ایک خالقِ کائنات کے رشتہ عبودیت سے تمام افرادِ انسانی کو باہم دگر متحد کر دینا ہے یہ سوال ایسا نہیں ہے کہ مختصراً جواب دیا جا سکے بہت زیادہ تفصیل و بحث کی ضرورت ہے۔

ابوالکلام

جاسکیں گے، لیکن اس صورت میں ضروری ہوگا کہ کام ساتھ لے جائیں اور جاری رکھیں۔ اس کے بعد واپس آکر پھر یہاں مشغول ہوجائیں۔

میری کوشش یہی ہوگی کہ ہر طرح کی سہولت بہم پہنچاؤں، مجھے امید ہے، آپ اس معاملت کو ہر طرح سودمند پائیں گے۔

اگر آپ تیار ہوں تو بہ تفصیل صورتِ حال سے مطلع کیجئے۔ رقم کے متعلق آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ آپ کے کام کی روزانہ مقدار عام طور پر کیا ہے؟ آپ کس وقت تک کلکتہ آسکیں گے، کیا آپ کو اپنے نسخ پر اب اطمینان ہے؟ کیا آپ ترجمان القرآن کا متن بھی لکھیں گے؟ حتی الوسع جلد جواب دیجئے۔

ابوالکلام

(۷۰)

(۲)

۳۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ

۴ ۵/ ۴۴ء

مُحبّی فی اللہ! خط پہنچا۔ مکان کا بُعد اور علائق کا تفرقہ بلاشبہ ایک دقت ہے۔ مگر ایسی دقت نہیں جو دیہ سے حاصل نہ کی جاسکے۔ علاوہ بریں میں اس کے لئے بھی طیار ہو جاؤں گا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ آپ کسی دوسری جگہ مقیم رہ کر مسلسل میرا ہی کام کرتے رہیں۔

بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے مل لیں۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔ آپ ۱۱ر مئی سے ۱۵ر مئی تک مجھ سے وہاں مل سکتے ہیں۔ خط و کتابت میں تفصیلی گفتگو مشکل ہے۔ بالمشافہ ساری باتیں صاف ہو جا سکتی ہیں۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۶۹)

منشی عبدالقیوم خطاط کے نام

(۱)

۳۔ اسٹور روڈ۔ کلکتہ۔

۲۵ مئی ۱۹۴۳ء

حبی فی اللہ، السلام علیکم

خیال تھا کہ دہلی جاؤں گا اور آپ کو اطلاع دے دوں گا۔ وہاں بالمشافہ گفتگو ہو جائے گی، لیکن حالات نے مہلت نہیں دی اور مہینہ ختم ہو گیا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت کو ترجیح دی جائے۔

جو کام درپیش ہے، وہ اتنی مقدار میں ہے، کہ اگر آپ مشغول ہو گئے، تو کئی سال تک آپ کو دوسرے کام کی احتیاج پیش نہیں آئے گی۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کم از کم ایک خوش نویس سے اس طرح کی معاملت کر لی جائے، کہ وہ بے فکر ہو کر میرا کام انجام دیتا رہے۔ یہ معاملت خواہ کام کی معینہ اُجرت پر ہو، خواہ ماہوار تنخواہ پر، ہر صورت کے لئے میں تیار ہوں۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہوگا کہ مجھ میں اور خوش نویس میں بُعد حائل نہ ہو، خوش نویس میرے ساتھ رہے اور مجھے کاپیوں کی صحت اور نگرانی کا فوری موقع ملتا رہے۔

کیا آپ اس کے لئے تیار رہیں؟ اگر تیار رہیں تو تفصیلات سے مطلع کیجئے میں سرِ دست آپ کو کلکتہ میں بلوالوں گا اور اپنے ہی یہاں رکھوں گا۔ آپ کام شروع کر دیں گے اور جوں جوں کاپیاں تیار ہوتی جائیں گی، بلا تاخیر چھپتی رہیں گی۔ چھپائی کا انتظام کرا لیا ہے۔

آپ اگر چند ماہ کے بعد مکان جانا چاہیں گے، تو معین ایام کے لئے ضرور

ضرور کام لے لیں۔ اس میں تأمل نہ کریں۔ مجھے اگر دیر ہوتی جب بھی امید ہے، جولائی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یعنی جولائی کے اوائل میں ضرور روانہ ہو جاؤں گا اور آپ کو اطلاع دوں گا۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۷۳)

(۵)

۱۹۔ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۳ جون ۴۳ء

مُحِبّی فی اللہ! السلام علیکم۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ بلاشبہ آپ کو کام لے لینا چاہیئے، تاکہ وقت کا نقصان نہ ہو، جیساکہ لکھ چکا ہوں۔ میرے کام میں بوجوہ تاخیر ہوگی۔ کم ازکم یہ ماہ ضرور نکل جائے گا۔ اگر آپ کو ایسا کام لینا پڑا کہ جلد فرصت نہ نکل سکی، تو یقیناً مجھے شکایت کا حق نہ ہونا چاہیئے۔ آپ طیّار تھے، بُلانے میں میری جانب سے تاخیر ہوئی اور ہو رہی ہے۔ آپ اس کے لیے کسی طرح ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔

ابوالکلام

(۷۴)

(۶)

کلکتہ

۱۴ جون ۴۳ء

مُحِبّی فی اللہ! کارڈ پہنچا۔ مجھے اس تاخیر کا جتنا رنج ہے، اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ لیکن بعض مجبور کن حالات نے اسے گوارا کرنے پر مجبور کر دیا۔

(۷۱)

(۳)

۱۹۔ اے بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۲۴ ۵ ۴۳ء

مُحبیّ فی اللہ! السلام علیکم

قرآن کی کتابت کا نمونہ جو آپ نے بھیجا تھا مل گیا۔ دہلی میں آپ نے کہا تھا کہ جون میں آپ وہاں کے کاموں سے فارغ ہوجائیں گے۔ لیکن اب میں ارادہ کررہا ہوں کہ چند ماہ کے لئے مسوری چلا جاؤں اور وہیں آپ کو بُلاؤں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے تاخیر ہوئی تو جون کے آخر میں روانہ ہوں۔ پس آپ مجھے لکھیں کہ وہاں آپ کی مشغولیت کا کیا حال ہے، اور کب تک فارغ ہوں گے؟

ابوالکلام

(۷۲)

(۴)

۱۹۔ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۹ ۶ ۴۳ء

مُحبیّ فی اللہ! جواب میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ ڈاک کئی دنوں کے بعد آج دیکھی۔ پچھلے سفر کے بعد طبیعت بے حد مضمحل ہوگئی ہے، اور اختلاج کی شکایت عود کر رہی ہے۔ ڈاکٹر مصر ہیں کہ کسی سرد مقام پر چلا جاؤں۔ لیکن علائق مختلف صورتوں میں نمایاں ہو کر مانع ہو رہے ہیں۔ بہرحال میں نے مصمّم ارادہ کر لیا ہے کہ تین چار ماہ کے لئے بالکل یکسو ہو کر مسوری یا نینی تال میں مقیم ہو جاؤں۔ چاہتا ہوں کہ وہیں آپ کو بھی بُلا لوں۔ آپ نے لکھا تھا کہ بصورت مہلت آپ کام لے سکتے ہیں۔ آپ

تھی، تو میں نے اسی وقت دہلی تار بھیج دیا تھا کہ حسب معمول سنّو ریم اور بھیج دیں، اور خیال یہ تھا کہ انھوں نے بھیج دیا ہوگا۔ لیکن پہلے آپ کے خط موسومہ سیف صاحب[1] سے اور پھر خود کاغذ والے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے نہیں بھیجا، اور وہ منتظر رہے کہ جب رقم پہنچ جاتے تب بھیجیں۔ افسوس ہے کہ اس طرح یہ وقت نکل گیا، لیکن جتنے فرموں کا کاغذ موجود تھا، وہ بھی تو نہیں چھپے۔ کاش وہی چھپ جاتے۔

بہرحال اب کاغذ بھیجا جا رہا ہے۔

فہرست کا ابتدائی حصّہ میں نے اس لئے نہیں بھیجا کہ کاپیاں ابھی پڑی ہیں، جمی تک نہیں، مزید کتابت میں اتنی جلدی کیوں کی جاتے اور فارم آجائیں تو مکمل فہرست بن جاتے۔

اب آپ کے کارڈ سے معلوم ہوا کہ دو کاپیاں اور خراب نکلیں۔ براہِ عنایت ان کی کتابت میں صحت کا التزام کیجئے، کیونکہ انھیں یہاں منگوا کر صحیح کرنا غالباً ممکن نہ ہوگا۔

روپیہ پرسوں پیر کے دن بھیج دیا جائے گا۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

کلکتہ - ۴ جولائی ۱۹۳۴ء

---

[1] سیف صدیقی مرحوم، مولانا کے ایک معتقد اور مکتوب الیہ کے دوست۔ مولانا کے خطبات جمعات وعیدین کے مرتب۔

اگر آپ ابھی لاہور میں رہیں گے، تو میں انشاءاللہ اگست کے اندر اندر آپ کو اطلاع دے دوں گا کہ میرے کاموں کی کیا صورت ہے۔

والسلام علیکم۔

ابوالکلام

تاج کمپنی سے ترجمان القرآن کے لئے نہیں بلکہ صرف تفسیر سورۂ فاتحہ کے لئے گفتگو ہوئی تھی، تفسیر کا جو حصہ ترجمان القرآن میں نکلا ہے، وہ خلاصہ ہے۔ پوری تفسیر مع بعض اضافوں کے موجود ہے، اور اس کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کی اشاعت کا حق انھیں دے دیا جائے۔ لیکن میں نے اس لئے انکار کر دیا کہ وہ معاوضہ کی رقم کا فوری انتظام نہیں کر سکتے اور میں پسند نہیں کرتا کہ بغیر اس کے کوئی معاملت کروں۔

جس دوسرے پریس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس نے اس وقت تک کوئی اس طرح کی خواہش نہیں کی ہے۔

(۷۵)

(۷)

[اکتوبر ۱۹۳۴ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک منشی عبدالقیوم صاحب خوش نویس مولانا آزادؒ کی خدمت میں رہے۔ اس دوران میں ترجمان القرآن جلد دوم کی کتابت کی۔ آخر میں کچھ دنوں کے لئے بجنور آ گئے تھے جہاں مدینہ پریس میں ترجمان القرآن چھپ رہا تھا۔ بجنور کا قیام محض تصحیح و طباعت کی بعض آسانیوں کے پیش نظر تھا۔ ذیل کا مکتوب مولاناؒ نے آپ کے نام بجنور ہی کے پتہ پر بھیجا تھا۔]

مُحبّی فی اللہ! جب پچھلی دفعہ کاغذ کی نسبت پریس سے اطلاع ملی

میں نہیں چاہتا کہ ہاتھ خالی نہ ہو اور آپ اس کام میں بھی ہاتھ لگا دیں، ضروری ہے کہ پوری طرح وقت دیا جائے۔ بہرحال صورت حال سے مطلع کیجئے، اگر کچھ اور دیر ہے تو مضائقہ نہیں، لیکن آپ خاموش کیوں ہیں ؟

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۷۸) (۱۰)

کلکتہ

۳۱ مئی ۳۹ء

جبّی فی اللہ! آپ کے نام پہلی خط بھیجا گیا جامعہ کے پتے سے، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ شاید آپ مرادآباد میں ہیں میں اب بلا تاخیر جلد سوم کا کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔ مسودہ نئی ترتیب کے ساتھ تیار ہے۔ اگر آپ مستعد ہیں تو فوراً اطلاع کیجئے۔ سورۂ نور کے اوراق آپ کے پاس ہیں، ان کی کتابت از سرِ نو شروع کر دیجئے۔ مزید مسودہ فوراً بھیج دیا جائے گا۔

خط دیکھتے ہی صورتِ حال سے مطلع کیجئے۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام

نوٹ :۔ مکتوب نمبر ۸، ۹ اور ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمان القرآن جلد سوم بالکل تیار تھا، مولانا منتظر تھے کہ عبدالقیوم صاحب خوش نویس کا ہاتھ خالی ہو تو ان کے حوالے کر دیا جائے اس کے لئے وہ خاصے بے چین نظر آتے ہیں۔ اس کی تصدیق، نقشِ آزاد اور تبرکاتِ آزاد کے بعض مکاتیب سے بھی ہوتی ہے۔ ان واضح تصریحات اور مولانا ہی کے تحریری شواہد کے بعد بعض حضرات کا یہ بیان کہ جلد سوم لکھی ہی نہیں گئی اور وہ مولانا کے ذہن ہی میں ان کے ساتھ گئی، انتہائی تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے۔

(۷۶)

(۸)

کلکتہ

۱۸/۴/۳۷ء

جبیّ فی اللہ! آپ اب تیار ہیں کہ ترجمان القرآن جلد سوم کی کتابت فوراً شروع کر دیں۔ بلا تاخیر جواب دیجئے تاکہ مسودہ بھیج دوں۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

اگر کوئی ایسا کام ہاتھ میں لے لیا ہے کہ اب اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے اور وہ کام چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تو بلا تامل لکھ دیں تاکہ صورتِ حال کے مطابق انتظام کیا جائے۔

(۷۷)

(۹)

کلکتہ

۱۷/۶/۳۷ء

جبی فی اللہ! تعجب ہے کہ آپ خط کا جواب نہیں دیتے۔ میں آپ پر اعتماد کئے بیٹھا ہوں۔ کاپیوں کے لئے عمر بھی بھیج دیتے تھے، لیکن آپ نے رسید تک نہ بھیجی۔ کیا آپ کا ہاتھ ابھی تک خالی نہیں ہوا؟ براہِ عنایت صورتِ حال سے مطلع کیجئے۔ میں نے لکھا تھا کہ جوں ہی کام ختم ہونے پر آئے، مجھے اطلاع دیجئے، تاکہ مسودہ بھیج دوں، لیکن ایک ماہ گزر گیا، ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔ آپ نے لکھا تھا کہ مئی کے اواخر تک کا کام ہاتھ میں ہے، اوائل جون سے ہاتھ خالی ہو جائے گا اب تو جون بھی ختم ہونے پر آیا ہے۔

(۸۱) (۱۳)

گلمرگ، کشمیر
۶ر اگست ۵۳ء

عزیزی! خط پہنچا۔ آج دو مکتوب رجسٹرڈ اور بھیجتا ہوں۔
مکاتیب کی تاریخوں کی ترتیب دیکھ لیجیے گا۔ بہ ترتیب نقل کرنا چاہیئے۔

کاپیوں کی تصحیح کے لئے یہ صورت پیش نظر ہے کہ جب واپس ہوں تو آپ کو تار کے ذریعہ اطلاع دے دوں، آپ تمام کاپیاں لے کر لاہور آجائیں۔ وہاں چند دن ٹھہروں گا اور تمام کاپیاں دیکھ لوں گا۔ آپ ساتھ ساتھ تصحیح کرتے جائیے گا۔ پھر آپ وہیں لاہور میں کسی پریس کو دے دیں یا مدینہ[۱] بھیج دیں۔

نظریۂ اضافیہ کا میں نے احمد نگر[۲] میں از سر نو مطالعہ کیا اور بعض مسودات مرتب بھی ہوئے، لیکن وہ مزید وقت کے محتاج ہیں۔

غبار خاطر کے لئے دہلی کے ایک صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب کا خط لے کر آئے تھے۔ معلوم نہیں وہ یکمشت قیمت دے کر تمام ایڈیشن لے سکیں گے یا نہیں، اگر آمادہ ہوئے تو میں پہلا موقع انھیں دوں گا[۳]۔

ترجمان القرآن جلد اوّل کا نسخہ معہ مسودات میں نے میاں افتخار الدین[۴] کو دے دیا ہے کہ اپنے منشی کے ذریعے معاملہ کرلیں، غالباً آج کل میں ہوجائے گا۔

والسّلام

ابوالکلام

---

[۱] مراد مدینہ پریس، بجنور ہے۔ [۲] مراد قلعہ احمد نگر ہے جہاں مولانا نے اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ قید میں بسر کیا تھا۔ [۳] ایک صاحب سے مراد جناب علاء الدین خالد صاحب ہیں، جو ان دنوں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کے ایک شریک تھے۔ اور اب اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی کے مالک ہیں۔ [۴] میاں افتخار الدین مرحوم پاکستان کے مشہور کمیونسٹ لیڈر۔

(۷۹) (۱۱)

وائسریگل لاج ۔ شملہ
۲ر جولائی ۱۹۴۵ء

عزیزی! خط پہنچا ۔ ایک تار بھیج چکا ہوں ۔ کہ شملہ آ کر مل لیجئے ۔ اگر آپ ابھی روانہ نہیں ہوئے ہیں تو روانہ ہو جائیے ۔ مجھے بہت ضروری بات آپ سے کرنی ہے ۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۸۰) (۱۲)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون الہ آباد

۲۸ جولائی ۱۹۴۵ء

عزیزی! میں تو سمجھتا تھا آپ نے کتابت فوراً شروع کر دی ہو گی ۔ لیکن معلوم ہوا کہ مسطر کا انتظام اب ہوتا ہے ۔ بہر حال اب تیز رفتاری سے کام کیجئے ۔ دو مکتوب چند دن ہوئے بھیج چکا ہوں ۔ دو آج بھیج رہا ہوں ۔ آج کشمیر جا رہا ہوں ۔ وہاں کا پتہ گلمرگ کشمیر رہے گا وہاں سے بقیہ مسودہ بھیج دوں گا ۔

اگست کے آخر میں کشمیر سے واپس ہوں گا ۔ اس وقت تک آپ مراد آباد ہی میں رہ کر کتابت کرتے رہئے[1] ۔ کشمیر سے واپسی پر یکسوئی ہو جائے گی اور میں آپ کو فوراً بلا لوں گا ۔

اور تمام باتوں سے مطمئن رہئیے ۔

ترجمان القرآن جلد اوّل عنقریب زمزم والوں[2] کو مل جائے گا ۔ والسلام علیکم ۔

ابوالکلام

---

[1] مولانا کے مکاتیب کا مجموعہ "غبار خاطر" ان دنوں زیر کتابت تھا، اسی جانب اشارہ ہے [2] ترجمان القرآن جلد اوّل کے دوسرے ایڈیشن کے لئے زمزم کمپنی لمیٹڈ، لاہور سے معاملہ طے پا گیا تھا ۔

(۸۳)

جناب خواجہ عبدالوحید صاحب مدظلہ کے نام

(۱)

کلکتہ

۱۲/۱۰/۳۴ء

حبیّ فی اللہ! آپ کا خط پہنچ گیا اور کاغذات بھی مل گئے، لیکن فرصت کا منتظر رہا کہ باطمینان جواب لکھوں۔ آپ نے اپنی انجمن[1] کی سرگرمیوں کا جو حال لکھا ہے اسے پڑھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ خدمتِ اسلام و ملت کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

باقی رہا قرآن مجید کے لئے مضمون کا معاملہ تو میرے خیال میں یہ کسی طرح موزوں نہ ہوگا کہ اس کے ساتھ کوئی مضمون شائع کیا جائے۔ اس قسم کے مباحث کا محل تفسیر ہو سکتی ہے، نہ کہ قرآن مترجم جو کہ تلاوت کے لئے شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اگر کوئی مضمون شائع کیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ وہ جامع و حاوی نہیں ہو سکتا۔ کسی ایک موضوع ہی پر ہوگا جیسا کہ آپ نے تجویز کیا ہے اس صورت میں سوال پیدا ہوگا کہ صرف یہی موضوع کیوں اختیار کیا گیا اور بیشمار مواضع کیوں ترک کر دیئے گئے؟ اور اس کی کوئی معقول تعلیل ہو نہیں سکتی۔

آپ نے قرآن کا جو اعلان مطبوعہ بھیجا ہے، اس میں چند باتیں تصحیح طلب معلوم ہوئیں خیال ہوا کہ آپ کو لکھ دوں ممکن ہے کام آئیں۔

یہ واقعہ کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ، قدسی رح کے مصرعہ:

من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل

---

[1] مراد انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ، لاہور ہے۔

(۸۲)

(۱۴)

دہلی
۲۳؍ اگست ۱۹۴۶ء

عزیزی!

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے یہ فروگذاشت محسوس کر لی اور درستگی کا موقع دیا۔ آیت کا ترجمہ آپ کے خط پر لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ درج کر دیجیے۔[1]

لاہور لکھیے کہ جتنے فارم چھپ چکے ہوں، وہ مجھے رجسٹرڈ بلا تاخیر بھیج دیں۔ یہ بات طے پاگئی تھی کہ جوں جوں کاپیاں جمتی جائیں گی، وہ مطبوعہ فارم بھیجتے رہیں گے۔

والسّلام۔

ابوالکلام

---

[1] ترجمان القرآن جلد اوّل۔ کے دوسرے ایڈیشن کی مکتوب الیہ کتابت کر رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ آیت کے ایک حصہ کا ترجمہ رہ گیا ہے، انھوں نے مولانا رح کو خط لکھا۔ مولانا نے سہو کا اعتراف کر لیا اور اس ٹکڑے کا ترجمہ لکھ کر بھیج دیا۔

باقی رہا مطالبِ قرآن اور اس کی مہمات کا معاملہ تو اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ اس باب میں ان کے سامنے عام سطح سے کوئی بلند تر مقام موجود نہ تھا۔ انھوں نے کہیں بھی "جلالین و بیضاوی" سے آگے قدم نہیں بڑھایا، اس لئے وہ تمام کمزوریاں ان کے تفسیری اختیارات میں موجود ہیں، جو عام طور پر متداول تفاسیر میں پائی جاتی ہیں۔

یہی حال حواشیٔ "موضح القرآن" کا ہے کہ ضعیف قصوں اور اسرائیلی روایتوں سے بھی انھوں نے احتراز نہیں کیا۔ مثلاً ہاروت و ماروت کی کہانی اور طالوت کا اس طرح منتخب ہونا کہ ایک لکڑی کے گز کے پیمانے سے ٹھیک اُترے۔ حالانکہ قرآن کہتا ہے بسطۃ فی العلم والجسم، وغیر ذٰلک۔ ان کے بعض حواشی نے منکرین اسلام کو اعتراض کا قوی موقع دیا۔ مثلاً الم نشرح میں وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ کا یہ ترجمہ کرنا کہ "گناہوں کا بوجھ دور کر دیا" پادری فنڈر نے آنحضرت صلعم کی عصمت کے خلاف اس سے تشبث کیا تھا۔[1]

اصل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کا معاملہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے، اور جب تک علماء میں متاخرین مفسرین و مترجمین کے لئے تقلیدی خوش اعتقادی باقی ہے، حقیقت کی راہ صاف نہیں ہو سکتی۔ والقصۃ بطولہا و لا یعقلہا الا العارفون۔

مولانا عبید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ[2] اِدھر ایک عرصہ سے مکہ معظّمہ میں مقیم ہیں، آپ

---

[1] حضرت شاہ عبد القادر علیہ رحمتہ کے ترجمہ و تفسیر "موضح القرآن" کے بارے میں یہ پہلی بے لاگ رائے ہے جو علم میں آئی ورنہ ہر کسی نے اس کی مدح و ستائش ہی کی ہے۔

[2] مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم اور امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ کے مشورہ سے ہندوستان چھوڑا اور کابل تشریف لے گئے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں روس گئے اور ماسکو میں تقریباً ایک سال قیام کیا، وہاں سے ۱۹۲۳ء میں ترکی تشریف لے گئے اور تقریباً ساڑھے تین سال تک وہاں قیام کیا اور جدید ترکی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں حجاز تشریف لے گئے اور مکہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ تقریباً ۱۲ سال مکہ معظمہ میں قیام فرمانے کے بعد ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی کے ساحل پر قدم رکھا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا اتنی مدت تک ہندوستان سے باہر رہنا (باقی ص ۱۹۸ پر)

میں تصرف کرکے کہا کرتے تھے

من نیز حاضری شوم تفسیر قــــرآن در بغل

محل نظر ہے اور ممکن ہے التباس ہوا ہو۔ دراصل واقعہ جو منقول ہے وہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ شاہ صاحب نے تفسیر لکھنا شروع کی تھی جو تین چار پاروں سے زیادہ نہ لکھی جا سکی۔ ان کے ملفوظات میں ہے کہ انتقال سے پہلے ربیع الاول کی مجلس وعظ میں قدسیؒ کا مندرجہ صدر شعر بہ تصرّف پڑھا تھا اور اپنی تفسیر کی طرف اشارہ کیا تھا، عجب نہیں اس معاملہ کو کسی نے شاہ عبدالقادرؒ کی طرف منسوب کر دیا ہو۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ شاہ صاحب نے ترجمہ چالیس برس میں کیا، بھلا چالیس برس کی اس میں کیا بات تھی؟ جو واقعہ صحیح طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ ہے کہ شاہ صاحب نے یہ ترجمہ سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش سے کیا، سید صاحب کو تحصیل علم کا موقع نہیں ملا تھا، انھوں نے چاہا تھا کہ قرآن مجید کے مطالب اردو میں معلوم کریں[1]۔ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی تھا، اس لئے انھوں نے شاہ عبدالقادرؒ سے درخواست کی کہ بامحاورہ ترجمہ کر دیجیے۔ سید صاحب زینت المساجد کے حجرہ میں رہا کرتے تھے۔ جب ترجمہ مکمل ہو گیا تو حواشی لکھے۔

شاہ صاحبؒ کی سب سے بڑی خدمت جس میں اردو زبان ہمیشہ ان کی احسان مند رہے گی، یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت قرآن کا ترجمہ کیا، جب زبان بالکل طفولیت کی حالت میں تھی، اور نثر نویسی بھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو زبانوں کے ڈھالنے والے ہوتے ہیں۔

---

[1] حالانکہ صحیح نہیں۔ سید احمد شہید کی پیدائش ۶ صفر ۱۲۰۱ھ کو ہوئی اور شاہ صاحبؒ کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہو چکا تھا جب سید صاحبؒ زیادہ سے زیادہ چار ساڑھے چار برس کے ہوں گے پھر ان کی فرمائش کا کیا موقع تھا؟ شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں سید صاحب پہلی مرتبہ اس وقت پہنچے جب ان کی عمر کم و بیش اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ بیان مولاناؒ کی سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے۔ خود انھوں نے تاریخوں کی تحقیق نہیں فرمائی تھی۔

(۸۴) (۲)

۱۹۔ اے بالی گنج، سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۶ر۷ر ۳۶ء

جی فی اللہ! السلام علیکم خط پہنچا۔ سورۃ انفال نکال کر دیکھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ واقعی "بِاِذْنِ اللّٰہِ" کا ترجمہ رہ گیا ہے۔ ترجمہ یوں ہونا چاہیئے: "وہ دو سو دشمنوں پر خدا کے حکم سے غالب رہیں گے۔" دیکھئے! تصحیح و مقابلہ کا معاملہ کس قدر مشکل ہے۔ اس مرتبہ کاپیاں میں نے خود دیکھیں لیکن دیکھتے وقت نظر چوک کر گئی، اور یہ ٹکڑا رہ گیا۔ اگر کوئی اور مقام ایسا نکلے تو مجھے ضرور مطلع کریں۔

آپ کے احباب کا خیال درست ہے لیکن اس خط کی عبارت پھر پڑھیئے، ان سوالات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر بات کا ایک محل ہوتا ہے۔ اس سے اسے باہر لے جانا درست نہ ہوگا۔ ایک شخص نے لکھا مجھے ایک نئے ظہور پر ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے اور قلب مضطرب ہے کہ کہیں نجات سے محروم نہ رہ جاؤں؛ میں نے اسے ایک موٹی سی بات لکھ دی۔ جس کی بنا پر وہ فوراً فیصلہ کرسکتا ہے یعنی قرآن کلام الٰہی ہے یا نہیں، اور شرائط ایمان اس میں بیان کردیئے گئے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو قرآن کو دیکھ لے، کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ آیندہ چل کر محمد رسول اللہؐ پر ایمان لانا کافی نہ ہوگا، ایک نئی رسالت پر بھی ایمان لانا ضروری ہوگا؟ صرف قرآن کا حوالہ اس لئے دیا کہ قاطع و فیصلہ کن ہے۔ ورنہ ایسا حکم حدیث میں بھی موجود نہیں۔

اسی طرح انھوں نے لکھا تھا کہ دین کی "تکمیل کے لئے ایک نیا نزول ہونے والا ہے۔ میں نے لکھا یہ صحیح نہیں۔ دین مکمل ہوچکا، اب تکمیل دین کے لئے کسی

سے خط و کتابت ہوتی ہے یا نہیں؟ کئی سال ہوتے خواجہ عبدالحی[1] صاحب۔ حج کے لئے گئے تھے، ان کا بیان ہے کہ میرے نام مولوی صاحب نے کوئی خط انھیں دیا تھا جو مجھے دینا بھول گئے اور اب انھیں ملتا بھی نہیں۔ اس معاملہ کی اطلاع انھوں نے دو برس کے بعد مجھے دی تھی۔

مولوی صاحب نے نامہ بر اچھا چُنا تھا۔

بہرحال ان کے حالات کی اگر کچھ تفصیلات معلوم ہوں تو مطلع کیجئے۔[1] والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

ابوالکلام

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۷) رہنا اختیاری نہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی ایک عظیم سیاسی مشن پر ہندوستان سے نکلے تھے، لیکن بعد میں برٹش حکومت نے ہندوستان میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا، بالآخر اوائل ۱۹۳۹ء میں ان کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی تھی۔

[1] خواجہ عبدالحی صاحبؒ سابق استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیام پاکستان کے بعد لاہور تشریف لے آئے تھے۔ اسلامیہ کالج میں شعبۂ اسلامیات کے صدر کی حیثیت سے ایک مدت تک خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا۔

(۸۵)

جناب قاضی محمد عبد الغفار صاحب کے نام

(۱)

کلکتہ

۹/ جون ۱۹۳۶ء

صدیق العزیز! دفتر سے ترجمان القرآن جلد دوم کا اعلان اخبارات کو بھیجا گیا تھا کہ ایک مرتبہ شائع کر دیں۔ اخبارات میرا اعلان شائع کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے دفتر سے معلوم ہوا کہ آپ کے اخبار نے صرف اتنا ہی نہیں کیا جتنی کہ اس سے خواہش کی گئی تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے لئے سرگرمی دکھائی یعنی عرصہ تک اعلان شائع ہوتا رہا۔

کسی اخبار میں ایک مرتبہ سے زیادہ کا نکل جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اس طرز عمل میں محبت و اخلاص کی جو جھلک نظر آئی وہ یقیناً اہمیت سے خالی نہیں۔ میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔

میں اپنی کتابیں صرف چند دوستوں اور عزیزوں کو بھیجا کرتا ہوں۔ میں نے اب اس میں ایک کا اضافہ کر لیا ہے، اور ترجمان القرآن جلد دوم کا نسخہ مرسل ہے۔ امید ہے مع الخیر ہوں گے۔ السلام علیکم۔

ابوالکلام

میں یہ اس لئے نہیں بھیج رہا ہوں کہ اخبار میں ریویو کیا جائے۔ ریویو کے لئے میں اخبارات کو زحمت نہیں دیا کرتا، یہ شخصاً آپ کے لئے تحفہ ہے۔

نزول کی گنجائش نہیں۔ یہاں جو نفی کی گئی ایسے ظہوروں اور نزولوں کی جو تکمیلِ دین کے لئے ہوں، نہ کہ اس نزولِ مسیح (علیہ السلام) کی جس کی خبر بہ سلسلۂ آثار و مقدماتِ قیامت دی گئی ہے۔ بلاشبہ اس باب میں روایات موجود ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ان سے انکار کیا جائے۔

بات آپ پر واضح ہوئی یا نہیں؟ ایک مسئلہ شرائطِ ایمان کا ہے، یعنی ایمان کے لئے دو شہادتیں جو چلی آتی ہیں، ان کے علاوہ بھی کوئی تیسری شہادت پیدا ہونے والی ہے یا نہیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کیا کیا باتیں ماننی چاہئیں؟ یہاں دوسرے مسئلہ سے کوئی بحث نہیں ہے۔ بلاشبہ ایک مسلمان کا فرض ہے کہ جو کچھ قرآن و حدیث میں بتایا گیا ہے، اس پر ایمان رکھے۔ لیکن شرائط میں اب کوئی نیا اضافہ نہیں ہو سکتا۔

ابوالکلام

(۸۷) (۳)

نئی دہلی
۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

صدیقی! ایک خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا جب تک مجوزہ ترمیمات کا مسودہ سامنے نہ آئے، مشکل ہے کہ کوئی آخری رائے صورتِ حال کی نسبت قائم کی جا سکے۔ اسٹیٹ کانگریس کی تجویز کے پیچھے یہ خیال کام کر رہا ہے کہ اگر اصلاحات قابل قبول نہیں بنائی جا سکتیں تو پھر ان کا نفاذ ملتوی کر دیا جائے۔ یہی رائے گاندھی جی کی بھی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجوزہ ترمیمات کا مسودہ آ جاتے تو پھر رائے قائم کروں اور اس سلسلے میں صحیح مشورہ دے سکوں۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں ایک معاملہ کی نسبت اشارہ کیا تھا مگر مزید غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ سر دست آپ اس طرح کی کوئی بات وہاں نہ چھیڑیں۔ جب آپ ملیں گے تو زبانی باتیں ہوں گی۔

والسّلام

ابوالکلام

(۸۸) (۴)

نئی دہلی
۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

صدیقی! خط مورخہ ۲۵ر ابھی وصول ہوا۔ میرے لئے نہایت خوشی کا باعث ہو گا کہ مرزا صاحب[۱] سے ملاقات کا موقع پیدا ہو لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ۸ر ۹ر نومبر کو دہلی میں ہوں گا یا دہرہ دون میں۔ علاوہ بریں

---

[۱] سر مرزا اسماعیل جب کہ وہ حیدرآباد کے صدر اعظم نہیں بنے تھے۔

(۸۶) (۲)

پونا

۱۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء

صدیقی! مسز نائیڈو کے ذریعہ آپ کا خط موصول ہوا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ جو بات آپ نے لکھی ہے وہ میرے پیش نظر ہے اور اس کے لئے ضروری انتظامات شروع کرادیئے گئے ہیں۔ جواہر لال کے بیان کا مطلب صرف یہ ہے کہ کانگریس یہ میدان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں جو کچھ کرنا ہے وہ غور و فکر اور مشورۂ احباب کے بعد مجھے کرنا ہے۔ اور اس پر اس طرح سرسری اور اجمالی بیانات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں احباب سے مشورہ کرنے کے لئے ضرور وقت نکالوں گا۔ ۱۷ر کو دہلی میں غیر لیگی جماعتوں کا ایک بورڈ بن رہا ہے جس کا پہلا جلسہ ۲۵ر کو ہوگا۔ جب میں بمبئی سے دہلی جاسکوں گا۔ بہرحال بمبئی میں بھی مشورہ و ملاقات کا موقع ہے۔ ۲۳ر تک میں وہاں ہوں اور اس کے بعد بھی ایک دن ٹھہر سکتا ہوں۔ کیا آپ بھی آرہے ہیں؟ بہت بہتر ہوگا اگر آپ آجائیں۔ اس سے بھی زیادہ بہتر یہ ہو کہ ۲۵ر اور اس کے بعد کی تاریخوں میں دہلی آئیں، جہاں یکسوئی اور نسبتاً فرصت ہوگی۔ مقصود یہ ہے کہ آئیے اور ملئے خواہ بمبئی ہو یا دہلی۔

زمن گرت نہ بود یا در انتظار بیا!

بہانہ جوئے مباش و ستیزہ کار بیا

آپ سے ملے ایک زمانہ ہوگیا۔

ابوالکلام

(۸۹)

ساغر نظامی کے نام

عزیزی! "بادۂ مشرق"[1] دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ آپ نے اس کی طباعت میں پوری شاعری کی ہے۔ گویا اس اعتبار سے بھی اسے شاعری کی نمود سمجھنا چاہیئے۔ اب اس پھول میں رنگ اور بُو دونوں جمع ہو گئے ہیں۔

زمانہ اُردو شاعری سے مطالبے رکھتا ہے، جو ابھی تک پورے نہیں ہوئے۔ آپ کی شاعری نشو و نما پا رہی ہے کہ ان تقاضوں کا جواب دے۔ اگر آپ نے اس جوہرِ قابل کی حفاظت کی تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اپنا مستقبل اپنے سے زیادہ فاصلے پر نہیں پائیں گے۔ "بادۂ مشرق" اسی مستقبل کا اعلان ہے۔

مجھے معلوم نہیں کہ کتاب کی رفتارِ اشاعت کا کیا حال ہے، مگر میں ان تمام لوگوں سے جو اُردو علم و ادب سے کچھ بھی رسم و راہ رکھتے ہیں، سفارش کروں گا کہ اس خوبصورت مجموعہ کا ایک نسخہ ضرور لیں۔ والسّلام

ابو الکلام

کلکتہ - ۲۸ مئی ۳۶ء

---

[1] ساغر نظامی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔

جامعہ ملیہ سے معلوم ہوا ہے کہ مرزا صاحب تقریب جوبلی میں شریک ہوں گے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تقریب ۱۵ر نومبر[1] کو ہونے والی ہے اور غالباً مجھے بھی دہرہ دون سے اس کے لئے آنا پڑے، اس موقع پر ملاقات کی صورت نکل سکتی ہے۔

کمزوریٔ صحت کی وجہ سے رات کا وقت میرے لئے موزوں نہیں ہوتا، ایسا ہو سکتا ہے کہ آصف علی، مرزا صاحب کو لنچ پر یا چائے پر بُلالیں اور ملاقات کی صورت نکل آئے۔ بہر حال کوئی نہ کوئی موقع ملاقات کا نکل آئے گا۔

اگر ۸ر ۹ر تک میرا قیام یہاں رہا تو وہ موقع کام میں لایا جا سکتا ہے۔ نہیں تو جامعہ ملیہ کی تقریب کا موقع، بشرطیکہ مرزا صاحب اس میں شریک ہو رہے ہوں۔

ایک خط پرسوں بھیج چکا ہوں۔

والسلام

ابوالکلام

---

[1] مولاناؒ کے قلم سے یہاں اکتوبر نکل گیا تھا جو صحیح نہ تھا۔

لکھا گیا تھا، اس لئے اس کا جواب بھی کسی ایک شخص کے نام نہ تھا، بلکہ مکتوب الیہم اخوان ثلثہ تھے۔]

۱۹۔ اے بالی گنج۔ سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۳۰/ جولائی ۳۶ء

جناب من! السلام علیکم

آپ کی تجویز بہت اچھی ہے۔ اگر اتنی ہی بات کا نظم قائم ہو جائے تو بہت کچھ..... ہو سکتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اپنی مساعی میں کامیاب ہوں۔ البتہ میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس غلطی سے اپنی نگرانی کیجئے۔ تمام تر ہمت اس میں خرچ کیجئے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے حلقے میں بھی ایک محکم وجاری نظم قائم ہو جائے۔ جوں ہی تجویز نے عملیت کا لباس پہن لیا، اعلان و توسیع کی راہ خود بخود باز ہو جائے گی۔

اگر آپ اخبار نکلنے اور ڈھنڈورا پیٹنے کی فکر میں رہے، پھر تجویز ہی میں رہ جائیے گا۔ کام کچھ نہ ہوگا۔ والعاقبۃ للمتقین۔

ابوالکلام

جواب کے لئے ٹکٹ کی ضرورت نہ تھی۔

(۹۰)

مولانا عبدالہادی سکندر عرب معلّم مکّہ مکرّمہ
مولانا حامد علی ندوی اور جناب مجتبیٰ احمد بی۔ایس سی کے نام

[اوائل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں چند نوجوان دردمندانِ ملّت نے تنظیم زکوٰۃ اور قیام بیت المال کا ایک خاکہ بنایا تھا اور طے کیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی اس راہ سے خدمت کی جائے۔ اس کی ابتدا، چٹکی آٹا فنڈ سے کی گئی تھی۔

اس سلسلے میں اپنے مقاصد کی اشاعت، نظم کے قیام اور توسیع کار کی غرض سے ایک ہفتہ وار رسالہ "ناخدا" کے اجراء کی تجویز بھی تھی۔

مکتوب الیہم جو اس تنظیم زکوٰۃ و بیت المال کے کرتا دھرتا تھے، انھوں نے ۲۳ جولائی ۱۹۳۶ء کو حضرت مولانا آزاد علیہ رحمۃ کی خدمت میں تنظیمِ زکوٰۃ، قیامِ بیت المال کے اغراض و مقاصد اور ان کے حصول و توسیع کار کی غرض سے رسالہ کے اجراء کے ارادہ کا اظہار کیا اور حضرت مولاناؒ سے مشورہ طلب کیا، جواب میں حضرت مولاناؒ نے ذیل کا مکتوب ارسال فرمایا۔

حضرت مولاناؒ نے اس مکتوب میں جو نصیحت کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ ملک، قوم و ملّت کی خدمت کرنے والا ہر کارکن، اس کو آویزۂ گوش بنالے واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی کام کا ڈھنڈورا پیٹنے کی فکر کی جائے، تو پھر کام رہ جاتا ہے۔

مولاناؒ کی خدمت میں چونکہ چند حضرات کی جانب سے عریضہ

(۹۲)

چودھری خلیق الزماں کے نام

(۱)

۱۳ر مارچ ۱۹۳۸ء

صدیقی!

۳ر فروری سے برابر بیمار رہا اور اب تک بیمار ہوں۔ بمبئی میں جو آپریشن ہوا تھا اس کا زخم اب تک بھرا نہیں۔ زخم کا اندمال کوئی خوبی کی بات نہیں بشرطیکہ زخم دل کا ہو، یہ دل کا نہیں مسوڑے کا زخم ہے۔

ہری پورہ میں مسٹر شعیب، گاندھی جی سے ملنے آئے تھے اور انھوں نے گاندھی جی سے آپ کی نسبت کچھ تذکرہ کیا تھا۔ گاندھی جی نے ان سے کہا تھا کہ مجھ سے مل لیں، لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ کیوں نہیں مجھے صاف صاف کھول کر بتادیتے، بات کیا ہے؟ جو بات ایک لمحے میں ہوسکتی ہے، اس کے لئے پیچ وخم کی راہیں کیوں اختیار کی جائیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ گاندھی جی آپ سے گفتگو کریں؟ آپ کو بُلائیں؟ اچھی بات ہے، نہایت موزوں موقع کلکتہ کا ہوگا۔ ۱۶ر مارچ کو یہاں آرہے ہیں، ۲۳ر تک ٹھہریں گے۔ آپ صدیقی[۱] سے ملنے کے لئے حسب معمول قدیم آجائیے۔ گاندھی جی آپ کو بُلالیں گے۔

اگر مقصود جواہرلال یا سبھاش سے ملنا ہو تو ویسا لکھو اور پیچ وخم کی باتیں دل سے نکال دو۔

والسلام۔

ابوالکلام

---

[۱] عبدالرحمٰن صدیقی مراد ہیں، جو کلکتہ میں رہتے تھے۔

(۹۱)

ڈاکٹر سیّد عبدالعلی صاحب مرحوم کے نام

دہلی

۲۴ ۳/۷ ۴۳ء

اختر حسین   السّلام علیکم   حبیّ فی اللہ

میرے ایک دوست کے عزیز ہیں، سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ضروری ہے کہ ان کا طبی امتحان ہو، غالبًا لکھنؤ ہی میں ہو گا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس سلسلہ میں انھیں وہاں مشورہ کی مدد ملے، آپ کو زحمت دیتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو اس بارہ میں انھیں اپنے مشورہ سے مدد دیجیے۔

ابوالکلام

(۹۵)

جناب محمد یونس خالدی صاحب کے نام

(۱)

[یہ گرامی نامہ اُردو کے مسئلہ کے متعلق ہے۔ حضرت مولاناؒ نے تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو اُردو میں بھی کام کرنے کی ہدایت کی تھی]

کلکتہ

۵۶ء

صدیقی العزیز! خط پہنچا۔ شرمندہ ہوں کہ ہجوم اشغال سے سرکلر بھیجنے میں تاخیر ہوگئی تھی۔ اب بھیجا جا رہا ہے، اور اس کی کاپی پریس کو بھی دی جا رہی ہے۔

والسّلام علیکم۔

ابوالکلام

(۹۶) (۲)

[جناب محمد یونس خالدی صاحب نے حضرت مولاناؒ سے کچھ سوالات کئے تھے، حضرت مولاناؒ نے بوقتِ فرصت قلم اُٹھانے اور جواب لکھنے کا وعدہ فرمایا۔]

۲۶ر جون ۵۴ء

جی فی اللہ! خط پہنچا۔ اس اخلاص و محبّت کے لئے شکرگزار ہوں، اور دعا کرتا ہوں۔ ذرا دم ملے تو تفصیلات کے لئے قلم اُٹھاؤں۔ انشاء اللہ ملاقات کی کوئی صورت جلد نکل آئے گی۔

والسّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۹۳) (۲)

کلکتہ

۲۰ ۳/۸ ۳۸ء

صدیقی العزیز!

ایک خط لکھ چکا ہوں کل آپ کا خط گاندھی جی کے نام دیکھا۔ مہادیو نے جواب بھیج دیا ہے۔ یہ بہتر ہوگا کہ آپ کلکتہ آجائیں۔ آپ کے ملنے کے یہ معنی نہیں ہیں اور نہ ہونے چاہئیں کہ آپ اس سلسلہ خط وکتابت میں کوئی رکاوٹ ڈالنی چاہتے ہیں، جو مسٹر جینا سے ہو رہی ہے بلکہ اپنی جگہ اسی سلسلہ کی ایک چیز ہے اور اصل مقصود اصلاح حال ہے۔

والسلام۔

ابوالکلام

(۹۴) (۳)

۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

صدیقی!

میں نے ابھی اخبار میں آپ کا بیان پڑھا۔ مجھے افسوس ہے کہ گزشتہ رات آپ نے ایک ایسی بات کہی جو آپ کو کہنا نہیں چاہیئے تھی۔ یہ صحیح نہیں کہ جو بات ایک رکن نے اس سلسلے میں کہی تھی وہ علماء کی رائے سے مشروط ہے، جو کچھ کہا گیا، وہ صرف ایک رائے ہی نہیں بلکہ قطعی اور ایک ذمہ دارانہ اقدام تھا۔ یہ بات بھی صحیح نہیں کہ بیان جاری کرنے کے معاملے میں اتفاق رائے نہ تھا۔ آپ خود اس بات پر مصر تھے کہ بیان جاری ہونا چاہیئے اور اس پر سب کے دستخط ہوں۔

ابوالکلام

(۴) (۹۸)

[بہار کے فسادات کے بارے میں اخباری رپورٹوں کی روشنی میں مکتوب الیہ نے مولانا رح کو ایک خط لکھا تھا اور اس میں اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ: جیسے وسیع پیمانے اور ہولناک طریقے پر فسادات ہوئے، حکومت نے ظاہر نہیں ہونے دیا، اخباری رپورٹیں ناکافی ہیں اور فساد سارے صوبہ میں پھیل گیا تھا۔" نیز مکتوب الیہ نے بہار کے فساد زدہ علاقہ میں مسلمانوں کی مدد کے لئے ندوۃ العلماء کے طلباء کے جانے کا ذکر کیا تھا اور اپنے جانے کے بارے میں بھی رائے معلوم کی تھی۔ مولانا رح کا جواب درج ذیل ہے۔]

۲۲۔ پرتھی راج روڈ۔ دہلی۔
۱۹ر نومبر ۱۹۴۶ء

برادرم!

بہار میں جو مصیبت مسلمانوں کو پیش آئی، اس کو گھٹا کر ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ فساد پورے صوبہ میں پھیل گیا تھا، صریح حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ فساد صرف پٹنہ، گیا، بہار شریف اور کچھ بھاگلپور و چھپرا میں رونما ہوا، اور ہولناک نقصانات پیش آئے، آئندہ کے متعلق جتنی کوشش ممکن ہے، کی جارہی ہے۔ ڈاکٹر محمود نے اس موقعہ پر پوری مستعدی، اور جانفشانی سے اپنا فرض ادا کیا ہے۔

ندوہ کے طلباء وہاں جانا چاہتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ ان کے ہمراہ اگر آپ بھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

راقم محمد اجمل خاں
منجانب مولانا ابوالکلام آزاد

(۹۷)　　(۳)

[حضرت مولاناؒ کا یہ مکتوب بہار کے فسادات کے سلسلہ میں ہے۔ مکتوب الیہ نے مصیبت زدگان کی امداد کے لئے جانے کے بارے میں حضرت مولاناؒ کی رائے معلوم کی تھی۔ جواب میں حضرت مولاناؒ کا درج ذیل مکتوب وصول ہوا، جس میں حضرت مولاناؒ نے صاف صاف اپنی رائے بیان فرمادی تھی۔ مکتوب الیہ فرماتے ہیں کہ "اس کے بعد مولاناؒ نے سفر خرچ کا انتظام کیا اور مجھے مخدومی ڈاکٹر سید محمود صاحب کی رہنمائی میں کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔"]

۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء

عزیزی! واقعات کی رفتار کو ہم اپنے دل کی کاوشوں سے پلٹ نہیں دے سکتے۔ صبر و استقلال اور دانشمندانہ حکمتِ عملی ہی کام دے سکتی ہے۔

آپ اگر سفر کرنا چاہیں تو مصارف کا انتظام ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ بحالتِ موجودہ آپ کا دورہ سودمند ہوگا۔

بہار میں حکومت پوری طرح کوشش کر رہی ہے کہ صورت حال قابو میں لائی جائے۔ اس میں مجھے کوئی شک و شبہ نہیں۔ جواہر لال بھی دورہ کر رہے ہیں۔ آج راجندر بابو بھی ہوائی جہاز میں بہار جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد صورتِ حال قابو میں آجائے گی۔ پھر آئندہ قیامِ امن و تحفظ کی قرار واقعی تجاویز کو عمل میں لانے کا موقع نکلے گا۔

ابوالکلام

(۱۰۰)

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام

[حضرت شیخ الاسلامؒ نے مولوی مصباح الاسلام صاحب کی ملازمت کے لئے سفارش کی تھی حضرت مولاناؒ نے درج ذیل جواب دیا۔]

کلکتہ

۲/۸/۳۸ء

حبی فی اللہ! والا نامہ مع مولوی مصباح الاسلام صاحب پہنچا، مولوی صاحب کچھ عرصہ ہوا کلکتہ آئے تھے، اور کئی بار مجھ سے ملے تھے، میں نے حتی الوسع کوشش کی تھی کہ کلکتہ میں ان کے لئے کچھ ہو جائے۔

افسوس کہ ماس کنٹکٹ کے سلسلے میں کوئی صیغہ ایسا موجود نہیں، جس میں ان کی خدمات سے کام لیا جاسکے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی کام ہوسکتا ہے تو صوبہ کی کمیٹیوں سے ہوسکتا ہے۔ صوبوں کے کاموں سے باہر کوئی کام موجود نہیں۔

یوپی کی نسبت معلوم ہوا تھا کہ کمیٹی اس غرض سے بنائی ہے، اور نظم و تسلسل کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ کہاں تک یہ ارادہ وقوع میں آیا ہے اگر ممکن ہو تو پراونشل کمیٹی لکھنؤ سے سلسلہ جنبانی کیجئے۔

لکھنؤ کی نسبت انشاء اللہ، کل یا پرسوں خط لکھوں گا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

(۵) (۹۹)

[مکتوب الیہ نے مولاناؒ کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اس بارے میں لیگی حضرات کے تاثرات نقل کئے تھے یہ خط مسلم لیگ کے ایک مشہور کارکن نے جو آج کل پاکستان میں ہیں،" اغوا کرا کر تنویر لکھنؤ میں شائع کرا دیا تھا" مکتوب الیہ نے ان صاحب کو بلا اجازت و منشا، شائع کرا دینے پر نوٹس دے دیا۔ لیکن بعض واقفین حضرات نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔]

جمعہ۔ ۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء

برادرم تسلیم

مولانا فرماتے ہیں کہ:

ایک صوبہ کا بدلہ دوسرے صوبہ میں لیا جانا خود مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہے، اقلیتوں کو اس کے سوا کوئی چیز محفوظ نہیں رکھ سکتی کہ باہمی ہوا سازگار بنائی جائے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے، میری رایوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور میں نہیں تسلیم کرتا کہ کانگریس کو ہندو آرگنائزیشن سمجھ کر چھوڑ دینا صحیح طرز عمل ہوگا۔

راقم محمد اجمل خان

اس میں بالکلیہ تعطل پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے ہمیں مستقبل کے لئے راہِ عمل متعین کر لینی چاہیئے۔

میرے خیال میں سبھاش بابو کا معاملہ نہ توچپ وراست کی باہمی چپلقش ہے نہ ہم فکر و خیال افراد پر مشتمل مجلس عاملہ کے قیام کا سوال ہے۔ یہ صرف سبھاش بابو اور ان کے چند حامیوں کا معاملہ ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ جھگڑا کس طرح ختم ہو گا۔

ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آزادانہ طور پر اور مخصوص انداز میں سوچنا پڑے گا۔

مجھے امید ہے کہ میرا پچھلا خط آپ کو مل گیا ہو گا اور سلطان احمد کے بارے میں آپ نے لکھنؤ فون کر دیا ہو گا۔

ابوالکلام آزاد

(۱۰۲) (۲)

کلکتہ۔ ۱۷۔ اگست ۱۹۳۹ء

عزیزی جواہرلال

آپ کے خط کے لئے شکر گزار ہوں۔ میں آپ کے نام الہ آباد کے پتے پر یکے بعد دیگرے دو خط بھیج چکا ہوں، امید ہے مل گئے ہوں گے۔

معلوم نہیں راجندر بابو نے کمیٹی کے سامنے میرا خط پیش کیا یا نہیں۔ ولبھ بھائی نے اور انھوں نے خود بھی اصرار کیا تھا کہ میں مفصل طور پر اپنی رائے سے انھیں مطلع کر دوں۔ میری رائے میں سبھاش بابو کا رویہ غلط ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے لئے یہ ضروری تھا کہ اپنی رائے کا اظہار کرتی۔ لیکن میری رائے تھی کہ اس معاملے میں زیادہ شدت کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ میری رائے تھی کہ ورکنگ کمیٹی ان ہی

(۱۰۱)

جواہر لال نہرو کے نام

(۱)

کلکتہ ۱۷ر اپریل ۱۹۳۹ء

عزیزی جواہر لال

سوچتا ہوں کہ جو حادثہ میرے ساتھ الہ آباد میں پیش آیا، اگر یہاں کلکتہ میں پیش آیا ہوتا تو میرے اپنے عزیز بھی میرے علاج و آرام کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے، جتنا کچھ آپ نے کیا۔

آپ نے جس خلوص و توجہ کے ساتھ میری تیمارداری کی۔ میرے عزیز اور قریب ترین رشتہ دار بھی اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے جذباتِ تشکر کا کس طرح اظہار کروں۔ یقین مانیئے آپ کے اخلاص و محبت کا حد درجہ شکر گزار ہوں۔

معلوم نہیں آپ نے گاندھی جی کے نام سبھاش بابو کے خطوط دیکھے ہیں یا نہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سبھاش بابو ابھی تک اس مقام پر ہیں، جہاں وہ تری پورہ سے پہلے تھے۔ مجھے اس کی قطعاً امید نظر نہیں آتی کہ وہ تری پورہ کی قرارداد پر عمل کر کے صورتِ حال کو بہتر بنا سکیں گے۔

ایک طرف تو وہ پنت قرارداد کو خلاف دستور اور قابل تنسیخ قرار دیتے ہیں دوسری طرف وہ یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ گاندھی جی کچھ شرائط مان لیں، ساتھ ہی وہ اپنا مبالغہ آمیز یہ ادعا پیش کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتے کہ اگر سوشلسٹ گروپ غیر جانب دار رہتا تو پنت قرار داد کبھی منظور نہ ہو سکتی تھی۔ بہر حال اس کی توقع نہیں کہ کانگریس سبھاش بابو کے ساتھ چل سکے بلکہ

وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، جواب تک میں سمجھتا رہا ہوں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ عہدِ حاضر کے قابل ترین لوگ بھی اس کارنامے کو کئی دنوں میں مشکل سے انجام دے پاتے۔ آپ نے اسے صرف چند گھنٹوں میں اور وہ بھی بغیر کسی خاص کوشش کے سرانجام دے دیا۔ ایک نیا مضمون لکھنے کے مقابلے میں ترجمہ کرنا کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ یہ بات کچھ آسان نہیں ہے کہ اصل تحریر کے ادبی حُسن کو قائم رکھتے ہوئے کسی لکھنے والے کے اسلوبِ تحریر کو بھی ترجمہ میں باقی رکھا جائے۔ صرف ایک ایسا شخص ہی اس مشکل کام کو انجام دے سکتا ہے جو دونوں زبانوں پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو۔ آپ کے ترجمے میں جس چیز نے خاص طور پر مجھے متأثر کیا، وہ یہ ہے کہ اصل تحریر کا مفہوم کہیں بھی مجروح نہیں ہونے پایا اور آپ نے میری اُردو طرزِ تحریر کو اس کامیابی سے انگریزی میں قائم رکھا ہے کہ مجھے اس پر بالکل تعجب نہ ہوگا، اگر لوگ اسے پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ اصل تحریر اُردو میں نہیں، انگریزی میں لکھی گئی ہے۔

آپ کے ذہن ودماغ کی غیر معمولی رسائی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے میرے اس طرزِ تخیل کا بالکل صحیح اندازہ لگایا جو میرے تحریر کے اسلوب اور جملوں کی ساخت کا باعث بنا۔ دراصل جب آپ نے ترجمہ شروع کیا تو میرے موضوع کی ہر نوک پلک کا صحیح تصوّر آپ کے ذہن میں موجود تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ میری اپنی اصل تحریر بھی صحیح طور پر آپ کو کچھ زیادہ مدد نہ دے سکتی تھی۔ اکثر مقامات پر آپ نے ترجمہ میں، انگریزی زبان کی ضروریات کے مدِنظر میری اصل تحریر کو تھوڑا سا بدل کر کہیں بڑھا دیا یا کچھ مختصر کر دیا۔ اس طرح کے جو جو مقامات آتے ہیں میں نے انھیں بڑے غور سے پڑھا۔ اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کا

خطوط پر ایک ریزولیوشن پاس کر دے۔ جیساکہ آپ نے یوپی میں ایک رزولیوشن پاس کیا تھا۔ اور باقی معاملات صدر (کانگریس) پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ صدران کے ساتھ مراسلت کرے اور اگر وہ کمیٹی کی قرارداد سے اتفاق کرلیں تو پھر مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ بصورت دیگران کو آسانی سے موجودہ ذمے داریو سے سبکدوش کر دیا جاسکتا ہے۔ لیکن آئندہ سال کے انتخاب میں ان کے حصے لینے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جانی چاہیئے۔

میں نے آپ کو فون پر بات کرنے کی زحمت اس لئے دی تھی کہ میرا خیال تھا کہ اس معاملہ کی نسبت غور و فکر میں آپ بھی شریک ہوں گے۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس فیصلہ میں شریک نہ تھے۔ اور آپ کی رضامندی حاصل کئے بغیر یہ معاملہ طے پاگیا۔

ابوالکلام آزاد

(۱۰۳) (۳)

کلکتہ

۲۷ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

عزیزی جواہر لال

۱۵ مارچ کی صبح کو جب آپ نے ٹرین میں میرے خطبے کا انگریزی ترجمہ مجھے دیا، تو وقت نہ ہونے کی وجہ سے میں اس پر سرسری طور پر نظر ڈال سکا تھا۔ اب مجھے اس کو بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ اسے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ اپنی روایتی احتیاط پسندی کو چھوڑ کر اپنے تأثرات کا کھلے دل سے اظہار کروں اور آپ کی اعلیٰ ترین ذہنی قابلیتوں اور غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف کروں۔ انگریزی زبان پر آپ کو جو قدرت حاصل ہے

آپ بھی کم ازکم سنو؍ پونڈ مزید کا انتظام بمبئی سے کردیں گے۔

آپ کہتے ہیں کہ میں ایک خط ان کو بھی لکھوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان کو صدر کی حیثیت سے لکھوں تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوگا کہ وہ کانگریس کی ذمہ داری پر وہاں جارہے ہیں، اور جیسا کہ آپ نے خود بھی لکھا ہے معاملہ کو اس قدر اہمیت دینا اور اس قدر بڑھا دینا خلاف مصلحت ہے۔

اگر آپ کوئی خط لکھیں تو یہ کہنا بہتر ہوگا کہ "مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ آپ امریکہ جارہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں آپ کی موجودگی، ان کے لئے ہندوستان کی موجودہ حالت سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔" آپ کا خط انھیں پوری ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ پوزیشن بھی محفوظ ہوجائے گی۔ جو براہِ راست صدر کی ذمہ داری پر لکھنے سے پیدا ہوگی۔

مسوری میں دوستوں کے تین مکان ہیں جو پہلے ہی سے گھِرے ہوئے ہیں۔ کیا آپ کے دوستوں میں سے کوئی دوست ایک مکان کا مسوری میں بندوبست کرسکتا ہے؟ اگر یہ ممکن نہ ہو تو میں کرایہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ اس صورت میں مکان اچھا اور کئی کمروں کا ہونا چاہیے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسا شخص ہے تو براہِ کرم انتظام کے متعلق تار سے مطلع کیجیے۔ کلکتہ کے موسم کا مجھ پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

مسوری کے بعد میں نے نینی تال اور الموڑا کے متعلق سوچا ہے۔ میں پنت جی کو بھی اس بارے میں تار دے رہا ہوں!

ابوالکلام آزاد

ترجمہ کہیں کہیں مفہوم میں میری اصل عبارت سے بھی بہتر ہوگیا ہے اور کسی ایک جگہ بھی میرے اسلوب تحریر کا مفہوم مجروح ہونے نہیں پایا۔ واتسرانے کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوتے میں نے لکھا تھا!

"صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی بمشکل اس قدر بتانے پر مستعد ہوتا ہے"

یہاں بمشکل ہی میرے طرز بیان کی کلید ہے۔ آپ نے میرے استعارہ کے لوازمات کو قائم رکھتے ہوتے اسے اس طرح ادا کیا ہے :۔

"صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد آخر کار رُک رُک کر پردہ اُٹھتا ہے اور ہم ایک جھلک دیکھ پاتے ہیں"

بمشکل کے ذریعے جو مفہوم میں ادا کرنا چاہتا تھا آپ نے اسے پھیلا کر جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے طرز بیان میں اور درد پیدا ہوگیا ہے۔

میں شاید ۳۰۔ تاریخ کو الہ آباد پہنچوں گا۔ امید ہے کہ آپ اس وقت تک الہ آباد ٹھہریں گے۔

ابوالکلام آزاد

(۴)　　　(۱۰۴)

کلکتہ۔ ۲۴/اپریل ۱۹۴۸ء

عزیزی جواہر لال

آپ کا ۲۱۔ اپریل کا خط مجھے مل گیا، شکرگزار ہوں۔ میں اس بارے میں آپ سے متفق ہوں کہ اگر کرشنا مینن خود امریکہ چلے جائیں تو یہ مفید ہوگا اور جب تک حالات کا تقاضا ہو، وہاں ٹھہریں۔ اگر یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ سے پیشتر ہمارے علم میں آجاتا تو اس میں طے ہو جاتا۔ اب میں جنرل سکریٹری کو فوراً سو پونڈ ان کے نام بھیجنے کے لئے لکھ رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ

اگر ٹیورد من اس کے لئے تیار نہیں ہیں، تو چند دوسرے شخصوں کو جلد منتخب کرنا چاہیئے۔ کیا آپ نام تجویز کر سکیں گے ؟۔

امپیریل تمباکو کمپنی نے مجھے ایک یادداشت بھیجی ہے جس سے ہڑتال کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ظاہر ہوتی ہے جو کارکنوں نے ظاہر کی تھی۔ بہرحال میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی باعزت سمجھوتے کی کوئی صورت نکل آئے۔

ابوالکلام آزاد۔

(۵) (۵۰۰)

نینی تال۔ ۹ مئی ۱۹۳۶ء

عزیزی جواہرلال:

مسوری کے متعلق مجھے آپ کا تار مل گیا جس کے لئے شکر گزار ہوں۔ نینی تال میں انتظام ہو جانے کے سبب سے، میں نے مسوری کا خیال ترک کر دیا تھا۔ میں یہاں ۶ تاریخ کو پہنچا ہوں اور جولائی تک یہاں ٹھہروں گا۔ آپ بمبئی میں جولائی کے آخر تک ٹھہریں گے پھر الہ آباد کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ آپ بھی یہاں نینی تال کیوں نہیں آجاتے اور کچھ دن میرے ساتھ قیام کرتے۔ وہ یہاں پلاننگ کی رپورٹ مکمل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک صوبائی کام کا تعلق ہے الہ آباد اور نینی تال میں کوئی خاص فرق تو نہیں ہے۔

یہاں سے بھی آپ کام سے اسی طرح تعلق قائم رکھ سکیں گے جیسے الہ آباد سے۔ اس کے علاوہ یہاں آپ کی موجودگی بہت سے دوسرے معاملات میں مشورہ کے لئے مفید ہوگی۔

میں نے مسٹر ٹنڈن سے واردھا میں گفتگو کی تھی انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ایک دوسرے معاملے میں بات کریں گے لیکن پھر وہ مجھ سے نہیں ملے۔ براہ کرم ان سے ورکنگ کمیٹی کی ممبری کے متعلق معلوم کیجئے۔ میں آپ کو اس وجہ سے زحمت دے رہا ہوں کہ مجھے ان کا پتہ معلوم نہیں۔ سوشلسٹ دوستوں کا قطعی ناامید ہونا ثابت ہو چکا ہے وہ کام کرنے کی زیادہ ہمت نہیں رکھتے، مخالفت سے ڈرتے ہیں اور مضبوطی کے ساتھ خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں رکھتے۔ میں نے اس تنقیدی دور میں ان سے کچھ مدد لینے کی توقع کی تھی لیکن میری تمام امیدیں غلط ثابت ہوئیں۔

چاہے ہم اس کے لئے تیار ہی کیوں نہ ہوں ستیہ گرہ فوری طور پر مناسب نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس مخصوص وقت میں جب کہ برطانیہ خطرے سے دوچار ہے اس کی پریشانی سے فائدہ اٹھانا اور اس کے حلق پر چڑھائی کرنا ہمارے لئے نامناسب ہے۔" آپ نے اس خیال کا اظہار اپنی لکھنؤ والی تقریر میں بھی کیا ہے اور پائنیر نے آپ کے اصل الفاظ کا حوالہ دینا ضروری سمجھا۔ "یہ بات ہندوستان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ انگلینڈ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اس وقت ستیہ گرہ شروع کردے۔" اس انداز فکر کو سمجھنے سے میں قطعی معذور ہوں اور واقعی یہ طریقہ قطعی غلط ہے کہ سیاسی جدوجہد میں پہلے تو حدود مقرر کرلیں اور پھر اپنے طریق عمل کے بارے میں غلط نتائج نکالیں۔ میں نہیں جانتا کہ "ہندوستان کی شان" کیا چیز ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پیش نظر مسئلہ کیا ہے اور یہ کس جانب رہنمائی کرتا ہے؟ ہم اندھوں کی طرح اندھیرے میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ہمیں آنکھیں کھول کر کوئی راستہ اختیار کرنا چاہیئے، اس سے زیادہ لغو کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد اس پر عمل کرنے سے انکار کردیا جائے۔ ہم نے برطانیہ کو پورا موقع دیا ہے کہ وہ ہماری مدد حاصل کرے لیکن اس نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ اس لئے ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اس سامراجی جنگ میں کوئی حصّہ نہ لیں۔ اگر ہمارا موجودہ رویہ ایسا ہے کہ (گاندھی جی کے الفاظ میں) اس کے ساتھ بغل گیر ہوں یا آپ کے الفاظ میں یہ ہندوستان کی شان کے خلاف ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ہم اس کی مصیبت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس کی ذمہ داری برطانوی حکومت کی عاقبت نااندیشی پر عائد ہوتی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ ہم کو اس موقع پر ستیہ گرہ نہیں کرنی چاہیئے لیکن ستیہ گرہ کا

(۶)　　　　(۱۰۶)

نینی تال - ۲۵ر مئی سنہ ۱۹۴۰ء

عزیزی جواہر لال!

آپ کے خط مورخہ ۱۶۔ ماہِ رواں کا شکریہ۔ میں نے اخبارات میں راجندر بابو کا بیان حیرت کے ساتھ پڑھا اور اس دوران میں، مجھے ان کا ایک خط بھی ملا جس سے ان کا نقطۂ نظر مجھ پر پوری طرح واضح ہو گیا۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس خط کی نقل آپ کو نہیں بھیج سکتا جو میں نے انھیں بھیجا ہے۔ کیونکہ یہ اُردو میں تھا اور دفتری مراسلات کے علاوہ کسی خط کی نقل دفتر میں نہیں رکھی جاتی۔ جہاں تک کانگریس کے موجودہ رویہ کا تعلق ہے اس بارے میں اس خط کا مضمون آپ کے خط سے ملتا جلتا تھا۔

یہ معلوم ہو کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس معاملے میں ہمارے خیالات ایک ہی نہج پر جا رہے ہیں اور یہ سب سے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ گاندھی جی بھی اس سے پوری طرح متفق ہیں۔

آصف علی کا بیان راجندر بابو کے بیان کے مقابلے میں اور بھی قابل اعتراض ہے فی الواقع اس سے مجھے رنج ہوا۔ میں نے انھیں یکے بعد دیگرے دو سخت خط لکھے۔ اب وہ مجھے یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ایسا بیان دینے سے احتراز کریں گے۔ جو کچھ آپ نے میرے اور راجندر بابو کے نام اپنے خطوط میں لکھا ہے، وہ جہاں تک کانگریس کے رویے کا تعلق ہے بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس مرحلے میں تبدیلی کا کوئی سوال اٹھایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے دو باتیں تحریر کی ہیں، جن سے میں متفق نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ اس نقشے میں کیسے سما سکتی ہیں جو کانگریس کے لائحہ عمل کے متعلق آپ بنا رہے ہیں۔ راجندر بابو کے خط میں آپ لکھتے ہیں،

مجھے امید ہے کہ آپ کا قیام لاہور متعلقہ کاموں کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگا۔ مجھے آج سکندر حیات کا تار ملا ہے۔ جس کی ایک نقل غالباً تم کو بھی بھیجی گئی ہے۔ میں نے جواب میں تار دے دیا ہے کہ موجودہ حالات کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ برطانوی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

ابوالکلام آزاد

پنڈت جواہر لال نہرو
معرفت ڈاکٹر خان صاحب۔ سابق وزیر اعلیٰ
پشاور

آپ مطلب کیا لیتے ہیں ؟ کیا یہ ایک نیا اعلان جنگ ہوگا جس کا فیصلہ کانگریس کو کرنا ہے ؟ کانگریس کی جنگ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس جنگ میں کوئی مدد نہ کرے۔ عملی طور پر یہ روک تھام ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانا قطعی ضروری ہے۔ یہ خود بخود سول نافرمانی کی شکل اختیار کرے گی۔ کیونکہ جنگی قوانین روبہ عمل لائے جائیں گے اور انفرادی گرفتاریاں ہوں گی۔

اگر ہندوستان کی شان کے متعلق آپ کا اخلاقی فلسفہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا صرف ایک ہی مطلب نکلتا ہے، یعنی رام گڑھ کا فیصلہ ہندوستان کی شان اور وقار کے قطعی خلاف تھا۔

آپ نے آگے چل کر اسی خط میں ہمارے آئندہ رویہ کے متعلق کہا ہے، جو حکومت کے ساتھ کسی معاہدہ کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ آپ کہتے ہیں "اگر یہ سب باتیں مان بھی لی جائیں (یعنی آزادی، آزادیٔ اظہار خیال اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مجلس قانون ساز کا قیام) تب بھی اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنی اصل قوت جنگ میں جھونک دیں" لیکن اگر ایسا ہے تو ہم یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ برطانوی حکومت ہم کو وہ سب کچھ دے دیگی جو ہم اس سے مانگ رہے ہیں ؟ یقیناً وہ سب مطالبات بے دلی کے ساتھ منظور کرے گی، بشرطیکہ اس کو مجبور کر دیا جائے۔ لیکن اس موقع پر طاقت استعمال کرنے کا سوال نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ستیہ گرہ کی اخلاقی طاقت کا استعمال بھی ہندوستان کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ پیچیدہ اور غیر منطقی خیال آپ کے ذہن میں کہاں سے آگیا۔ کم از کم آپ سے اس قسم کے خیال کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

(۸)　　　　(۱۰۸)

کلکتہ

۸۔ مارچ ۱۹۴۲ء

عزیزی جواہر لال

میں آپ کے خط کا جواب دے چکا تھا کہ آپ کا دوسرا خط ملا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ دو تین روز پہلے واردھا چلا جاؤں گا۔ لیکن بنگال کی ابتر حالت نے مجھے باز رکھا۔ سول پروٹکشن کے سلسلے میں کچھ پیچیدہ سوالات حل کیے بغیر چھوڑے نہ جا سکتے تھے۔ اب کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۱۷ تاریخ کو منعقد ہو رہا ہے اور میرا ارادہ ۱۱/۱۲ تاریخ کو واردھا روانہ ہونے کا ہے اگر آپ بھی ۱۷ تاریخ سے دو روز قبل واردھا پہنچ جائیں تو مفید ہوگا۔ میں اپنی تاریخ روانگی سے آپ کو بذریعہ تار مطلع کروں گا۔

بادشاہ خان نے مجھے کئی خط لکھے ہیں، جن میں انھوں نے اس بیان کو جاری کرنے کا مطالبہ کیا ہے جس کا وعدہ واردھا میں ہوا تھا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں، کہ ان کی خواہش کو پورا کیا جائے۔ چنانچہ ایک بیان پریس کو دے دیا گیا ہے جو آپ نے دیکھا ہوگا۔ معلوم نہیں اس دوران میں آپ کی ان کی خط و کتابت ہوئی ہے یا نہیں۔

چار پانچ روز ہوئے سبھاش بابو کا ایک بیان برلن سے نشر ہوا تھا اور اگلے روز یہ اعلان ہوا کہ یہ ان کی اپنی آواز میں جو کہ ریکارڈ کی گئی ہے، سنا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ سنا کہ یہ سبھاش بابو کی آواز تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ریکارڈ نہیں تھا بلکہ وہ خود بول رہے تھے۔ لیکن ٹوکیو سے جو بیان نشر ہوا وہ یقیناً

(۱۰۷) (۷)

نینی تال - ۱۹؍ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء

عزیزی جواہر لال!

آپ کے خط مورخہ ۱۶۔ ماہِ رواں کے لیے شکر گزار ہوں۔ مہربانی کر کے میرے بیان کو دوبارہ پڑھیئے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ رزولیوشن متفقہ طور پر پاس ہوا میں نے صرف یہ وضاحت کی ہے رزولیوشن کا ذہنی پہلو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ بات سب کے ذہنوں میں واضح طور پر موجود تھی کہ اس صورت میں کہ اگر ہندوستان کے مطالبے کو منظور کر لیا جائے تو ہندوستان کو جنگ میں حصہ لینا چاہیئے۔ "سٹیٹسمین" اور دیگر اخبارات نے بیان کا یہی مطلب لیا ہے۔

اگر آپ پونا میں آئندہ ملاقات تک، اس کے متعلق کوئی بیان نہ دیں تو میں شکر گزار ہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ سے مفصل گفتگو کروں۔ افسوس! دہلی میں اس کا موقع نہیں مل سکا۔ مجھے چین کے خط کی نقل مل گئی۔

ابوالکلام آزاد

حملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند دنوں میں کلکتہ بھی اس کا نشانہ بنے گا۔ اس سے مزید نئی اور سخت مشکلات بنگال کی ساحلی آبادیوں کے لئے پیدا ہو گئی ہیں۔ ان حالات میں باہر جانے کے لئے میں خود کو آمادہ نہیں کر سکا۔

یہ دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی کہ افتخار راستہ سے بھٹک گئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ نے ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی اور اس کا کیا نتیجہ نکلا۔

الہ آباد میں آپ کو مضمحل پاکر متفکر تھا۔ اب آپ کو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اپنی صحت کے بارے میں آپ کا خیال صحیح نہیں تھا۔ آپ کو اپنی صحت کا مزید خیال رکھنا چاہیئے۔

مخلص

ابوالکلام آزاد

ریکارڈ تھا۔ بجلی کے ذریعہ ریکارڈ چلنے کی حرکات کی آواز صاف سُنائی دیتی تھی۔

فارورڈ بلاک کے وزیر سنتوش اور بنرجی یہاں بہت پریشان ہیں وہ کہتے ہیں کہ فارورڈ بلاک سے ان کا ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے۔

ابوالکلام آزاد

(۱۰۹) (۹)

کلکتہ

۱۳۔ مئی ۱۹۴۲ء

عزیزی جواہرلال!

دہلی سے مرسلہ آپ کے تار اور خط کے لئے شکر گزار ہوں۔ آپ نے غور نہیں کیا میں نے لکھا تھا "آپ کا شکر گزار ہوں" نہ کہ محض "شکریہ" اس طرح میں نے دو طریق بیان میں وہ واضح فرق پیدا کر دیا جو آپ نے مجھے دہلی میں بتایا تھا۔

قدوائی کا ایک خط آیا ہے اور ایک تار پالیوال نے بچوں کے اخراج کے معاملہ میں اپنی آمادگی سے متعلق بھیجا ہے۔ میں حکومتِ بنگال سے تفصیلات طے کر رہا ہوں۔ جوں ہی وہ کسی خاص نتیجے پر پہنچیں گے، یو پی کے دوستوں کو مطلع کروں گا۔

مجھے آج معلوم ہوا کہ قدوائی کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت کل اچانک گرفتار کر لیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پچھلے چند دنوں میں قدوائی نے کیا کیا کہ حکومتِ یو پی کے نزدیک وہ خطرناک آدمی ہو گئے۔

میں نے اپنے پچھلے خط میں آپ کو لکھا تھا کہ بمبئی جا رہا ہوں لیکن بنگال کے حالات نے مجھ پر ایسا اثر ڈالا کہ مجھے اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ چٹاگانگ پر ہوائی

(۱۱۱)

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے نام

(۱)

[جنگِ عظیم کے دوران اگست ۱۹۴۰ء میں وائسرائے ہند نے حضرت مولانا کو جو اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے، اس تجویز پر گفتگو کرنے کی دعوت دی کہ ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر اور اس کے اختیارات بڑھا دیئے جائیں اور اس طرح کانگریس کو حکومت میں شریک کیا جائے۔ حضرت مولانا نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کئے بغیر اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ حضرت مولانا کی رائے میں کانگریس کے مطالبۂ آزادی اور وائسرائے کی اس پیشکش میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لئے وائسرائے سے ملاقات بھی بے معنی چیز تھی۔ لیکن بعض کانگریسی حضرات مولانا کے اس اقدام سے متفق نہ تھے ان کی رائے میں اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیئے تھا اور وائسرائے سے ملاقات بھی کرنی چاہیئے تھی۔ (ہماری آزادی ص۷۷) راجہ جی کا بھی یہ خیال تھا۔ حضرت رئیس الاحرار نے حضرت مولانا کے فیصلہ کے خلاف راجہ جی کے سخت طرزِ عمل کی شکایت کی تھی۔ جواب میں حضرت مولانا نے درج ذیل مکتوب تحریر فرمایا۔]

کلکتہ

۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

جیؔ فی اللہ! آپ کا خط ملا۔ مصروفیت کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ مسٹر راج گوپال اچاری نے غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس مقصد کی حمایت کا وہ دعوٰی کر رہے ہیں، اس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں نے انھیں

(۱۱۰)

حضرت مولانا محمد زکریاؒ کے نام

[شملہ کانفرنس کے شروع میں تمام سیاسی رہنماؤں کو آزاد کردیا گیا تھا لیکن حضرت رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کا جرم حق کوشی و حق نوازی ایسا نہ تھا کہ انھیں بھی عام سیاسی قیدیوں کی طرح چھوڑ دیا جاتا۔ خاصان تحریک جہاد حریت کے ساتھ آخر کچھ تو امتیاز ہونا چاہیے تھا! چنانچہ حضرت رئیس الاحرار کی رہائی کے لئے مولانا آزادؒ کو ضرورت پیش آئی کہ ویول کو توجہ دلائیں بالآخر چھ سال کی طویل قید و بند اور سنت یوسفی کی تکمیل کے بعد ۵/جولائی ۱۹۴۵ء کو دھرمسالہ جیل سے انھیں رہا کر دیا گیا۔

مولانا آزادؒ نے یہ خط لارڈ ویول سے حضرت رئیس الاحرار کی رہائی کے متعلق بات چیت کے بعد ان کے والد مولانا محمد زکریاؒ کی خدمت میں بدست محترم جناب عزیز الرحمٰن صاحب جامعی خلف رشید حضرت رئیس الاحرارؒ روانہ کیا تھا۔]

حبی فی اللہ! آپ کا خط ملا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی قربانیوں اور استقلال سے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔ اس دفعہ کی طویل نظر بندی میں تو وہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اب وہ دو تین دن ہی میں رہا ہو جائیں گے۔

مجھے یاد ہے آپ دفتر وکیل اخبار امرتسر کے بعد کلکتہ میں بھی ملے تھے۔ مجھے آپ کی ملاقات سے ہمیشہ مسرت ہوتی۔

ابوالکلام

۴/جولائی ۱۹۴۵ء۔ شملہ

(۱۱۳) (۳)

[اخبار میں مولانا آزادؒ کی علالت کی خبر پڑھ کر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی علیہ رحمہ نے مزاج پرسی کا خط لکھا اور مکمل آرام فرمانے کا مشورہ دیا تھا نیز یہ تحریر فرمایا تھا کہ "کانگریس کو پریذیڈنٹ مل جائیں گے مگر عالم اسلام کو ابوالکلام نہیں ملے گا" مولاناؒ کا مکتوب ذیل اس کے جواب میں ہے۔]

کلکتہ

۱۳۔ نومبر ۱۹۴۵ء

جی فی اللہ! خط پہنچا۔ کیا کروں، دل مانتا نہیں کہ آدمی بیماری کے مقابلے میں ہار مان جائے۔ بہرحال اب ارادہ کیا ہے کہ چند دنوں کے لئے بندھیا چل کے ایک غیر آباد مقام میں چلا جاؤں، اور سکون خاطر کی کوشش کروں۔

انشاءاللہ بوقت فرصت میں آپ کو بعض امور کی نسبت لکھوں گا جو پیش نظر ہیں۔ اپنے والد بزرگوار اور تمام احباب و مخلصین کو سلام و دعائے خیر پہنچادیں۔

والسلام۔

ابوالکلام

(۱۱۴) (۴)

بندھیاچل (ضلع مرزاپور)

۱۷/ نومبر ۱۹۴۵ء

جی فی اللہ! آپ کا خط مورخہ ۱۶/ نومبر وصول ہوا۔

بندھیاچل، مرزاپور کے قریب ایک قصبہ ہے اور اسی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ خط و کتابت کے لئے بندھیاچل، ضلع مرزاپور پتہ کافی ہوگا۔ جب تک میری واپسی

بہت سمجھایا لیکن انھیں کسی نہ کسی طرح منسٹری کے عہدہ پر جانا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی بات پر غور کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۱۲)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی[(۲)]

سوراج بھون۔ الہ آباد

سری نگر

۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

حبی فی اللہ! خیال تھا کہ لاہور میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ لیکن سردست لاہور کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ اب ستمبر کے آخر میں قصد کروں گا ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ جو بات اب طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مصالح کا مقتضا کیا ہے۔ آپ جمعیۃ احرار کو بدستور مستقلاً الگ رکھیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ میں نے ابھی تک کوئی آخری رائے قائم نہیں کی ہے۔ مشورہ و ملاقات کے بعد طے کیا جائے گا۔ اس وقت تک میں نے مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو پنجاب کانگریس کے حلقے میں شامل نہ کروں۔

چنانچہ ایک سب کمیٹی جو کہ کل انتخابات کی تیاریوں کے لئے بنائی جا رہی ہے اس میں مولانا غزنوی[۱] وغیرہ کا نام شامل کر دیا ہے، آپ کا نہیں کیا۔ اس خیال سے کہ پہلے آپ سے مشورہ ہو جائے۔ اس کے بعد حسب مصالح وقت، آپ طریق کار اختیار کریں۔

ابوالکلام

---

[۱] مولانا داؤد غزنوی۔

(۱۱۵)

مولانا محمدؒ اکبر صاحب باقومی کے نام

شادی کی تہنیت

[مکتوب الیہ مولاناؒ کے نیاز مندوں اور معتقدوں میں سے ہیں، حضرت مولاناؒ کو بھی ان سے خصوصی تعلق خاطر تھا. تحصیل علم سے فراغت کے بعد شادی ہو رہی تھی حضرت مولاناؒ کو بھی شرکت کی دعوت دی. مولاناؒ نے شرکت سے معذوری کا اظہار فرمایا اور دعائیں دیں۔ جواب میں مولاناؒ کے قلم سے قرآن مجید کی ایک آیت کی بے مثال تفسیر نکل گئی۔ یہ ہر مسلمان خاوند کے لئے ایک نظریۂ حیات اور لائحہ عمل ہے جو اسے اپنی ازدواجی زندگی میں پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔]

19/A بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ

۵/۱/۴۴ء

عزیزی! تمھارا خط پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی تعلیم کی تکمیل کے بعد اب تمھیں زندگی کی وہ منزل پیش آگئی ہے، جہاں سے انسان کی شخصی زندگی کی ذمہ داریوں کا ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ یعنی تمھاری شادی ہو رہی ہے۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ اس موقع پر شریک ہو سکوں، لیکن یقین کرو کہ میرے دل کی دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ میں اپنی جگہ اپنی دُعائیں تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔

زندہ باشی و کامراں باشی!

اللہ تعالیٰ اس تقریب کو برکت و سعادت کا موجب بنائے اور تمھاری یہ نئی زندگی ہر اعتبار سے کامیاب ہو!

کی خبر نہ ملے کلکتہ کے پتہ سے خط نہ بھیجئے۔ دو دن کی تاخیر ہو جاتی ہے۔

پنجاب کانگریس کی جو حالت آپ نے لکھی ہے[1]، وہ میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن بحالتِ موجودہ اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ نئی کمیٹیوں کے بننے کا انتظار کیا جائے۔ آپ کا ایک تار ملا تھا۔ جس میں رجسٹرڈ خط کی ترسیل کے لئے لکھا گیا تھا۔ میں نے اس کے جواب میں کسی قدر تفصیل بذریعۂ خط طلب کی تھی۔ اس کا جواب مجھے ابھی نہیں ملا ہے۔ اس بارے میں تامل نہ کیجئے۔ جو صورت حال ہو بلا تامل لکھیے۔ حتی الوسع کوشش عمل میں آئے گی۔

آپ نے لالہ تلک رام کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، میں نے اسے الکشن فائل میں رکھ دیا ہے۔ تاکہ بر وقت غور کیا جا سکے لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ سرِدست آپ کوئی وعدہ ان سے نہ کریں[2]۔ نہیں معلوم ضلع کانگریس کمیٹی اس حلقہ سے کس کی سفارش کرتی ہے اور کانگریس کے نقطۂ خیال سے اس کے حقوق کس درجہ کے ہوتے ہیں۔ سنٹرل اسمبلی کے لئے بعض امیدواروں کا انتخاب صحیح طور پر نہیں ہوا کیوں کہ وقت بہت کم تھا اور علالت کی وجہ سے میں وقت نہ دے سکا۔ لیکن اس صورت حال کا کافی بوجھ میری طبیعت پر ہے اور اب میں نہیں چاہتا کہ صوبوں کے امیدواروں کے انتخاب میں اس طرح کی کوئی کمزوری رونما ہو۔ ہمیں یقیناً قابلیت اور اہلیت بھی دیکھنی ہے، لیکن ساتھ ہی حتی الامکان ان لوگوں کو آگے رکھنا ہے، جنھوں نے ملکی تحریک کی راہ میں قربانیاں کی ہیں۔

والسلام

ابوالکلام

---

[1] حضرت رئیس الاحرار نے پنجاب کانگریس کمیٹی کی ابتری اور خراب حالت کی شکایت کی تھی۔

[2] لالہ تلک رام اگروال جین، کانگریس کے ایک کارکن اور رئیس الاحرار کے دوست تھے، لدھیانہ، انبالہ، کرنال اور شملہ کے شہری حلقہ سے پنجاب اسمبلی کی ممبری کے امیدوار تھے۔ رئیس الاحرار نے لالہ تلک رام کے کاغذات نامزدگی داخل کرائے اور مولانا آزاد سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جانب سے ان کی امداد کے لئے سفارش کی تھی۔

اپنی ہی ہستی کو اپنے سامنے رکھتا ہے لیکن رحیمانہ محبت کرنے والا اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور دوسرے کی ہستی کو مقدم رکھتا ہے۔ رحمت ہمیشہ اس سے تقاضہ کرے گی کہ دوسرے کی کمزوریوں پر رحم کرے، غلطیاں، خطائیں بخش دے۔ غصہ، غضب اور انتقام کی پرچھائیں بھی اپنے دل پر نہ پڑنے دے۔

میری دلی آرزو ہے کہ خدا تم دونوں کو توفیق دے کہ اپنی ازدواجی زندگی کو اول دن سے اسی رنگ میں شروع کرو، جس رنگ میں قرآن کی مقدس تعلیم نے اس معاملے کو دیکھا ہے اور نوعِ انسان کے آگے رکھا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام

میں اس موقع پر تمھیں یاد دلاؤں گا کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے تمھیں چاہیئے ازدواجی زندگی یعنی شادی کی زندگی کا وہ تصور اپنے سامنے رکھو جو قرآن حکیم نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ومن اٰیٰتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودّۃ ورحمۃ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون۔ خدا کی حکمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھارے لئے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے، یعنی مرد کے لئے عورت اور عورت کے لئے مرد۔ لیکن خدا نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ تمھاری زندگی میں تین چیزیں پیدا ہو جائیں، جن تین چیزوں کے بغیر تم ایک مطمئن اور خوش حال زندگی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ سکون۔ مودت۔ رحمت۔ لتسکنوا الیہا وجعل بینکم مودّۃ ورحمۃ۔

سکون عربی میں ٹھہراؤ اور جماؤ کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں ایسا ٹھہراؤ اور جماؤ پیدا ہو جائے کہ زندگی کی بے چینیاں اور پریشانیاں اسے ہلا نہ سکیں۔

مودّت سے مقصود محبت ہے۔ قرآن کہتا ہے ازدواجی زندگی کی تمام تر بنیاد محبت پر ہے شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے اس لئے رشتہ جوڑتی ہے تاکہ ان کی ملی جلی زندگی کی ساری تاریکیاں محبت کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

لیکن محبت کا یہ رشتہ پائیدار نہیں ہو سکتا اگر رحمت کا سورج ہمارے دلوں پر نہ چمکے۔ رحمت سے مقصود یہ ہے کہ شوہر اور بیوی نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کریں، بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کی غلطیاں اور خطائیں بخش دینے اور ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے لئے اپنے دلوں کو تیار رکھیں۔ رحمت کا جذبہ خود غرضانہ محبت کو فیاضانہ محبت کی شکل دے دیتا ہے۔ ایک خود غرض محبت کرنے والا صرف

(۱۱۷) (۲)

[مکتوب الیہ نے "شاہ اسمٰعیل شہید" اور ان کی تحریک پر مقالات کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ مولانا آزادؒ نے اس کا مقدمہ لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں مقالات کا مسودہ مولاناؒ کی خدمت میں بھیج دیا گیا تھا، مولاناؒ نے مطالعے کے بعد مسودہ واپس فرمادیا اس مکتوب میں اس کی واپسی کا تذکرہ ہے اور جس تحریر کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کا مقدمہ تھا۔ لیکن مولاناؒ کو اس وقت کچھ لکھنے کا موقع نہ ملا، حتیٰ کہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء میں گرفتار کرلئے گئے۔ اس لئے مرتب نے یہ مجموعہ مولاناؒ کے مقدمہ کے بغیر ہی شائع کردیا۔]

کلکتہ

۵ ۴۲ء

عزیزی!

آپ کا خط مل گیا تھا مگر ہجوم اشغال سے بروقت جواب نہ دے سکا۔

آپ کے مسودات کا فائل رجسٹرڈ بھجوا رہا ہوں، جس تحریر کا میں نے وعدہ کیا تھا، چند دنوں کے بعد وہ بھی بھیج دوں گا۔ موسم کی سختی اور قلب کی شکایت نے آج کل مجھے بالکل بے بس کردیا ہے، یہاں کے حالات کے تقاضے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے اور اگر کسی سرد مقام پر چلا بھی جاؤں تو چین سے نہیں بیٹھ سکوں گا۔

والسلام علیکم۔

ابوالکلام

(۱۱۶)

جناب عبداللہ بٹ صاحب کے نام

(۱)

[آل پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر کی یاد منائی جارہی تھی۔ فیڈریشن کے سکریٹری جناب عبداللہ بٹ صاحب نے متعدد زعمائے ملّت کو ان کے پیغامات کے لئے خطوط لکھے تھے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نام خط کے جواب میں مولاناؒ کا پیغام کانگریس کمیٹی کے لیٹر پیڈ پر انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا وصول ہوا۔ مولاناؒ کے دستخط بھی انگریزی میں تھے۔ اس پیغام کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔]

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ الہ آباد۔

۶ر جنوری سنہ ۱۹۴۲ء

سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک جدید ہندوستان کی تاریخ میں پہلی عمومی تحریک تھی۔ مولانا محمد علیؒ اور مولانا شوکت علیؒ کو ان حضرات کے زمرہ میں یاد رکھا جائے گا جنھوں نے اس تحریک کی رہنمائی کی تھی۔ میں ان کا یوم وفات منانے کی تجویز سے پوری طرح متفق ہوں۔

ابوالکلام آزاد

(۱۱۹)

مولانا عبدالغفور احمد صاحب کے نام

(۱)

۱۹۔اے بالی گنج۔سرکلر روڈ۔کلکتہ

۲۳/۱/۴۲ء

جی فے اللہ! آپ کا رجسٹرڈ خط مورخہ ۱۳ر دسمبر بر وقت وصول ہوگیا تھا۔ میری تمام ڈاک سکریٹری ہی وصول کرتے ہیں، اس لئے دستخط کو کسی بے عنوانی پر محمول نہ کیجئے۔ جواب میں تاخیر اس لئے ہوئی کہ خود جواب دینا چاہتا تھا، اس لئے فرصت کا منتظر تھا۔ صحت کی کمزوری کے ساتھ اشغال کا ہجوم مجھے بے بس کر دیتا ہے۔ اور بعض اوقات اس طرح کے مکاتیب کے جواب میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ امید ہے آپ اسے تغافل پر محمول نہ کریں گے۔

اللہ تعالے اس اخلاص و محبّت کے لئے آپ کو جزائے خیر دے، اور قرآن حکیم کے فہم و تدبّر کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ آپ نے اغلاطِ کتابت کی تصحیح کے لئے جو زحمت گوارا کی، اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ در اصل یہ ایڈیشن غلط بھی چھپا ہے اور اس کے علاوہ اور بھی اسقام ہیں۔ اب دوسرے ایڈیشن کے لئے تقاضہ ہو رہا ہے منتظر ہوں کہ تیسری جلد چھپ جائے تو ایک نیا ایڈیشن بہتر سر و سامان و اہتمام طباعت کے ساتھ شائع کیا جائے۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں سب سے زیادہ اہم مبحث قرآن حکیم کے وجوہِ استدلال کا ہے اور جب تک اس باب میں معاملہ کے تمام پہلو پیش نظر نہ ہوں، اس کی اہمیت واضح نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اگر آپ نے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا اور پھر تفسیر میں جا بجا جو اشارات اس باب میں کئے گئے ہیں اور تفسیر فاتحہ کی طرف توجہ دلائی ہے،

(۱۱۸) (۳)

[۱۹۶۱ء میں جناب عبداللہ بٹ صاحب نے حضرت مولاناؒ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر ہند و پاک سے مضامین لکھوائے تھے۔ اسی موقع پر آپ نے حضرت مولاناؒ سے ان کے سفرِ عراق کے بارے میں استفسار فرمایا تھا۔ ساتھ ہی حضرت مولاناؒ کی ایک غزل کے بارے میں معلوم کیا تھا کہ آیا یہ ان کا کلام ہے؟ اس غزل کا مطلع یہ ہے

کوئی نالاں کوئی بسمل کوئی گریاں ہو گیا
تیرے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگِ محفل ہو گیا

اور مقطع درج ذیل ہے،

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمندِ زلف کا — لے اسیروں میں ترے آزادؔ شامل ہو گیا

حضرت مولاناؒ نے جواباً لکھوایا۔]

۲۹ مئی ۱۹۶۲ء

جنابِ من تسلیم!

مولانا فرماتے ہیں

ہاں! محض ابتدائی عہد کی یہ ایک غزل تھی۔ غالباً مخزن میں نکلی تھی۔ اب اشعار یاد نہیں۔

مصر کے سفر کا حال تذکرہ میں نہیں لکھا کیوں کہ وہاں حالات کی تفصیلات نہیں بیان کی گئیں۔

راقم
محمد اجمل خاں

(۱۲۲) (۴)

نئی دہلی (یہ پتہ کافی ہے)
۱-۸-۴۷

رکن مجلس تعلیمات
انڈیا

مکرمی تسلیم

آپ نے اغلاط سے مطلع کیا۔ حضرت مولانا اس کے لئے شکر گزار ہیں۔

افسوس ہے کہ پاسپورٹ وغیرہ کے معاملات سے حضرت مولانا کا کوئی تعلق نہیں۔

راقم
محمد اجمل خاں
سکریٹری مولانا آزاد مدظلہٗ

(۱۲۳) (۵)

۱۹۔ اکبر روڈ۔ نئی دہلی
۱۲ر جون ۱۹۴۹ء

رکن مجلس تعلیمات
انڈیا

جنابِ من! تسلیم

آپ کا خط مع مدینہ شریف کی کھجوروں اور تسبیح کے پہنچا۔ مولانا شکر گزار ہیں اور دعا کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن جلد سوم ابھی شائع نہیں ہوئی۔

راقم
محمد اجمل خاں

(۱۲۴) (۶)

کیمپ چشمہ شاہی
سری نگر

پرائیویٹ سکریٹری
وزیر تعلیمات۔ بھارت

انھیں بھی پیش نظر رکھا تو یقین ہے کہ اس کے معارف سے دماغ آشنا ہو جائے گا۔
جنگ کی وجہ سے کاغذ کا حصول دشوار ہو گیا ہے، تاہم کوشش کر رہا ہوں
کہ کسی نہ کسی طرح تیسری جلد کی طباعت شروع ہو جائے۔
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۲۰) (۲)

۱۹۔ اے، بالی گنج۔ سرکلر روڈ۔ کلکتہ
۲۴ ۲/۱ م

جی فی اللہ! خط لکھ چکا ہوں۔ اس وقت دیکھا تو آپ کا
دوسرا خط ملا، جس میں آپ نے ازراہِ عنایت ٹکٹ لگا کر لفافہ جواب کے لئے رکھ
دیا ہے۔ جواب دینا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ اس کے لئے ٹکٹ بھیجنے کی ضرورت
نہ تھی۔ بہر حال آپ کا لفافہ کام میں لاتا ہوں اور ٹکٹ واپس بھیجتا ہوں۔ والسلام علیکم۔
ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۱۲۱) (۳)

بندھیاچل (مرزاپور)
۱۔ ڈسمبر ۱۹۴۵ء

جی فی اللہ! تاخیر کے لئے خواستگار معافی ہوں۔
ترجمان القرآن جلد اوّل پر نظر ثانی ہو چکی ہے، اور لاہور میں زمزم کمپنی لمٹیڈ چھاپ
رہی ہے۔ تیسری جلد کا کام بھی شروع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ مسلسل جاری رہے۔
آپ نے جس اخلاص و محبّت کا اظہار کیا ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں۔
ابوالکلام

یہ انتظام نہیں ہے۔

حضرت مولانا رو بصحت ہیں، اور ہفتہ دو ہفتہ میں انشاءاللہ کامل صحت ہو جائے گی۔

راقم

محمد اجمل خاں

بخدمت عبدالغفور احمد صاحب

مھسلہ۔ کولابہ

(۱۲۶) (۸)

پرائیویٹ سکریٹری
وزیر تعلیمات۔ بھارت

۴۔کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۴ راگست ۵۲ء

جناب من! تسلیم

آپ کا خط متعلق طباعت جلد سوم ترجمان القرآن حضرت مولانا کو ملا۔ آپ کی یاددہانی کی چنداں ضرورت نہیں ہے، حضرت مولانا کو خود خیال ہے۔ جب اس کی طباعت کا کام شروع ہوگا، تو آپ کو اخبارات سے معلوم ہو جائے گا۔ ابھی جلد اس کام کے شروع ہونے کی امید نہیں ہے۔

راقم

محمد اجمل خاں

عبدالغفور احمد
ڈاک خانہ مھسلہ
ضلع کولابہ

۱۴؍جون ۱۹۴۹ء

جنابِ من!

حضرت مولانا نے مجھے آپ کے خط مورخہ ۲؍جون ۱۹۴۹ء کی رسید بھیجنے کی ہدایت کی ہے۔

حضرت مولانا کو یہ معلوم ہو کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کے گُردے سے پتھری نکالنے کے لئے آپریشن کامیاب رہا۔

وہ آپ کی مکمل اور جلد صحت یابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ این۔ مسعود

جناب عبدالغفور احمد صاحب
ڈاک خانہ مھسلہ۔ ضلع کولابہ۔

(۱۲۵) (۷)

نمبر۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۶؍اگست ۱۹۵۰ء

جناب محترم تسلیم

آپ کا خط مورخہ ۳۱؍جولائی وصول ہوا۔ جی ہاں! جلد[1] سوم کی طباعت ابھی نہیں ہوئی۔ بوجہ کثرتِ کار حضرت مولانا کو فرصت نہیں ملی۔ ان شاء اللہ اس کی طباعت کا جلد انتظام ہوگا، اور شائع ہونے پر آپ کو اخبارات سے معلوم ہو جائے گا۔

براہِ کرم "پس منظرِ اسلام"[2] کے متعلق کتب فروشوں کو تحریر فرمائیے میرے پاس

---

[1] ترجمان القرآن کی طرف اشارہ ہے۔ [2] محمد اجمل خاں صاحب کی ایک کتاب کا نام ہے۔

(۱۲۸)

مولانا محمدؐ میاں فاروقی کے نام

[قلعہ احمد نگر سے حضرت مولاناؒ کو بانکوڑا جیل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بانکوڑا جیل سے ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو رہا کئے گئے۔ اسی روز حضرت مولاناؒ نے یہ خط لکھا۔]

رام اُداس
بانکوڑا
۱۵ر جون ۴۵ء

صدیقی العزیز! جیسا کہ کل شام آپ کو ریڈیو سے معلوم ہو گیا ہوگا، آج مجھے رہا کر دیا گیا۔ میں آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار اکسپریس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا ہے کہ اجمل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آجائیں۔ امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی روانہ ہو گئے ہوں گے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی تھی۔ اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں۔ افسوس کہ بہ اطمینان گفتگو کرنے کا موقع نہ تھا، اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

ابوالکلام

(۹)　　　　(۱۲۷)

نئی دہلی

۲۹ ستمبر ۱۹۵۴ء

پرائیویٹ سکریٹری

وزیر تعلیمات - بھارت

جنابِ من!

آپ کا خط مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۹۵۴ء جس کے ساتھ آپ کے مکتوب مورخہ
۔ مارچ ۱۹۵۴ء کی نقل بھی تھی، وصول ہوا۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ "ترجمان القرآن" کے نئے اڈیشن (بشمولِ جلد سوم) کی اشاعت کے سامان ہو رہے ہیں۔

حضرت مولانا آپ کے اخلاص و محبّت کے لئے شکرگزار ہیں اور اللہ تعالیٰ سے آپ کے لئے دعا کرتے ہیں۔

آپ کا مخلص

کے - آر - کرپلانی

جناب عبدالغفور احمد صاحب

مصلا - ضلع کولابہ

(صوبہ بمبئی)

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

مولانا سید سلیمان اور دوسرے احباب ہوں تو میرا سلام شوق پہنچا دیں۔

مدتیں گزر گئیں بہت جی چاہتا ہے کہ دوستوں سے ملاقات ہو لیکن

تجری الریاح بما لا تشتھی السفن[1]

(۱۲۱)

(۳)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون ۔ الہ آباد۔

بندھیاچل

۲۵ر نومبر ۴۵ء

حبی فی اللہ!

می بنیمت عیاں ودمنائے تو قربتت

میں ۲۔ ڈسمبر تک یہاں ہوں اس کے بعد کلکتہ کا قصد ہے۔ پھر ۹۔ کے بعد یہاں آؤں گا، اگر آپ ۲۔ ڈسمبر سے پہلے آسکتے ہیں تو آئیے۔ نہیں تو ۹۔ کے بعد میری واپسی کی اطلاع آپ کو اخبارات سے مل جائے گی۔ آپ جب کبھی مجھ سے ملیں گے، میرے لئے خوشی کا باعث ہوگا۔

والسلام علیکم۔

ابوالکلام

---

[1] ایک عربی شعر کا مصرع ثانی ہے، مصرع اول یہ ہے۔ کل ما یتمنی المرء یدرکہ ! اس شعر کا ترجمہ یہ ہے: انسان جس چیز کی تمنا کرتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اسے حاصل بھی کر لے، کبھی کبھی ہوائیں (جو بیڑوں کو پار لگاتی ہیں) کشتیوں کی خواہشات کے خلاف چلتی ہیں۔

(۱۲۹)

جناب یحییٰ اعظمی کے نام

(۱)

وائسریگل لاج۔شملہ

۱۵ر جولائی ۱۹۴۵ء

جبی فی اللہ

آپ کے محبّت و اخلاص کا تحفہ پہنچا۔ شکرگزار ہوں اور دعا کرتا ہوں زندگی کی خوشیوں میں سے اگر کوئی خوشی باقی رہ گئی ہے تو وہ صرف دوستوں کی مخلصانہ محبّت ہے۔ جب میں نینی جیل میں تھا۔ جب بھی آپ کی صدائے محبّت میرے کانوں کے ذریعہ دل تک اُتری تھی۔ اب تین برس کے بعد دنیا میں پھر واپس آیا ہوں تو آپ کی مخلصانہ محبت بدستور دل نواز ہے۔ والسلام علیکم۔

ابوالکلام

(۱۳۰)

(۲)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ کشمیر

نسیم باغ سری نگر، کشمیر

۲۸/۵/۴۶ء

جبی فی اللہ! اللہ تعالیٰ اس اخلاص و محبّت کے لئے جزائے خیر دے۔ دعا کرتا ہوں اور شکرگزار ہوں۔ علی گڑھ کے اسٹیشن پر چند طلباء کا جو طرز عمل رہا تھا، اسے ان کی نادانی پر محمول کیجئے اور انھیں بخش دیجئے۔ اس کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے، ان نادانوں پر ہے جو ان بے خبروں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔

(۱۳۴)

جناب محمد عبدالشاہد خاں صاحب شروانی کے نام

(۱)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون الہ آباد۔

۲۶ر جولائی ۴۵ء

جبیّ فی اللہ! اللہ تعالیٰ اس محبت و اخلاص کے لئے جزائے خیر دے۔

آپ مجھ سے خط و کتابت جاری رکھئے۔ جونہی مہلت ملی بہ تفصیل لکھوں گا۔

اس وقت مہلت تحریر نہیں، میں چند دنوں کے لئے کشمیر جارہا ہوں "گلمرگ کشمیر" کے پتہ سے خط لکھیئے گا تو میں بہ اطمینان جواب دے سکوں گا۔ والسّلام علیکم۔

ابوالکلام

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی صاحب

ہادی منزل بھموری ضلع علی گڑھ یوپی۔

(۱۳۵) (۲)

نسیم باغ، سری نگر

۵ر ستمبر ۴۵ء

جبیّ فی اللہ عذرخواہ ہوں کہ بروقت جواب نہیں دے سکا۔ یہ ضروری ہے کہ آپ کسی موقع پر مجھ سے ملیں تاکہ زبانی باتیں ہوں۔

میں ۷ر ستمبر کو دہلی پہنچوں گا۔ اور غالباً ۱۰۔ کی صبح تک ٹھہر کر بمبئی کا رخ کروں۔ اس کے بعد ستمبر کے اواخر میں بھی امکان ہے کہ لاہور جاتے ہوئے دہلی ٹھہرنا پڑے۔ اخبارات

(۱۳۲) (۴)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ الہ آباد

دہلی۔ ۲۱ مئی ۴۶ء

عزیزی! کہہ نہیں سکتا کہ آپ کے بے لوث جذبات اخلاص و محبت سے کس درجہ دل متاثر ہوا؟ شکر گزار تھا اور شکر گزار ہوں۔ غبار خاطر کا ایک نسخہ مرسل ہے۔ افسوس ہے کہ چھپائی اچھی نہ ہو سکی۔ اب دوبارہ مع بعض اضافوں کے زیر طباعت ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

ابوالکلام

یحییٰ اعظمی صاحب
دارالمصنّفین۔ اعظم گڑھ۔

(۱۳۳) (۵)

وزیر تعلیمات
بھارت

عزیزی! آپ نے اپنی نظموں کا جو مجموعہ "نوائے حیات" کے نام سے بھیجا، اسے دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ آپ کے کلام میں تخیل کی وسعت اور الفاظ و تراکیب کی ثقاہت، دونوں خوبیاں ہیں، اور انہی دو عنصروں کی ترکیب کا نام شاعری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا کلام عام طور پر مقبول ہوگا۔

ابوالکلام

دہلی۔ ۱۰ اگست ۵۷ء

عربی قلمی، غیر مطبوعہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو سورۃ نساء کے اس مقام کی تفسیر دیکھئے جس میں حضرت مسیحؑ کی نسبت و ماقتلوہ وماصلبوہ ولکن شبّہ لھم آیا ہے۔ یہی حصہ سر سیدؒ نے نقل کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے مصنّف کا نام معلوم ہو۔ جو عبارت سر سید مرحوم نے نقل کی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنّف وفات مسیح کا قائل ہے۔ میں نے تہذیب الاخلاق کا مجموعہ کلکتہ میں ڈھونڈھا تھا، مگر کتابوں میں ملا نہیں۔ کیوں کہ ادھر کتابیں غیر مرتب ہوگئی ہیں۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۱۳۷) (۴)

بندھیاچل مرزا پور

۴۔ جنوری ۴۶ء

عزیزی! شکر گزار ہوں کہ آپ نے تفسیر کشف الاسرار ڈھونڈھ نکالی۔ افسوس ہے کہ نسخہ ناقص ہے۔ بہر حال مصنّف کا سراغ نکال لیا جائے گا۔

پراونشیل الکشن کے متعلّق قدوائی صاحب سے آپ کی گفتگو ہوئی یا نہیں؟

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(حاشیہ صـــ ۲۵۴) اس تفسیر کا نام "کشف الاسرار وہتک الاستار" ہے۔ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اس کی دو ناقص جلدیں محفوظ ہیں۔ افسوس کہ اس سے نام مصنّف و کاتب اور سنِ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ مصنف وفات مسیحؑ کا قائل اور رفع کا مطلب رفع درجات لیتا ہے۔ (مکتوب الیہ)

سے آپ کو میرا پروگرام معلوم ہو جائے گا۔ کوئی موقعہ نکال کر آئیے اور ملاقات کیجیے۔
والسّلام علیکم۔

ابوالکلام

جناب محمد عبدالشاہد خاں صاحب شروانی
لہ دی منزل، بھوری ضلع علی گڑھ
یو۔پی

(۱۳۶) (۳)

بند صیاچل (مرزاپور)
۱۷ نومبر ۱۹۴۵ء

عزیزی! آپ کا خط اور رسالہ پہنچ گیا تھا۔ رسالہ کو میں نے سرسری نظر سے دیکھا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔ رسالہ کو "غدریہ" کے نام سے تعبیر نہ کیجیے۔ اسے "ثورۃ الہندیہ" کے نام سے مسمّیٰ کر سکتے ہیں۔ رسالہ رجسٹرڈ واپس کر رہا ہوں۔[1]

اردو میں عربی عطف کا استعمال حالتِ ترکیبی میں مستحسن نہیں۔ مثلاً "اب محبوس ظلم و تباہ شدہ ہے" اسے یوں لکھنا چاہیے "اب محبوس ظلم اور تباہ شدہ ہے"
جس تفسیر کی عبارت سرسید مرحوم نے تہذیب الاخلاق میں نقل کی تھی۔ اس کا نام غالباً "اسرار الغیب"[2] تھا۔ آپ کتب خانہ میں دیکھیے۔ کوئی تفسیر

[1] حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی کا ایک عربی رسالہ جس میں انھوں نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) اور اپنی عمر قید کالے پانی کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ مکتوب الیہ نے اس کا اردو میں ترجمہ کردیا ہے جو ثورۃ الہندیہ اور باغی ہندوستان کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔

[2] حاشیہ دوسرے صفحہ پر دیکھیے۔

(۱۳۹) (۶)

دہلی ۱۶- فروری ۵۷ء

عزیزی خط پہنچا۔

دو کام ہیں اور دونوں کی نوعیت مختلف ہے۔ ایک یہ کہ کسی رسالے کے لئے میرے حالات پر کوئی مضمون لکھ رہے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خاص طور پر اس موضوع پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ سردست آپ کے پیشِ نظر پہلا کام ہونا چاہیئے نہ کہ دوسرا۔ اس کے لئے مختصر اشارے کافی ہیں زیادہ کاوش نہ کیجئے۔ باقی رہا دوسرا کام وہ مستقبل کے حوالے کیجئے۔

مجھے امید ہے کہ یوپی حکومت اُس معاملہ میں پوری مستعدی سے کام لے گی مطمئن رہیئے۔

ابوالکلام

مولوی عبدالشاہد خاں شروانی

محمد علی روڈ، اپر کوٹ علی گڑھ

(۱۴۰) (۷)

نئی دہلی - ۱۷ر فروری ۵۷ء

مکرمی تسلیم

مولانا نے شاعری کا ذکر کرتے ہوئے شمس کی نسبت بریکٹ میں لکھا ہے کہ وہ ڈاکٹر سید حسین کے چچیرے بھائی تھے۔

اس کی تصحیح کر دیجئے۔

شمس سید حسین صاحب کے بھائی نہیں ماموں ہوتے تھے۔

محمد اجمل خاں

مولوی عبدالشاہد صاحب شروانی
اورنٹیل اسسٹنٹ لائبریرین
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱۳۸)

(۵)

[مکتوب الیہ ۱۸؍جنوری ۴۶ء کو حضرت مولاناؒ سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، الکشن کا زمانہ تھا اور مولاناؒ بہت مصروف تھے نیز دیگر حضرات کی موجودگی میں مولاناؒ بطور خاص آپ کی جانب توجہ نہ فرما سکے، اگرچہ بقول مکتوب الیہ" حضرت مولاناؒ خندہ پیشانی سے حسب دستور سابق پیش آئے، مختصر صحبت رہی، میں نے خود جلد ہی اجازت حاصل کرلی اور واپس چلا آیا" فرصت ملنے پر مولاناؒ نے درج ذیل مکتوب تحریر فرمایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے "عزیزی" کے جذبات کا کس درجہ خیال رکھتے تھے]

دہلی
۳۱؍جنوری سنہ ۱۹۴۶

عزیزی!

آپ اس دن آئے اور میں اس درجہ مشغول و بے کیف تھا کہ کچھ دیر بیٹھ کر آپ سے باتیں بھی نہ کرسکا۔ اسے میرے تغافل پر محمول نہ کیجیے گا۔ آپ کی محبت و اخلاص کی وجہ سے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں، اور معاملہ رسم و ظواہر سے گزر چکا ہے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

بہت ہیں۔ غالبًا اسی وجہ سے آپ کے استفسارات کے جوابات تحریر نہیں فرماتے یا
بہت ممکن ہے شملہ میں ان استفسارات کو کسی فائل میں رکھ دیا ہو۔

والسلام

محمد اجمل خاں

(۱۴۳) (۱۰)

۱۹۔ اکبر روڈ۔ نئی دہلی
۱۲۔ اکتوبر ۴۷ء

مکرمی تسلیم

آپ کے خطوط حضرت مولانا کو مل گئے۔ آج کل ڈاک کی حالت ذرا ابتر تھی۔
اس لئے دیر میں خطوط پہنچتے ہیں۔

تحقیقات کے لئے معاملہ کانگریس کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے، انشاء اللہ معلومات
ہونے پر آپ کو اطلاع دی جائے گی۔ حضرت مولانا بفضلہ اچھے ہیں۔

محمد اجمل خاں

(۱۴۴) (۱۱)

۱۹۔ اکبر روڈ۔ نئی دہلی
۵۔ جنوری ۱۹۴۸ء

برادرم تسلیم

مسٹر شمس الحق قریشی کے لئے آپ نے اوورسیز اسکالرشپ کے متعلق لکھا ہے۔ مولانا فرماتے
ہیں کہ

یہ معاملہ ابھی رکا ہوا ہے۔ جب ہوگا تو اخبارات میں اعلان ہو جائے گا۔
امید ہے آپ مع الخیر لکھنؤ سے علی گڑھ پہنچ گئے ہوں گے۔

نصیر احمد

(۱۴۱) (۸)

۱-۷-۴۷ء

مکرمی تسلیم

آپ کا خط مورخہ ۲۸- جون حضرت مولاناؒ کو مل گیا۔ جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے اس کے متعلق مولانا جو کچھ کر سکتے تھے، قدوائی صاحب سے کہہ چکے ہیں۔ اور ایک صاحب شمیمؔ نامی بھی آپ کے فرستادہ یہاں آئے تھے ان سے بھی یہی کہہ دیا گیا ہے۔

والسّلام

محمدؐ اجمل خاں

(۱۴۲) (۹)

نئی دہلی ۷- اگست ۴۷ء

مکرمی تسلیم

امتیازِ محمد خاں صاحب کے معاملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کچھ نہیں کر سکتی، وہ علاقہ اب پاکستان میں داخل ہو گیا ہے۔

قدوائی صاحب آپ کے معاملے میں جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے ان کو اور کسی خط کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مولانا ان سے گفتگو کر چکے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مولانا کے شیوہ کے خلاف ہے کہ وہ بار بار خط لکھیں۔

دوسرے معاملہ کے لئے آپ نے لکھا ہے کہ دو ایک روز میں حاضرِ خدمت ہو کر خط حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں زحمت نہ فرمایئے حضرت مولانا ایسے معاملات میں مداخلت کرنا پسند نہیں فرماتے۔ اور آج کل مصروف بھی

وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولّوھم و من یتولّھم فاولٰٓئک ھم الظّٰلمون ہ

(جو لوگ دین کے بارے میں تم سے جنگ کریں اور تم کو تمھارے وطن سے نکال دیں، اور جو لوگ تم کو ملک بدر کرنا چاہیں، ان کی حمایت پر اتر آئیں، خدا تعالےٰ ایسے ہی لوگوں سے دوستی اور موالاۃ کرنے سے روکتا ہے اور جو شخص ایسے لوگوں سے موالاۃ کرے گا، اس کا شمار ظالموں سے ہوگا۔)

"اِنَّمَا" پر غور کیجئے! یعنی جز این نیست کہ کذا و کذا۔ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوگیا کہ موالاۃ کی نہی صرف ان غیر مسلموں سے تعلق رکھتی ہے جنھوں نے مسلمانوں سے دین کے بارے میں قتال کیا ہو اور انھیں ہجرت پر مجبور کردیا ہو۔ ورنہ بصورتِ دیگر دنیوی معاملات میں ان سے تعاون اور اشتراکِ عمل ممنوع نہیں۔ مسلمان اپنے مصالح کے پیش نظر ایسا کر سکتے ہیں۔ خود آنحضرت صلعم کا طرزِ عمل اس بارے میں ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے قریشِ مکہ کے خلاف اطرافِ مدینہ اور مدینہ کے غیر مسلم قبائل کے ساتھ اتحادِ عمل کا معاہدہ کیا جو معاہدۂ صحیفہ کے نام سے پکارا گیا۔ اور اس میں یہ الفاظ لکھے کہ

"ہم اس مقصد میں متحد ہو کر اس طرح کام کریں گے کہ امتِ واحدہ نظر آئیں گے۔"

جس قرآن کی آیت آپ نے نقل کی ہے، اس قرآن کی سورۂ توبہ میں یہ بھی ہے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰیٓ اَوْلِیَآءَ۔ الآیۃ۔ ہندوستان میں ڈیڑھ سو برس سے برٹش حکومت قائم ہے۔ لوگ اس کی موالاۃ کرتے ہیں۔ ان کے مقاصد و اعمال کی راہ میں اپنی ساری زندگیاں ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے موالاۃ و تعاون میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ برطانوی نصاریٰ سے موالاۃ کرتے ہوتے کبھی قرآنِ حکیم کے احکام

(۱۴۵)

ایک معترض کے نام

نسیم باغ۔ سری نگر (کشمیر)
۲۸ ؍اگست ۱۹۴۵ء

جی فی اللہ! خط پہنچا، یہ بات کہ مسلمان کانگریس یا کسی دوسری انجمن میں شریک ہوں یا نہ ہوں وقت کے مطالعہ اور احوال وظروف کے مطالعہ پر موقوف ہے اور ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اپنے طریقِ فکر ونظر کے مطابق کسی خاص فیصلہ تک پہنچے، لیکن اس سلسلہ میں خواہ مخواہ اسلامی تعلیم کو درمیان میں لانا، تحریف آیاتِ قرآنی کی کوشش کرنا صحیح طرزِ عمل نہ ہوگا۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی حالت پھر ایک وقتی اور عارضی حالت ہے لیکن اسلام کی تعلیم وقتی نہیں ہے۔ وہ دائمی تعلیم ہے۔ اسے وقتی حالت کی بنا پر کھینچ تان کر محرّف کرنا نہایت افسوسناک ہے۔

آپ نے قرآنِ کریم کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے، وہ اور اس کی تمام ہم معنیٰ آیات احکامِ جنگ سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھیں مسلمانوں کی زندگی کے دائمی احکام سے کوئی تعلق نہیں۔ عرب کے اہلِ کتاب اور مشرک جب اسلام کے خلاف برسرِپیکار ہوگئے تو دو مقابل صفیں پیدا ہوگئیں، ایک طرف مسلمان تھے دوسری طرف محارب مشرک اور یہود ونصاریٰ۔ پس حکم ہوا کہ جو شخص ہمارے کیمپ سے تعلق رکھتا ہے اس کا دشمنوں کے کیمپ سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر رکھے گا تو دشمنوں ہی میں سے ہوجائے گا۔ چنانچہ سورۂ توبہ اور انفال کے تمام احکام اسی صورت حال سے تعلّق رکھتے ہیں۔ اس کا زمانۂ امن کے احکام سے تعلق نہیں ہے۔ اصل قرآنی تعلیم اس بارے میں وہی ہے جیسے سورۂ ممتحنہ میں صاف صاف واضح کردیا ہے۔

انّما ینھٰکم اللہ عن الّذین قاتلوکم فی الدّین واخرجوکم من دیارکم

(۱۴۶)

امام اکبر آبادی کے نام

[امام اکبر آبادی کے نام مولانا آزادؒ کا یہ ایک نجی خط ہے جو تمام تر مشوروں اور ہدایات پر مشتمل ہے لیکن خط میں ایک جملہ نہیں بلکہ حقائق و معارف کا سمندر کوزہ میں بند کردیا ہے، اگر آپ بھی اپنے آپ کو "خدمت گزارانِ حق" میں شمار کرتے ہیں تو پیشِ نظر رہے کہ:
"زمانہ نے خدمت گزارانِ حق کی کب موافقت کی ہے کہ آج کرے گا!۔
اس کی توقع نہ رکھیئے اور صرف ادائے فرض کی کوشش کیجئے۔ سعی و عمل کا میدان وسیع ہے۔"]

پونا۔
۱۵ر ستمبر ۱۹۴۵ء

میں آپ کو بھولا نہیں، میں بہت سی باتیں بھول جاتا ہوں لیکن دوستوں، عزیزوں کو نہیں بھول سکتا۔ آپ نے جن لفظوں میں حالات کی سرگزشت سنائی، اس سے دلِ دردمند بہت متاثر ہوا، میں جانتا ہوں کہ زخم خوردہ دلوں سے کیسی صدائیں اُٹھ سکتی ہیں۔

پیش ازیں صد داغ در دل داشتہ اکنوں یکے ست

آپ نے اچھا کیاکہ ازدواجِ ثانی سے احتراز کیا۔

نظیری کوئے عشق ہست این نہ شاہد بازی و رندی
کہ گر یارے رود از دستِ کس یارِ دگر گیرد!

میں نہایت خوش ہوں گا اگر آپ کو کوئی کارآمد مشورہ دے سکوں، یا آپ کے لئے کچھ کرسکوں۔ زمانے کی حالت کا آپ نے جو اندازہ کیا ہے صحیح ہے، لیکن زمانہ نے

لوگوں کو یاد آتے تھے؟ یاد رہے کہ ان ڈیڑھ سو برس کے اندر برٹش حکومت تمام نظامِ اسلامی کو تہ وبالا کرتی رہی اور بارہا اسلامی حکومتوں کے خلاف علانیہ صفوف جنگ آراستہ کیں۔ اسلامی اخوّت وشفقت اور اخوتِ انسانی کا پیغام عام ہے۔ ..... حاشا کہ اس کا دائرۂ نظر اس درجہ تنگ ہو، جتنا آپ نے بنا رکھا ہے۔

میں ایک موٹی سی بات آپ کو بتاتا ہوں، قرآن نے مسلمانوں کے لئے جائز رکھا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے ازدواج کریں۔ ازدواج کا رشتہ محبت ومودّت کا رشتہ ہے۔ اگر رشتہ سازگار ہو تو شوہر اپنی بیوی کا پرستار بن کر رہے گا اور اس سے بڑھ کر دنیا کا کوئی علاقہ اسے محبوب نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے نزدیک کسی حال میں بھی یہ جائز نہ تھا کہ مسلمان غیر مسلموں سے دنیوی علائق میں تعاون واشتراکِ عمل کریں تو کیونکر ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس کی اجازت دیتا کہ اپنے دل کی اور گھر کی مالکہ ایک غیر مسلمہ کو بنا کر رکھیں؟ اور اپنی دنیوی زندگی اس کے سپرد کردیں؟ اگر آپ کی رائے ہے کہ مسلمان ملک کی سیاسی جدوجہد میں غیر مسلموں کے ساتھ شریک نہ ہوں تو آپ ایسی رائے رکھ سکتے ہیں اور اپنے خیال کے مطابق اس کے وجوہ ومصالح بتا سکتے ہیں۔ لیکن خدا کے لئے قرآنِ حکیم کی آیتوں کو اس میں نہ لائیے اور اس کے احکام کو تفسیر بالرائے کا بازیچہ نہ بنائیے۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ یہود اور نصاریٰ توریت وانجیل کے الفاظ میں تحریف کرتے تھے، بلکہ یہ بھی تھا کہ ان کے معنیٰ کو الٹ پھیر کر کچھ سے کچھ بنا دیتے تھے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام آزاد

(۱۴۷)

حکیم نثار احمد صدیقی کے نام

(۱)

حبیّ فی اللہ!

آپ کا خط بر وقت مل گیا تھا، لیکن صحت کی کمزوری اور اشغال کے ہجوم نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ نہیں چاہتا کہ احباب و مخلصین کے جواب میں تاخیر ہو مگر ہو ہی جاتی ہے، اب سکون و تنہائی کی جستجو میں یہاں آیا ہوں تو موقع ملا ہے کہ کئی ہفتوں کی ڈاک پر نظر ڈالوں۔ امید ہے اس تاخیر کے لئے میری عذر خواہی مقبول ہو گی۔ مطلوبہ پیغام مُرسل ہے اسے جس طرح چاہیں کام میں لا سکتے ہیں۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابو الکلام کان اللہ لہٗ

بنہ صیاچل (ضلع مرزاپور)

۲/ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ [1]

پیغام

ضلع مظفر نگر اور مغربی یوپی کے دیگر اضلاع اپنی ۲ دو خصوصیتوں کے لحاظ سے تمام صوبے میں ممتاز ہیں ایک یہ کہ صوبے کے مسلمانوں کی بڑی تعداد انہی اضلاع میں سمٹی ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ ان اضلاع کے مسلمانوں میں قدیم زمانہ سے دینداری اور اتباع شریعت کا جذبہ دوسرے مقاموں سے کہیں زیادہ کار فرما رہا ہے۔ یہاں کے باشندے علماء اور صلحاءِ ملّت کا جس درجہ احترام کرتے ہیں اور علوم دینیہ و مدارس و معابد کی اعانت و خدمت میں جس درجہ کوشاں رہتے ہیں، اس کی مثالیں ملک کے

---

[1] مطابق ۸/ نومبر ۱۹۴۵ء۔

خدمت گزارانِ حق سے کب موافقت کی ہے کہ آج کرے گا؟ اس کی توقع نہ رکھیے اور صرف ادائے فرض کی کوشش کیجئے۔ سعی و عمل کا میدان وسیع ہے۔

آپ اپنے حالات پیش نظر رکھ کر کوئی گوشہ چن لے سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہوں حتے الوسع ضرور کروں گا۔ آپ خط و کتابت جاری رکھیں۔

والسلام علیکم۔

ابوالکلام آزاد

کوئی جماعت اور کوئی طاقت انھیں ان کے مطالبات کے حصول سے محروم نہیں رکھ سکتی۔

(۲) اور ہندوؤں کی عددی اکثریت کے خوف سے ترساں و لرزاں ہو کر تحریک آزادی کا ساتھ دینے سے انکار کردیں اور اس طرح برطانی شہنشاہیت کا ہاتھ مضبوط کرتے رہیں۔

جمعیۃ العلماء ہند اور دوسری حریت پسند جماعتوں نے پہلا طریقہ اختیار کیا ہے اور مسلم لیگ نے دوسرا۔ جو مسلمان اسلام کے شرف و عزت کا احساس رکھتے ہیں اور خوف و تذبذب کی جگہ عزم و یقین اور خود اعتمادی کی راہ اختیار کرنی چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند کا ساتھ دیں اور طلب و سعی کے ہر میدان میں اس کی کوششوں کو کامیاب بنائیں۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین ھدٰھم اللہ واولٰئک ھم اولوا الالباب ط فقط

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

بند صیا چل۔ ۲/ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

(۱۴۸) (۲)

[مکتوب الیہ نے سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق استفسار فرمایا تھا کہ بعض مفسرین نے سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ وہ بیری کا ایک گھنا سایہ دار درخت ہے اس کا پھل بہت بڑا ہوگا اور جنتی اس کے نیچے آرام کریں گے۔" ان اقوال کی حقیقت کیا ہے؟ نیز گزارش کی تھی کہ دستِ خاص سے جواب مرحمت فرمایا جائے۔ حضرت مولاناؒ نے درج ذیل جواب سے سرفراز فرمایا۔]

دوسرے حصوں میں کم ملیں گی۔ آج سے تقریباً دو سو برس پہلے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا کہ زمانہ گزشتہ میں دیارِ شرقیہ علم اور دینداری کے سرچشمے تھے۔ لیکن ہمارے زمانے میں حوادث و انقلابات سے حالات دگرگوں ہو گئے ہیں اور اب اگر کسی خطہ کو اس سعادت میں حصہ وافر ملا ہے تو وہ دیارِ غربیہ ہیں یعنی روہیلکھنڈ اور سہارنپور وغیرہ دیارِ مغربی و شمالی۔ اس ڈیڑھ سو برس کے اندر حوادث و انقلابات نے تاریخ کے اور بہت سے ورق الٹ دیئے۔ الحمدللہ یہ بات جس طرح اس زمانے میں کہی جاسکتی تھی، آج بھی کہی جاسکتی ہے وما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است
مے و خمخانہ با مہر و نشان ست!

ایسی حالت میں اگر ان اضلاع کے مسلمانوں سے یہ توقع رکھوں کہ وہ ملک کی سیاسی کشمکش میں وقت کی گمراہ کُن صداؤں سے متأثر نہ ہوں گے اور اسی مسلک کا ساتھ دیں گے جو جمعیۃ علماء ہند کا مسلک ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی بے محل توقع نہ ہوگی ۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم، ورنہ!
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کُنند

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بحالتِ موجودہ دو ہی طریقے قابلِ عمل تھے:۔

(۱) ملک کی آزادی کے لئے کوشاں ہوں اور جہاں تک مسلمانوں کی جماعتی زندگی کے مستقبل کا تعلق ہے خود اپنے اوپر بھروسہ رکھیں۔ کسی دوسری طاقت کی طرف نظر نہ اٹھائیں۔ اگر ہندوستان کو برطانوی قبضہ سے نجات ملتی ہے تو اس صورت میں مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہ ہوگا بلکہ فوز و فلاح کی بشارت ہوگی۔ کیونکہ ملک کی

(۱۴۹)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے نام

[مکتوب الیہ نے مولاناؒ سے استفسار کیا تھا کہ ابن جوزی اور ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ پر تنقید کی اور ان کی مخالفت کی ہے لیکن محدثین ہی میں صوفیہ بھی ہوتے ہیں۔ جیسے خاندانِ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خلفاء۔ سید احمد بریلوی۔ مولانا عبداللہ غزنوی وغیرہم۔ اس لئے تحقیق طلب امر یہ ہے کہ صوفیہ کا طریقہ صحیح ہے یا محدثین کا مسلک۔ اور اگر دونوں ہی افراط و تفریط سے نہیں بچ سکے ہیں، تو اصحاب اقتصاد اور اہلِ حق کا راستہ کونسا ہے اور عملی طور پر اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے؟ اس کے جواب میں مولاناؒ نے یہ مکتوب تحریر فرمایا، مکتوب الیہ نے اپنے کسی پہلے کے خط کا جواب نہ ملنے پر نیازمندانہ شکوہ بھی کیا تھا، مولاناؒ نے پہلے اس پر اظہارِ تاسف کیا ہے۔ یہ مکتوب مولاناؒ نے بغیر کسی کلمۂ دعائیہ کے شروع کر دیا ہے۔]

بند صیا چل۔ مرزا پور۔
۲۲ر نومبر ۱۹۴۵ء

جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، مجھے یاد نہیں کہ کشمیر میں تمہارا خط مجھے ملا ہو۔ صحت کی کمزوری اور اشغال کا ہجوم بعض اوقات مجبور کر دیتا ہے، تاہم خطوں کے جواب میں عمداً تساہل میری عادت کے خلاف ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ معاملہ تمہارے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوا۔

تم نے اپنے افکار و عقائد کا جو کچھ حال لکھا ہے، اس سے نہایت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ علم و عمل حق کی مزید توفیق عطا فرمائے۔

[بجواب مکتوب ۲۰/ مارچ ۱۹۵۲ء]

سدرۃ المنتہیٰ[1] سے مقصود ایک انتہائی محل ہے۔ ان روایتوں کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ عالم مثال میں سدرہ کی صورت ایک درخت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہو۔ بہرحال آیت کا مفہوم عام ہے اسے خاص کرنا ضروری نہیں اور معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی حقیقت کا ہم ادراک نہیں کر سکتے۔"

ابوالکلام

---

[1] ملاحظہ ہو قرآن مجید سورۃ نجم آیت ۱۴۔

(۱۵۰)

مولانا افتخار احمد بلخی کے نام

[مکتوب الیہ نے قرآن مجید کی آیت والذین ھم لفروجھم حٰفظون ○ الا علیٰ ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین ○ (سورۂ مؤمنون۔ آیت ۵۔ ۶) کے مولانا آزادؒ کے ترجمہ اور تفسیری نوٹ کے متعلق بعض شبہات کا اظہار فرمایا تھا۔ مولاناؒ نے اپنے سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب سے درج ذیل جواب لکھوایا۔]

نئی دہلی
۲۵ ستمبر ۱۹۴۶ء

مکرمی! تسلیم،

عرب میں اس وقت دو طرح کی عورتیں تھیں۔

۱۔ حرائر و محصنات۔ ۲۔ لونڈیاں

لونڈیوں کی حیثیت کو قرآن نے ہر جگہ تملیک ید سے ظاہر کیا ہے، چونکہ لونڈیوں سے نکاح کرنا ذلّت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لئے قرآن نے زور دیا کہ جس طرح مسلمان شریف زادیوں سے نکاح کر سکتے ہیں اسی طرح ان سے بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ جو تملیک ید کے ذریعہ غلامی میں آ چکی ہیں۔

میرے ناچیز فہم میں قرآن کی یہی تفسیر عام مسلک کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی دوسرے مسلک پر مطمئن ہیں تو آپ وہی مسلک پیش نظر رکھیں۔

راقم محمد اجمل خاں
منجانب مولانا ابوالکلام آزاد

ابن جوزی اور ابن تیمیہ وغیرہما محدثین نے صوفیہ کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ صوفیائے کاملین کے مخالف تھے۔ خود ابن تیمیہ نے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے اور ان کے شاگرد ابن قیم نے "منازل السائرین" کی شرح لکھی ہے۔

تم نے میرے شخصی تأثرات دریافت کئے ہیں، میں زندگی بھر کی کدوکاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق کے میسّر نہیں آتا۔ ومن لم یذق لم یدر۔

اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو نوافل تہجد کی مداومت کرو۔ اور فرائض کے علاوہ تمام نمازیں حتی الوسع تنہائی میں پڑھی جائیں اور استحضار قلب کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ کمیت سے زیادہ کیفیت کا لحاظ رکھنا چاہیئے، اور اس بات سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے کہ کشود کار نہیں ہوتا۔ اگر استقامت کے ساتھ سعی جاری رہی تو بحکم والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا، کشود کار یقینی ہے، طلب وسعی کی زندگی بجائے خود اپنے اندر لذت و حلاوت رکھتی ہے اس سے اپنے آپ کو محروم کیوں رکھیں۔

میں یہاں سے ۲۔ ڈسمبر کو کلکتہ جاؤں گا۔ خط کلکتہ کے پتہ پر لکھا جائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام کان اللہ لہٗ

یہ میری ذاتی رائے ہی نہیں بلکہ گورنمنٹ آف انڈیا کا طے شدہ مسلک ہے۔
پس جہاں تک حکومت کا تعلق ہے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس معاملہ میں کوئی رکاوٹ پیش آئے۔ صرف اس کی ضرورت ہوگی کہ آپ کی جانب سے باقاعدہ ایک تحریر آجائے اوراس بناء پر ضروری احکامات عمل میں آجائیں۔

لیکن آپ تسلیم کریں گے کہ معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہوجاتا، اصل سوال وقت کے حالات اور مقتضیات کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالات میں یہ بات قرینِ مصلحت ہوگی کہ آپ کانفرنس کا اجلاس بھاولپور میں کریں؟ میری رائے میں اس کا قطعی جواب نفی میں ہے اور مجھے یقین ہے کہ مزید غور وفکر کے بعد آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے۔ میرا مشورہ یہی ہوگا کہ اس سال آپ بھاولپور میں کانفرنس نہ کریں۔ اگر یہ ممکن ہے کہ انڈین یونین کے کسی دوسرے شہر میں کانفرنس منعقد ہو، تو اس کی کوشش کیجئے۔ اگر قلتِ وقت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر اس سال سالانہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ التوا کے لئے معقول اور آشکارا عذر موجود ہے، یعنی سفر کی مشکلات وغیرہ۔

مخلصکم الوفی

ابوالکلام

(۱۵۲) (۲)

دہلی — وزیر تعلیمات ۔ بھارت

۱۳ر دسمبر ۴۸ء

صدیق مکرم

نامۂ گرامی کے لئے شکریہ۔ خواستگار معافی ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی۔
۱۵۔ دسمبر والی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ ابھی کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی۔ جب کبھی

(۱۵۱)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی علیہ رحمۃ آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام

(۱)

[۱۹۴۶ء میں کانفرنس کا اجلاس ریاست بھاولپور میں ہونا طے پایا تھا لیکن تقسیم ملک کے ہنگاموں، بلوؤں اور فسادات کا دَور شروع ہوگیا۔ اس طرح نہ صرف ۱۹۴۶ء کا سال گزر گیا بلکہ ۱۹۴۷ء بھی قریب الختم تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کارکنانِ کانفرنس نے پھر تگ و دو شروع کی۔ کانفرنس کے مفاد کے پیش نظر خیال یہی تھا کہ اجلاس بھاولپور میں کیا جاتے، لیکن مولانا ابوالکلام آزادؒ نے حالات کے پیش نظر جو مشورہ دیا، اسے قبول کر لیا گیا اور اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے بعد "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے جناب سید الطاف علی بریلوی صاحب کی سعی و کاوش سے جنوری ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں اس ادارہ کا احیاء ہوا۔]

صدیق مکرم! نامہ گرامی مورخہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء وصول ہوا۔ آپ کی رائے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ دونوں ریاستوں کے تعلیمی و ثقافتی روابط میں انقسام و تحدید کے الگ الگ دائرے بن جائیں۔ آج جب ہم تمام اقوامِ عالم کو ایک دوسرے سے قریب تر اور مربوط دیکھنا چاہتے ہیں تو اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ خود اپنے ملک کے اندر ایک دوسرے سے منقطع ہوجائیں۔

(۱۵۴)

جناب عبید الرحمٰن خاں شروانی کے نام

تعزیت نامہ بر وفات حضرت شروانیؒ

جناب عبید الرحمٰن خاں !

(نواب صدر یار جنگ کے انتقال کی) افسوسناک خبر سُن کر انتہائی صدمہ ہوا۔ آپ کے ساتھ اور مرحوم کے دیگر افراد خاندان کے ساتھ میری دلی تعزیت !

ابوالکلام

موقع پیدا ہو گا، آؤں گا اور ملاقات سے شاد کام ہوں گا۔

حبیب منزل میں قیام کی دعوت کے لئے شکر گزار ہوں۔ لیکن کیا اس کی ضرورت تھی؟ آپ دعوت دیں یا نہ دیں، میں اگر کہیں ٹھہر سکتا ہوں تو وہ صرف آپ ہی کا کاشانۂ محبت ہے۔

دریں شہر سعدیؒ شناسیم و بس!

ملا صاحب کو سلام شوق۔

ابوالکلام

(۱۵۳) (۳)

وزیر تعلیمات ۔ بھارت

۲۴ مئی ۵۰ء

صدیق مکرم

نامۂ گرامی کے لئے شکریہ۔ مشتاق احمد صاحب کے لئے کسی تقریب کی احتیاج نہ تھی ان کی ملاقات نے نواب وقار الملک مرحوم کی یاد تازہ کر دی اور ۴۵ برس پیشتر کی گزری ہوتی دنیا پھر ایک مرتبہ سامنے آگئی۔ سوچتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دنیا ہندوستان کی دنیا نہ تھی، کوئی دوسرا ملک تھا جس کا نام و نشان بھی اب باقی نہ رہا۔

فکانہا وکانہم احلام

میں مشتاق احمد صاحب کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔ ملا صاحب کو سلام شوق۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام

(۱۵۶)

بھانجی کے نام[۱]

وزیرِ تعلیمات ۔ بھارت

دہلی ۔ ۱۳۰؍اپریل ۱۹۴۸ء

عزیزی ! تمہارا خط ... ملا ۔ تمہارا گھر میرا گھر ہے مجھے وہاں ٹھہرنے میں تامل کیوں ہونے لگا ؟ لیکن وہاں کاموں کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ باندرے میں قیام اس کے ساتھ جڑتا نہیں ۔

اس لئے تم مجھے دوسری جگہ ٹھہرنے دو اور اس بارے میں اصرار نہ کرو ۔ انشاء اللہ میں تمہارے یہاں آؤں گا اور سب سے ملوں گا ۔ طاہر کو دعا اور بچوں کو پیار ۔

ابوالکلام

---

[۱] زوجہ محمد طاہر خاں (بمبئی) ۔

(۱۵۵)

رشید احمد صدیقی کے نام

دہلی

۱۴ر جنوری ۱۹۴۸ء

صدیقی، کوئی صاحب خورشید الاسلام صدیقی ہیں کالج میگزین میں اُن کا ایک مضمون شبلی مرحوم پر نکلا ہے۔ انھوں نے شبلی مرحوم کی نسبت جو رائیں قائم کی ہیں اُن سے مجھے کوئی تعلّق نہیں ہے لیکن ان کا اسلوب تحریر دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میں نے ہمیشہ افسوس کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ اُردو میں ایک عام تقلیدی رنگ کے سوا تجدّد و تازگی مفقود ہے، ہمارا نیا طبقہ نئی تعلیم کی پیداوار ہے اس لئے اُن سے توقع کی جاتی تھی کہ یورپ کے ادبی اسالیب و مذاہب کو اپنے اندر جذب کریں گے اور تجدّد و تازگی کے نمونے نمایاں کرسکیں گے لیکن بہت کم کوئی ایسی چیز نظر سے گزرتی ہے میں ادھر ستّرہ^۱۷ اٹھارہ^۱۸ برس سے انگریزی مطالعہ میں کھو گیا ہوں اور اُردو اخبار و رسائل کی کم خبر رکھتا ہوں، اس لئے ہو سکتا ہے ادھر کی رفتار ترقی مجھے معلوم نہ ہو۔

بہرحال یہ مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی انھیں معلوم ہو یا نہ ہو لیکن انھوں نے ایک فرنچ اسکول کا تتبّع کیا ہے۔

یہ صاحب کہاں ہیں، اور کیا کرتے ہیں ممکن ہو تو مطلع کیجئے۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

انتخاب کرلینا ضروری ہے، وہ چاہے لاہور یا کراچی ہی کیوں نہ ہو۔
جب بابائے اردو نے ایک مکتوب میں اس خیال کا اظہار کیا تو مولاناؒ
نے اس غلط فہمی کو دور کر دینا ضروری خیال کیا اور یہ مفصل مکتوب
تحریر فرمایا۔]

دہلی
۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

جناب من!

آپ اپنے خط مورخہ ۸ار اکتوبر میں لکھتے ہیں، "آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا اس سے مجھے اتفاق ہے۔" مشورہ سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کر دیا جائے۔ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورتِ حال کی جو تعبیر کی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ براہِ عنایت اپنے فیصلے کو میرے مشورہ کا جامہ نہ پہنائیے۔

اس سلسلے میں جو حالات پیش آئے وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

دہلی کے فساد کے بعد جب آپ آئے تو آپ نے مجھے یقین دلایا کہ انجمن بدستور اپنے کاموں کو یہاں جاری رکھنا چاہتی ہے اور آپ ایک نیا مکان دفتر کے لئے ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور ایک عرصہ تک کوئی خبر آپ کی نہیں ملی۔ اب آپ آئے تو آپ کے پرمٹ سے معلوم ہوا کہ آپ نے انڈین یونین کی سکونت ترک کر دی ہے۔ اور پاکستان کے باشندہ ہونے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ کراچی میں آپ نے ایک مکان حاصل کر لیا ہے اور انجمن کو وہاں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد جب آپ مجھ سے ملے تو میں نے یہ رائے ظاہر کی کہ تعطّل و تعلیق کی موجودہ صورت حال جلد سے جلد ختم کر دینی چاہیئے۔ آپ نے ایک قدم

(۱۵۷)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور کے نام

[تقسیم ملک کے بعد بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم و مغفور کی عین خواہش تھی کہ انجمن ترقی اُردو، ہندوستان و پاکستان، دونوں ملکوں میں کام کرے۔ پاکستان میں کام کی تنظیم کے لئے بابائے اُردو نے تقسیم ملک کے بعد، اکتوبر ۱۹۴۸ء سے قبل دو سفر بھی کئے تھے اور یہاں کام کی ابتدا بھی ہو چکی تھی نیز محبانِ اُردو، زور ڈال رہے تھے کہ بابائے اردو پاکستان آجائیں اور یہاں منظم طور پر کام کریں۔ یہاں کام کرنے کا وسیع میدان تھا، ضرورت تھی، اعتماد کی فضا تھی اور حکومت اور عوام کی طرف سے تعاون کے پُر امید وعدے تھے دوسری طرف ہندوستان میں اب ان کو خود بھی حیدرآباد سے قدیم تعلق کی بنا پر شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ ان حالات میں بابائے اردو نے پاکستان کے محبانِ اُردو کے اصرار، ہندوستان کے حالات سے متاثر ہو کر اور اپنے ہمدردوں کے مشورے کے مطابق پاکستان میں آکر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوسری مرتبہ شروع اکتوبر میں جب بابائے اُردو ہندوستان واپس گئے اور مولانا آزاد سے ملاقات کی تو مولانا آزاد نے آپ کو مشورہ دیا کہ اگر آپ پاکستان میں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ لاہور یا کراچی کو اپنا صدر مقام بنائیے، یہ ٹھیک نہیں کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔" بابائے اردو نے اس کو پاکستان میں رہ کر کام کرنے کا مشورہ سمجھ لیا، حالانکہ مولانا کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک شخص اور ایک ادارہ کے لئے اب بیک وقت دونوں ملکوں میں کام کرنا ممکن نہیں، اس لئے ایک جگہ کا

(۱۵۸)

حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کے نام

[مدینہ کے ایڈیٹر نے "خانقاہ عظمتِ اسلام" کے عنوان سے حضرت مولانا پر ایک طویل اور موثر اداریہ تحریر فرمایا تھا اس میں جماعتِ اسلامی کے مقصد "ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام" کے بارے میں حضرت مولانا کی رائے نقل کی تھی۔ مکتوب الیہ نے حضرت مولانا سے دریافت کیا تھا کہ کیا جماعتِ اسلامی کے مقصد کے بارے میں آپ کی رائے کی جو ترجمانی کی گئی ہے، وہ صحیح ہے؟ حضرت مولانا نے درج ذیل جواب دلوایا۔
اس مکتوب سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولانا کو جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا تھا۔]

نئی دہلی	پرائیویٹ سکریٹری
۷ رستمبر سنہ ۱۹۵۱ء	وزیر تعلیمات ۔ بھارت

جنابِ من!

حضرت مولانا نے مجھے آپ کے خط مورخہ ۲۴ راگست سنہ ۱۹۵۱ء نمبر ۲۷ کی رسید بھیجنے کی ہدایت کی ہے۔

مولانا نے مدینہ کا وہ مضمون نہیں دیکھا، جس کا آپ نے اپنے خط میں حوالہ دیا ہے۔ البتہ اس اخبار کے ایڈیٹر[1] دہلی آئے تھے اور مولانا سے ملے تھے اس ملاقات میں جماعتِ اسلامی ہند "کا تذکرہ بھی آیا تھا۔ مولانا نے اس جماعت کے مقاصد دریافت کئے اور جب مولانا کو بتلایا گیا کہ اس جماعت کا مقصد ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے، تو مولانا کو تعجب ہوا اور انھوں نے فرمایا کہ ایسے خیالات مسلمانوں کے

---

[1] ضیاء الحسن فاروقی صاحب۔ جو بعد میں جمعیۃ العلماء ہند کے انگریزی ہفت روزہ "مسیج" کے ایڈیٹر ہوگئے تھے۔

پاکستان میں جمایا ہے، اور دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل انجمن کے لئے مفید نہ ہوگا۔ اس پر آپ نے کہا کہ آپ کو کراچی میں ایک بہت اچھا مکان مل گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ انجمن کو وہاں منتقل کر دیں، پس اس بارے میں آپ نے جو رائے بھی قائم کی ہے، آپ کی رائے ہے۔ اسے میرے مشورہ سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ انجمن ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی خواہش مند نہیں ہے کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لئے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں نہ لانے کی پوری ذمہ داری ارکانِ انجمن کے سر ہے۔ چار لاکھ عمارت کے لئے اور چالیس ہزار سالانہ انجمن کے کاموں کے لئے گورنمنٹ منظور کر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گورنمنٹ انجمن کو گرانٹ دے رہی ہے، وہ انجمن کے اجراءِ کار کی مخالف کیسے ہو سکتی ہے!

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ گرانٹ کی درخواست انٹرم گورنمنٹ کے زمانہ میں کی گئی تھی۔ اس وقت مالیات کا صیغہ مسٹر لیاقت علی کے ہاتھ میں تھا، انھوں نے گرانٹ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو جب نئی قومی حکومت بنی تو اس کے عہد میں از سرِ نو یہ معاملہ اٹھایا گیا اور گرانٹ منظور کی گئی۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجمن پورے سکون اور جمعیت کے ساتھ اپنے کاموں کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ بشرطیکہ کام کرنے کا ارادہ ہو۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، اس لئے مہربانی کر کے یہ خط ۲۶ر اکتوبر کے مجوزہ جلسہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ والسّلام

ابوالکلام

(۱۵۹)

حکیم عبداللطیف صاحب (احمد آباد) کے نام

۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۷؍ستمبر ۱۹۵۳ء

جناب محترم۔ تسلیم

جی ہاں! جلد سوم تیار ہے اور جلد اس کی اشاعت کا انتظام ہونے والا ہے۔ مقدمہ اور البیان اگر ضرورت ہوگی تو انشاء اللہ ضرور شائع ہوگا۔ بالفعل جلد سوم کی طباعت ہوگی۔

محمد اجمل خاں

فائدے کی بجائے ان کے لئے سخت مضر ثابت ہوں گے۔

اگر مدینہ کے ایڈیٹر نے حضرت مولانا کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے تو صحیح ہے۔[1] لیکن اگر حضرت مولانا سے اس کے علاوہ کچھ اور باتیں منسوب کی گئیں ہیں تو مولانا کو افسوس ہے کہ اس مضمون کو پڑھے بغیر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

آپ کا مخلص

این۔ ایم۔ مسعود

---

[1] مولانا نے انہی خیالات کا اظہار کیا تھا۔

(۱۶۲) (۳)

۱۶ر نومبر ۱۹۵۵ء

برادر گرامی قدر تسلیم

آپ کا مکتوب مورخہ ۹ر نومبر ۵۵ئہ پہنچا۔ آپ نے نمونہ اخبار مع مکتوب روانہ فرمایا تھا، وہ بھی ملا اور حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ماشاء اللہ کتابت وطباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔

میں نے عرصہ ہوا لکھا تھا کہ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ کبھی موقع ہو تو آپ دہلی آ کر مل لیں۔ اب اس موقع پر بھی حضرت مولانا نے یہی فرمایا ہے۔ پہلے خط کا ہاں، نہیں میں کوئی جواب نہیں ملا۔ معلوم نہیں خط آپ تک پہنچا بھی یا نہیں! اس مرتبہ جواب کا انتظار رہے گا۔ اس کے بعد آپ کے "طلبی مضمون" کے سلسلے میں کچھ عرض کروں گا۔

اگر زمزم کمپنی لمیٹڈ کا پتہ معلوم ہو تو تحریر فرمائیے۔

نیاز مند

اجمل

(۱۶۳) (۴)

[محترم شورش کاشمیری صاحب "چٹان" کا ایک شاندار نمبر نکالنے والے تھے اور اس کے لئے مولانا سے کوئی مضمون یا خصوصی پیغام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس غرض سے شورش صاحب نے اواخر دسمبر ۵۵ئہ میں دلی کا سفر کیا، اس موقع پر حضرت مولانا نے درج ذیل پیغام عنایت فرمایا۔]

وزیر تعلیمات۔ بھارت

عزیزی شورش!

(۱۶۰)

شورش کاشمیری کے نام

(۱)

۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۳۰ر جولائی ۱۹۵۴ء

برادرِ محترم تسلیم

گرامی نامہ بلا تاریخ ملا۔ آپ نے بستر علالت سے یاد فرمایا۔ اس یاد آوری کا شکریہ۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ کبھی موقع ہو تو دلی آ کر مل لیں۔

استقلال نمبر کب نکلنے والا ہے؟ آپ کا پرچہ یہاں پہنچ جاتا ہے اس کا شکریہ قبول فرمائیے۔ خدا کرے آپ جلد صحت یاب ہو کر یہاں آ سکیں۔

نیاز مند
اجمل

(۱۶۱)

(۲)

۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۶ر جون ۱۹۵۵ء

برادرم تسلیم

گرامی نامہ (بلا تاریخ) ملا۔ حضرت مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا ہے کہ آپ یہاں کیوں نہیں آتے، اور دو چار دن ٹھہرتے؟

امید ہے کہ آپ فروری میں ضرور وقت نکال کر آئیں گے۔

بفضلہٖ مولانا بالکل اچھے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کی شوریدہ سری بدستور ہو گی۔

محمد اجمل خاں

لکھی گئی ہیں۔ قطعاً بے اصل ہیں۔ ایک یہ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے انتقال پر مولانا
نے کوئی نوٹ اخبار وکیل میں لکھا، دوسرے یہ کہ ان کے جنازے کے ساتھ گئے۔
یہ دونوں باتیں یک قلم بے بنیاد ہیں۔ سالک صاحب نے اخبار میں تسلیم کر لیا ہے کہ یہ
دونوں باتیں ناواقفیت میں ان کے قلم سے نکل گئیں، لیکن اخبار کے بیان سے کیا ہوتا
ہے۔ کتاب فروخت ہو رہی ہے اور غلط فہمی پھیلتی جاتی ہے اس لئے وہ آپ سے توقع
کرتے ہیں کہ ایک صفحہ چھاپ کر کتاب کے اندر لگا دیا جائے اور اس میں یہ بات صاف
کر دی جائے کہ نادانستگی کی وجہ سے یہ دونوں باتیں لکھی گئیں جو قطعاً غلط ہیں۔
مہربانی کر کے اس کا انتظام کیجئے اور صورت حال سے مطلع فرمائیے امید
کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

راقم نیاز مند
محمد اجمل خاں

بآں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند!
ابوالکلام

(۱۶۴) (۵)

[مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کی کتاب "یارانِ کہن" بسلسلۂ مطبوعات چٹان، جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ حضرت مولانا آزادؒ سے متعلق اس کتاب میں بعض باتیں خلاف واقعہ نکل گئیں۔ مولانا آزادؒ نے اپنے سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب کے ذریعے ان باتوں کی تردید فرمادی۔ مولانا سالک مرحوم نے، مولانا آزادؒ کی تردید کو تسلیم کرلیا۔ اور ایک اخباری بیان بعنوان "مولانا عبدالمجید سالک کی جوابی تصریحات"۔ ہفت روزہ چٹان لاہور مورخہ ۲۰؍ فروری ۱۹۵۶ء صفحہ (۷) میں شائع کرادیا۔ لیکن مولانا آزادؒ کے نزدیک ایسی صورت میں کہ کتاب بازار میں فروخت ہورہی تھی، صرف اخباری بیان کافی نہ تھا۔ اس سلسلے میں محمد اجمل خاں صاحب کا ایک خط شورش کاشمیری کو وصول ہوا۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔]

۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی
۱۴؍ اپریل ۱۹۵۶ء

برادرم شورش صاحب۔ تسلیم

حضرت مولانا کو بہت افسوس ہے کہ جو ایسے صاحب ہیں کہ جن کو وہ اپنا عزیز سمجھتے ہیں انھوں نے بلا قصد اپنے کو غلط فہمی کی اشاعت کا ذریعہ بنادیا۔ سالک صاحب نے کتاب "یارانِ کہن" لکھی اور آپ نے اسے شائع کیا۔ دو باتیں جو مولانا کی نسبت

(۱۶۶)

تعزیت نامہ بر وفات حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم

[حضرت مولانا آزادؒ نے یہ خط خواجہ حسن نظامیؒ کی وفات پر تحریر فرمایا تھا اور منادی میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خط کس کے نام ہے۔ دریافتِ حال کے لئے ایڈیٹر منادی کو کئی خط لکھے گئے لیکن کسی کا جواب نہیں آیا۔]

[اگست ۵۵ء]

جناب محترم تسلیم

خواجہ صاحب کی وفات پر نہایت قلق ہوا۔ براہِ کرم ان کے تمام عزیزوں کو تعزیت کا پیام پہنچا دیجئے۔

ابوالکلام

(۱۶۵)

جناب نعمت اللہ خاں کے نام

۴۔ کنگ اڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی

۱۱۔ دسمبر ۵۴ء

جناب محترم تسلیم

آپ کا ۲۔ دسمبر کا خط ملا حضرت مولانا کوشش کر رہے ہیں کہ جلد تینوں جلدیں شائع ہو سکیں لیکن کوئی خاص وقت کہنا مشکل ہے۔

محمد اجمل خاں

جہاں تک قیمت کا تعلق ہے اس کے لئے آپ کی اقساط کی تجویز مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ پبلشرز کو لکھیں۔ یہ کام پبلشرز کا ہے کہ وہ کس طرح تجارت کرتا ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ قلیل البضاعت انسان اسے نہ خرید سکیں گے تو اس کے لئے ہر ملک میں یہ طریقہ ہے کہ اہلِ ثروت چند مخصوص اشیاء کے سوا اپنے گھر میں چیزیں جمع نہیں کرتے۔ خصوصاً کتابوں کے معاملہ میں تو یہ حال ہے کہ گاؤں گاؤں میں کتب خانہ ہیں۔ پہلے بھی مسلمانوں کا یہ طریقہ تھا۔ مسجد ہی مدرسہ، معبد، مکتب سب کچھ تھا۔ لہٰذا اگر اہلِ ثروت چاہیں تو بے بضاعت بھائیوں کے لئے اپنی کتابیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ فاضل اشیاء وقف کر سکتے ہیں۔

ویسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔

آپ کے مکتوب سے آپ کی علم دوستی ظاہر ہے۔ امید ہے آپ اپنے شہر اور قرب وجوار میں تحریک کتب خانہ جاری کر کے انفاق فی سبیل اللہ کا دروازہ کھول دیں گے۔

محمد اجمل خاں

ٹکٹ واپس ہیں۔

(۱۶۸)

اعظم گڑھ کے چند حضرات کے نام[1]

[اُس وقت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی درج ذیل عبارت کہ "رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اس معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے" موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی اور حضرات اکابرینِ دیوبند نے اس کو قابلِ اعتراض قرار دیا تھا۔ چنانچہ اعظم گڑھ کے چند حضرات نے یہ عبارت مولانا آزاد مرحوم کی خدمت میں لکھی اور اس بارے میں استفسار فرمایا کہ آیا واقعی یہ قابلِ اعتراض و رد ہے؟ استفسار میں مولانا مودودی صاحب کا نام ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔ مولانا آزادؒ نے درج ذیل جواب عنایت فرمایا۔]

۲۲ را پریل ۵۷ء

جنابِ محترم تسلیم

آپ کا خط ملا۔ اس عبارت کا بظاہر یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ایسی معصوم ہستی جس کا ہر قول و فعل بلا چون و چرا تسلیم کیا جائے صرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اور کوئی شخصیت ایسی نہیں۔ انبیاءِ سابقین کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ بظاہر مقصود اسلام اور پیروانِ اسلام ہیں یہ ایسی ہی بات ہے، جیسی امام مالکؒ سے منقول ہے کہ ہر شخص کی بات پکڑی جائے گی اور چون و چرا کیا جاسکے گا "الاّ صاحب ہذہ القبر" اور آنحضرتؐ کی قبر کی طرف اشارہ کیا۔ ہاں جس

---

[1] مطلوب احمد، حافظ ابوالحسن اور جمیل احمد صاحبان۔ ساکنان سرائے میر ضلع اعظم گڑھ۔

(۱۶۷)

اقبال صدیقی[1] صاحب کے نام

[مکتوب الیہ نے مولانا آزادؒ سے یہ سوال کیا تھا کہ :
پروپگینڈا کیا جاتا ہے کہ اس ایٹمی دور میں مذہب کی ضرورت نہ صرف کم بلکہ ختم ہوگئی ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور معترضین کو کیا جواب دیا جائے۔ مولاناؒ نے مذکورہ ذیل خیالات کا اظہار فرمایا۔]

بجواب مکتوب ۳ر ستمبر ۵۵ء

(مکرمی تسلیم)

مولانا فرماتے ہیں!

مذہب کی اہمیت کبھی ختم نہ ہوگی۔ مذہب اطمینانِ قلب کی دوا ہے۔ اگر مریض یہ جان لے کہ وہ مریض ہے تو ضرور معالج کی تلاش کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان یا کوئی یہ بھی جانتا ہے کہ وہ بیمار ہے یا نہیں؟ اور بیماری کا اچھا معالج اور صحیح علاج کہاں مل سکتا ہے۔

والسّلام

راقم
محمد اجمل خاں
منجانب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

---

[1] صدیقی صاحب کے حالات سے واقفیت نہیں حاصل کی جاسکی۔

چند دیگر تحریرات

شخص کی یہ عبارت ہے اگر اس کے اور اقوال ایسے موجود ہوں کہ جن کی روشنی میں اس عبارت کا دوسرا مفہوم نکالا جا سکتا ہو، تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف اس عبارت میں کوئی قابلِ اعتراض بات معلوم نہیں ہوتی۔

(ابوالکلام)

رزولیوشن ترک موالات

[یہ رزولیوشن مولانا ابوالکلام آزادؒ کی صدارت میں جمعیۃ العلماء ہند کے ایک غیر معمولی اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پاس ہوا تھا۔ چونکہ اس رزولیوشن کے بارے میں مولانا آزادؒ نے قول فیصل کے دیباچے میں تصریح فرمائی ہے کہ "سب سے پہلے کلکتہ کانفرنس کے لئے یہ رزولیوشن میں نے تیار کیا، خود اپنے قلم سے لکھا اور میری ہی صدارت میں منظور ہوا..." اس لئے مولاناؒ کی اس نگارش کو بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مؤیدین میں مندرجہ زیر رزولیوشن تین علماء کے علاوہ ہندوستان کے پچاس مقتدر علماء کرام کے نام درج ہیں۔]

۶ ستمبر ۱۹۲۰ء

جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس اعلان کرتا ہے کہ چونکہ ٹرکی کے ساتھ صلح کرنے میں دول یورپ نے صریح طور پر ناانصافی کی ہے اور اسلامی جذبات کو پامال کیا ہے اور وزراء برطانیہ نے اپنے صاف و صریح وعدوں کی علانیہ خلاف ورزی کی ہے اور خلافت کے اقتدار کو زائل کرنے اور خلیفۃ المسلمین کی مذہبی طاقت کی بیخ کنی کرنے میں اسلام کے ساتھ صریح طور پر مذہبی تعصب کا ثبوت دیا ہے، اس لئے مسلمانوں پر بحیثیت تبع اسلام ہونے کے لازم ہوگیا ہے کہ وہ ان اعدائے اسلام سے ترک موالات کریں۔

محرک

ابوالکلام آزاد

مؤیدین :-

۱۔ مولانا عبدالصمد مقتدری بدایونی ۔ ۲۔ مولانا منظہر الدین

۳۔ مولانا محمد عبدالقیوم عرف نور احمد (مرحومین و مغفورین)

ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر بردولی فیصلے کی یادگار غلطی[1] نہ ہوئی ہوتی تو ہمارا یہ پہلا تجربہ بھی بہترین فوری نتائج حاصل کر سکتا تھا۔ اس تجربہ نے مجھے اور زیادہ نان وائیلنس اور نان کوآپریشن طریقے کی عملی صداقت کا یقین دلا دیا ہے۔ موجودہ حرکت عملاً ختم ہو چکی اور اب ملک کا کسی قدر سستانا ناگزیر ہے۔ لیکن اگر اس کے بعد ایک قومی حرکت انہی اصُول پر شروع ہوئی، اور ان مرکزی اور انتظامی غلطیوں سے اجتناب کیا گیا جو اس مرتبہ ہو چکی ہیں، تو مجھے کامیابی میں کوئی شبہ نہیں۔

(۳) بلاشبہ نان وائیلنس[2] ان حالات میں ایک صحیح طریقہ ہے، جو ہندوستان اور ہندوستان جیسے ملکوں کے ہیں۔ باقی رہا[3] "نان وائیلنس" کا اصول بہ حیثیت ایک اخلاقی اعتقاد کے، تو میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن اس صورت میں جو قرآن نے پیش کی ہے، اور اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں، بعض حالتوں میں وائیلنس[3] "لا آف نیچر" کی تعمیل ہے۔

(۴) ہندو مسلم اتحاد یقیناً آج اس سے کہیں زیادہ موجود ہے، جتنے کی سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں مَیں امید کرتا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اب تک اس درجہ تک نہیں پہنچا کہ ہم اس پر پوری طرح اعتماد کر سکیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیال میں اب تک یہ ایک پالیسی سے زیادہ نہیں ہے۔ محض وقت کے مشترک حالات نے دونوں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ ہزاروں مسلمان ہیں جنھیں اب تک ہندوؤں کی مجارٹی سے دہشت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سلف گورنمنٹ کے معنی ہندو گورنمنٹ کے ہوں گے۔

---

[1] تحریک ترک موالات کے زمانے میں چورا چوری میں پولیس کی چوکی پر عوام کے حملے سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے بردولی میں تحریک ترک موالات کے ختم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ملک میں ابھی ایسی حالت پیدا نہیں ہوئی کہ ترک موالات کے عمومی اور ملک گیر پروگرام کو چلایا جا سکے۔ اس چیز نے نہ صرف عوام کے جذبۂ حریت کو کچل کر رکھ دیا بلکہ افسردگی اور دل شکستگی کی ایک عام فضا پیدا ہو گئی۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد پر بھی اس کا بہت بُرا اثر پڑا۔

[2] عدم تشدد۔

[3] تشدد۔

چند سوالات کے جوابات

[۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزادؒ اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی علی پور جیل میں تھے تو ملیح آبادی نے، آزادی کے بعد ہندوستان میں طرز حکومت، عدم تشدد، مقصد یا ذریعہ؟ ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش کے بارے میں چند سوالات کئے تھے، مولاناؒ نے زبانی جواب دینے کی بجائے تحریری جواب عنایت فرمائے۔ اگرچہ مولاناؒ کے جوابات بہت مختصر ہیں لیکن ان مسائل کے بارے میں ان میں بلیغ اشارے ہیں جن سے مولاناؒ کے اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ مولاناؒ نے تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ بہت اہم اور حرفِ آخر ہے۔ مولاناؒ کی اس تحریر کی اہمیت کے پیش نظر اس مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔]

(۱) میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ ابھی ہم نے سوراج کی ابتدائی منزلیں بھی سر نہیں کی ہیں۔ اس کی آخری منزل کے بارے میں بحث و گفتگو کرنا بالکل لاحاصل ہوگا۔

سوراج کے معنی "اچھے راج" کے ہیں۔ میرے اعتقاد میں اچھا راج وہی ہو سکتا ہے، جس میں دو شرطیں پائی جائیں ۱ قومی ہو اور ۲ جمہوری ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان کی قدیم تاریخ میں جمہوری نظام حکومت کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ لیکن اسلام کی تمام روایات، تمام تر جمہوریت پر مبنی ہیں۔ اس لئے بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ قدرتی بات ہے کہ میں صرف جمہوری نظام ہی سے مطمئن ہو سکتا ہوں۔

(۲) اس بارے میں میرا جو خیال آج سے کئی سال پہلے تھا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے میں خیال کرتا ہوں کہ ہندوستان اس طریقے پر چل کر ضرور آزاد ہو سکتا

ایک دہقانی مسلمان بھی جانتا ہے کہ اس کا پیغمبرؐ انسان تھا اور خدا کا ویسا ہی بندہ، جیسا وہ خود ہے۔ اسلام کا تو اصل مشن ہی انسانی پرستش کو مٹا دینا ہے۔

اسی طرح جب میں بنکم چیٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو باوجود اس تعریف کے جو ان کے لٹریچر کی میرے دل میں ہے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری پر متعجب ہو ہو کے رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا ایک امریکن۔ میں اس کے لئے ہندو بھائیوں کو ملامت نہیں کروں گا۔ بلا شبہ یہ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اپنے آپ کو اچھی طرح واضح کر دیتے، لیکن انھوں نے پوری طرح اس فرض کو انجام نہیں دیا۔

بہر حال مجھے ہندو مسلم اتحاد کی عملی حقیقت کا پورا پورا یقین ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ خیال سے تو اس میں کوئی روک بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسلام فی نفسہٖ ایک عالمگیر اور سب میں پھیلی ہوئی اور بٹی ہوئی صداقت کا واعظ ہے۔ اس کی بنیاد ہی انسانی برادری اور مساوات پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمانوں سے ہمیشہ التجا کرتا ہوں کہ وہ اس راہ میں خود پیش قدمی کریں، اور دوسرے فریق کی پیش قدمی کا انتظار نہ کریں۔ میں گزشتہ ڈسمبر میں اس بات کا انتظام کر رہا تھا کہ ایک مرکزی انجمن صرف ہندو مسلم اتحاد کو ترقی دینے اور مقصد پر مفید لٹریچر تیار کرنے کے لئے قائم ہو جائے۔ میری گرفتاری سے کام رُک گیا۔ لیکن انتظامات جاری ہیں۔

ایک اور نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہیئے۔ اگر ہم ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ روز بروز ایک نئی تفریق "پراونشیلزم" کی بڑھتی جاتی ہے۔ "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں۔

اسی طرح ہندوؤں کے دلوں میں بھی شمال کا خطرہ اب تک باقی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابدالی والی سڑک بند نہیں ہوئی ہے۔ جنسی تعصب کا اب تک سد باب نہیں ہوا۔ چھوت کی ناقابل عبور خلیج اب بھی ہمارے ملنے میں حائل ہے۔ اس لئے سوراج کی اس سب سے پہلی بنیاد کا کام کسی طرح بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ آئندہ سالہا سال تک ہمارے پروگرام میں سب سے پہلی چیز یہی رہنی چاہیئے۔

البتہ میرا یقین ہے کہ کوئی حقیقی رکاوٹ اس کام میں حائل نہیں۔ دنیا کی تمام قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دائمی اور حقیقی اتحاد ہوسکتا ہے، بشرطیکہ باہم دگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کردیا جائے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور امریکا کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا جو صدیوں سے اس کے ہمسائے میں موجود ہے۔

مجھے کس قدر حیرت ہوئی، جب میں نے سر ربندرو ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل "فلاسفی آف انڈین ہسٹری" دیکھا جو "ماڈرن ریویو" میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی بجائے خود معبود بن گئے ہیں۔ کرشن، مسیح اور چیتن کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یعنی کرشن اور مسیحؑ کی طرح محمدؐ بھی مسلمانوں میں معبود کی طرح پرستش کئے جاتے ہیں! میں نے کہا کہ ہندوستان کا عظیم الشان شاعر امریکا کی سیاحت سے واپس آرہا ہے، لیکن اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی معلوم نہیں، جو خود اس کے گھر میں بستے ہیں! مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان، محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے، وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہتا۔

بچنا چاہتا ہے جو بڑے بڑے کارخانوں کی بدولت یورپ میں پیدا ہو چکی ہے تو بلاشبہ ابھی سے کوشش کرنی چاہئے کہ محنت کو محدود کارخانوں میں روک دینے کی جگہ تمام قوم میں مشترک طور پر پھیلا دیا جائے اور اس کے لئے چرخے کا عام رواج یقیناً ایک عظیم الشان بنیاد ہوگی۔

(۷) مطالبات خلافت کی تشریح میں میری کتاب اردو اور انگریزی[۵۱] میں شائع ہو چکی ہے۔ مختصراً مطالبات یہ ہیں کہ عراق اور شام کو انگریزی یا فرنچ میڈیٹری میں رکھنے کی کوشش ترک کر دی جائے۔ انھیں بالکل چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ آزاد و خود مختار حکومت خلیفۃ المسلمین کے زیر سیادت قائم کر لیں۔ تھریس اور سمرنا ترکوں کو واپس دے دیا جائے۔ قسطنطنیہ، درۂ دانیال اور خلیفۃ المسلمین کی حکومت پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اسلام کے مقدس مقامات کا اہتمام خلیفہ کے زیر اقتدار رہنا چاہئے۔[۵۲]

---

۵۱ یہ اشارہ "مسئلہ خلافت" کی طرف ہے۔

۵۲ یہ آخری جواب "ذکر آزاد" میں نہیں تھا۔ بلکہ "امام الاحرار حضرت مولانا ابوالکلام آزاد" مصنفہ شائق احمد عثمانی سے نقل کیا گیا۔ سوال یہ تھا کہ "خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ اور گورنمنٹ کی کس کارروائی سے مسلمان مطمئن ہو سکتے ہیں؟

شاید کہا جا سکتا ہے کہ اور صوبوں کے مقابلے میں "پراونشیلزم" کا جذبہ بنگال میں زیادہ ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لئے سخت مضر ثابت ہوگی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انڈین نیشن کی کوئی قومی زبان اب تک نہیں ہے۔

(۵) اس کا مفصل جواب میں ایک رسالے میں دے چکا ہوں، جو گزشتہ سال چھپ چکا ہے، لیکن اس موقع پر میں صرف اسی قدر کہوں گا کہ ہندستان میں تیئیس کروڑ ہندو ہیں اور سات کروڑ مسلمان۔ تیئیس کروڑ ہندوؤں کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ اگر ایک لاکھ ترک یا افغانی پٹھان حملہ کردیں، تو وہ اپنی حفاظت آپ کرسکیں۔ اگر اتنی طاقت ہم میں نہیں ہے تو پھر واقعی سوراج کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کردینا چاہیئے۔

بعض اوقات مجھے بڑی ہی ہنسی آتی ہے، جب میں اس معاملہ کو سوچتا ہوں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ڈر رہے ہیں۔ اور دونوں کو اپنے اوپر اعتماد نہیں، مسلمان خیال کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد تین گنی زیادہ ہے۔ آزادی ملنے پر وہ مسلمانوں کو پامال کردیں گے، اس لئے بہتر ہے کہ ہندستان انگریزوں ہی کا غلام رہے۔ ہندو سوچتے ہیں کہ انگریزوں کے جاتے ہی خیبر کی بلندیوں سے پٹھان اتر آئیں گے، اور تمام ہندوؤں کو پامال کردیں گے۔ اس لئے نجات اسی میں ہے کہ انگریز رہیں۔ دیکھئے، کہ انگلستان کی یہ خوش قسمتی کب تک قائم رہتی ہے؟

(۶) جہاں تک تعلق ہمارے موجودہ مقاصد کا ہے، نہ ایسا ہونا ضروری ہے، اور نہ ہوتا نظر آتا ہے۔ البتہ یہ ایک علیحدہ اور مستقل سوشیل اور تمدنی مسئلہ ہے۔ اگر ہندستان "سرمایہ" اور "مزدوری" کی اس عظیم الشان اور لاعلاج کشمکش سے

پیغام

[دسمبر ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام ایک "کل ہند اُردو کانفرنس" دہلی میں ہوئی تھی، مولانا آزادؔ خود تو اس میں شرکت نہ فرما سکے، البتہ تار کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔ ذیل میں مولاناؒ کے اس برقی پیغام کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔]

استقبالیہ اُردو کانفرنس دہلی!

کانفرنس کے لئے پوری کامیابی کی دُعا کرتا ہوں؛ اُردو چھپائی کے لئے ٹائپ کی ضرورت فی الوقت سب سے اہم ہے۔ کانفرنس کو اس کی سفارش کرنی چاہیئے کہ اُردو کے اخبارات و رسائل نسخ ٹائپ اختیار کرلیں۔

ابوالکلام آزاد[1]

---

[1] روداد کل ہند اُردو کانفرنس دہلی منعقدہ دسمبر ۱۹۳۹ء۔

تعزیتی پیغام

بروفات حضرت علامہ سر محمدؒ اقبال علیہ رحمہ

یہ خیال کرتے ہوئے کس قدر صدمہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ اس جہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ ہندوستان آپ سے بڑا اردو شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ آپ کی وفات سے نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کو نقصانِ عظیم پہنچا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس لئے زیادہ صدمہ ہے کہ مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔

ابوالکلام آزاد

مولانا آزادؒ نے انہی دنوں مولوی محی الدین احمد صاحب قصوری کے نام یک خطمیں ۲ر اپریل ۳۶ء میں بھی اس سانحہ پر ان الفاظ میں گہرے قلق کا اظہار فرمایا تھا: "اقبالؒ کی موت سے نہایت قلق ہوا!

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

مولانا مہر صاحب نے کتنا صحیح فرمایا کہ "یہ چند الفاظ ہیں، لیکن دیکھئے ان میں دردِ دل کس طرح کھنچ آیا ہے۔ (تبرکاتِ آزاد مرتبہ جناب مہر صاحب ص۱۴۷)۔

مولانا ظفر علی خاں مرحوم

[مولانا ظفر علی خاںؒ کے متعلق حضرت مولانا آزادؒ کی رائے]

مولانا ظفر علی خاںؒ تحریکوں کی عمارت اٹھانے میں کمال رکھتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے، جو ہمیشہ راہ و منزل سے بے نیاز ہو کر چلتے ہیں۔

[ابوالکلام آزاد]

یوم آزادی پر
مولاناؒ کا
پیغام

[آزادی کی پہلی سالگرہ پر مولانا آزادؒ نے اہلِ وطن کے نام ایک پیغام میں ان کے ایک فرض کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مولاناؒ کا یہ پیغام برِ صغیر ہند و پاکستان دونوں کے لئے یکساں اہمیت کا حامل ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم مولاناؒ کے اس پیغام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی ساری قوتیں وقف کردیں۔]

وزیر تعلیمات ۔ بھارت

آزادی ہم نے حاصل کرلی ہے، لیکن آزادی کا صحیح طور پر کام میں لانا ابھی باقی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اس دوسرے کام کے لئے وقف کردیں۔ امن، اتحاد، باہمی اعتماد، اور حبّ الوطنی کے بغیر یہ مہم سر نہیں کی جاسکتی۔

ابوالکلام آزاد

حصۂ سوم

تذکرہ

مکتوب الیہم

فہرست

۱- امام اکبر آبادی

آپ کا پورا نام امام الدین ہے۔ جنوری ۱۸۹۸ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ سعدی مرحوم آگرہ کے مشہور تاجر چرم تھے۔ آپ کے جدّ امجد حضرت نعمت اللہ قریشی ان جاں نثار اور سرفروش عربی النسل سپاہیوں سے تعلق رکھتے تھے جو محمد بن قاسم کے ساتھ واردِ ہندوستان پاکستان ہوئے اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں بود و باش اختیار کر لی۔

امام اکبر آبادی صاحب اُردو کے مشہور ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ دینی شغف ورثہ میں پایا۔ قرآن مجید کے حافظ ہیں۔ آپ کا اصل شغلہ تجارت تھا۔ لیکن قوم و وطن کی خدمت کے ہر مناسب موقع پر پیش پیش رہے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کا شوق ہمیشہ رہا اور علم و ادب کی خدمت میں بھی مصروف رہے۔ کئی برسوں سے پاکستان تشریف لے آئے ہیں، آج کل حیدر آباد میں مقیم ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۴ء میں رشتۂ اخلاص جوڑا تھا آج تک قائم ہے۔

۳۔ مولانا احمدؒ رضا خاں بریلوی

مولانا احمد رضا خاں ۱۴ / جون ۱۸۵۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی نقی علی خاں بن مولوی رضا علی خاں تھا۔ درسی علوم کی تحصیل اپنے والد ماجد اور دیگر علماء سے کی۔ حضرت شاہ آلِ رسُول مارہروی کے خلیفہ مجاز تھے۔ مولانا مرحوم بڑے ذہین و طباع تھے۔ فکر و عقائد میں ایک مخصوص رنگ کے عالم تھے اور زندگی کے روایتی طریقے کو پسند کرتے تھے۔ عوام میں آپ کے عقائد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوتی حتیٰ کہ آپ کی نسبت سے "بریلوی" اور "بریلویت" کے الفاظ ایک طبقۂ خیال اور مسلک خاص کے لئے عام طور پر استعمال کئے جانے لگے۔

مولانائے بریلوی ایک اچھے نعت گو..... تھے۔ سیرتِ نبویؐ، سیرتِ اصحاب و اہل بیتؓ، تذکار اولیاءِ کرام، تفسیر، حدیث، فقہ نیز مسائل نزاعیہ وغیرہ میں پچاس سے زائد آپ کی تصنیفات و تالیفات ہیں۔

مولانا آزاد اور مولانا احمدؒ رضا خاں میں کسی قسم کے ذاتی یا علمی تعلّقات نہ تھے۔ مولانا آزاد جو دینی اور سیاسی عقائد رکھتے تھے، مولانا بریلویؒ بالتصریح و بالیقین ان کو کفر و فسق سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن مولانا آزاد بایں وجہ کہ مولانا احمد رضا خاں کے ان کے والد مولانا خیر الدّینؒ سے تعلّقات تھے، ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

۲۵۔ صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں بمقام بریلی انتقال فرمایا۔

۲- شاہ ابن سعود مرحوم

آپ کا نام عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن الفیصل السّعود تھا لیکن ابن سعود کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ ۱۸۸۰ء میں ریاض (نجد) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اسلاف ایک عرصہ سے نجد کے حکمراں چلے آرہے تھے لیکن خاندانِ رشید کے افراد نے آپ کو نجد سے نکال دیا چنانچہ آپ کویت جانے پر مجبور ہوگئے۔ ۱۹۰۱ء میں صرف دو سو آدمیوں کی مدد سے ریاض پر حملہ کیا اور دوبارہ اپنے آبائی تخت پر قبضہ کرلیا۔ رفتہ رفتہ اپنی طاقت کو بڑھایا، قبائل کو متحد کیا اور شریف حسین، شاہِ حجاز اور ترکوں کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھایا، پہلے ۱۹۱۹ء میں شریف کی افواج پر حملہ کرکے ان کو شکست دی۔ پھر ۱۹۲۴ء میں حجاز پر لشکرکشی کی اور ۱۹۲۵ء کے ختم ہوتے ہوتے سارا حجاز ان کے زیرِ نگیں آچکا تھا۔ ۲۶ء میں شاہِ نجد و حجاز ہونے کا اعلان کیا۔ ۱۹۵۳ء میں ریاض میں انتقال ہوا۔

شاہِ ابن سعود میں بہت سی خوبیاں بہ یک وقت جمع ہوگئیں تھیں۔ وہ ایک بہادر، جری اور آزمودہ کار سپاہی، بہترین منتظم، امورِ مملکت کے ماہر، اعلیٰ درجہ کے سیاست داں، صاحبِ بصیرت، علم و ادب کے شائق، حلیم و بردبار اور عادل و منصف سلطان تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ذاتی تعلقات نہ تھے۔ مولانا نے صدر جمعیۃ خلافت کی حیثیت سے ان کو مسلمانانِ ہند کے جذبات سے مطلع کیا تھا نیز بعض اہم سیاسی و وقتی مصالح اور اصلاح و تجدید کے تقاضوں کی نسبت خط و کتابت کی تھی۔

۵- سیّد افتخار عالم

منشی سیّد افتخار عالم ۱۲۸۰ھ میں ضلع ایٹہ (یوپی) کے ایک مشہور موضع مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کے علاوہ انگریزی زبان بھی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ السنہ شرقیہ کی طرح انگریزی زبان میں بھی تاریخ نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا لیکن رواج وقبولیت عام حاصل نہ ہوا۔ خواتین کے ایک تذکرہ کا ترجمہ کیا اور محمڈن کالج کی تاریخ لکھی کچھ دنوں تک اخبار "مفید عام" آگرہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ لیکن ان کی شہرت ڈپٹی نذیر احمدؒ دہلوی کی سوانح "حیات النذیر" کے مؤلّف اور ایک شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ حضرت احسن مارہروی سے کلام میں اصلاح لیتے تھے۔ کچھ دنوں تک بزمانۂ قیام حیدر آباد (دکن) حضرت داغ دہلوی سے بھی اصلاح لی تھی۔ تخلص کبھی آزاد اور کبھی عالم استعمال کرتے تھے۔

مولانا آزاد سے کوئی خاص تعلقات نہ تھے البتہ ایک دوسرے سے واقفیت ضرور تھی۔ حضرت علاّمہ شبلی کے ایک خط میں پُر لطف انداز میں ان کا تذکرہ آیا ہے۔ افتخار عالم صاحب نے چند باتیں مولانا آزاد سے معلوم کی تھیں اور بعض اُمور میں مشورہ طلب کیا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے جواب مرحمت فرمادیا۔

۶- افتخار احمدؒ بلخی

افتخار احمد بلخی صاحب کے جدامجد حضرت شیخ سلطان شمس الدّین ساتویں صدی ہجری میں ہندوستان تشریف لائے اور بہار میں قیام کیا۔ مولانا مظفرالدّین شمسؒ، مولانا معزّالدین شمس، اور مولانا فخرالدّین شمس، ان کے تین نامور فرزند تھے۔

۴۔ صاحبزادہ آفتاب احمدؐ خاں

صاحبزادہ آفتاب احمدؐ خاں ۴۔ مئی ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ انگلینڈ سے انھوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ تھی ۱۸۹۴ء میں ولایت سے واپسی کے بعد ان کی سوشل اور تعلیمی خدمات کا دَور شروع ہوتا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر کئے گئے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کی ترقی اور ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلیمی کاموں میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ ۱۹۱۷ء میں انڈیا کونسل کے ممبر منتخب ہو کر انگلینڈ گئے۔ لیکن صحت کی خرابی کی بناء پر ۱۹۲۴ء میں اس عہدہ سے مستعفی ہو کر ہندوستان تشریف لے آئے۔ بعد میں ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ مسلم یونیورسٹی میں طبی شعبہ کا قیام آپ ہی کے زمانہ میں وجود میں آیا۔

جنوری ۱۹۲۷ء میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور تین برس تک فریش رہے۔ ۸۔ جنوری ۱۹۳۰ء کو ان پر فالج کا دوسرا حملہ ہوا جس سے جانبر نہ ہوسکے اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے انھوں نے انتھک کوشش کی تھی۔ مالی لحاظ سے اس کی حالت کو بہتر بنایا، اس کی علٰحدہ عمارت بنوائی۔ اور ایک عمدہ تعلیمی کتب خانہ جمع کیا۔

مولانا آزاد اور صاحبزادہ مرحوم کے باہمی تعلقات کی نسبت ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ مولانا کا ایک تاریخی مکتوب ان کے نام موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان کانفرنس کی پالیسی کی نسبت اختلاف تھا۔

متعدد دینی و اسلامی اور تحقیقی کتب و رسائل کے مصنف و مؤلف ہیں اور ایک صاحبِ قلم کی حیثیت سے پاکستان کے ایک وسیع علمی اور مذہبی حلقہ کی متعارف شخصیت ہیں۔ علمِ ہیت پر ان کی وسیع نظر ہے۔ "انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر" تین جلدوں میں ایک ضخیم اور محققانہ تصنیف ہے۔ آپ کے بارے میں ہندوستان کے ایک مشہور عالمِ دین نے فرمایا کہ "افتخار احمد منکرینِ حدیث کے لئے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو قادیانیوں کے لئے مولانا الیاس برنیؒ"

"جماعتِ اسلامی" سے ابتداء میں بہت قریبی تعلق تھا لیکن مدت ہوئی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اب ان کی تمام دلچسپیاں علمی، ادبی اور مذہبی ہیں۔

افتخار احمد بلخی صاحب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے علم و فضل، ان کی دینی و سیاسی خدمات، جد و جہد آزادی میں ان کی قربانیوں، مجتہدانہ بصیرت، یگانۂ روزگار حافظہ و ذہانت کے معترف و مدّاح ہیں اور حضرت مولاناؒ سے ایک خاص عقیدت رکھتے ہیں۔

۷۔ پنڈت بنارسی داس چترویدی

پنڈت بنارسی داس یوپی کے ایک معزز برہمن خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سی ایف اینڈریوز ان کے اُستاد تھے جنھوں نے اپنی ساری زندگی برِّ صغیر ہند پاکستان میں رہ کر خدمتِ خلق میں گزار دی۔ یہ غالباً ان کے استاد کے فیضانِ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ پنڈت جی میں مذہبی تعصب اور تنگ نظری نام کو بھی نہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ ٹھوس کام کرنے کے عادی ہیں۔

قومی ایکتا کے سلسلے میں انھوں نے متعدد چھوٹے چھوٹے پمفلٹ مثلاً

افتخار احمد بلخی، مولانا معز الدین شمس، بلخی کی اولاد میں سے ہیں لیکن ان کے خاندان نے مولانا مظفر الدین شمس کی اولاد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی نے لکھا ہے:

"حضرت شیخ الاسلام مولانا مظفر الدین شمس بلخی معقولات کے ایک مسلّم الثبوت استاد تھے۔ سلطان فیروز شاہ کے عہد حکومت میں درسگاہِ فیروز شاہی میں مدرّسِ اعلیٰ تھے۔ قیامِ مکہ معظمہ کے زمانہ میں حرم شریف میں صحیحین کا درس دیا کرتے تھے۔"[1]

مولانا مظفر الدین مخدوم جہانیاں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کا خاندان ہمیشہ علم و فضل میں سربرآوردہ روزگار اور اسلامی و دینی خدمات میں ہمیشہ سرگرم عمل و ممتاز رہا ہے۔

افتخار احمد بلخی کے والد ماجد قاری احمد کریم صاحب انجمن ترقی اُردو بہار کے سکریٹری اور مسلم لیگ کے لیڈر کی حیثیت سے بہار کی ایک معروف شخصیت تھے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

افتخار احمد بلخی صاحب ۲ محرم الحرام ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو "چھپڑا" صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ افتخار احمد آپ کا تاریخی نام ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد اجمیر تشریف لے گئے اور حضرت علامہ معین الدین سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد عربی و فارسی میں مختلف علوم و فنون مثلاً زبان، ادب، تفسیر کے اعلیٰ امتحانات پٹنہ (بہار) الٰہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں میں خدماتِ تدریس انجام دیتے رہے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں شعبہ معارف اسلامیہ میں اُستاد ہیں۔

---

[1] ماہنامہ معارف اعظم گڑھ بابت ماہ مارچ ۱۹۵۶ء۔

۸- رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

(م۔ ۳ر جولائی ۱۸۹۲ء ف ۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء)

برّصغیر پاک و ہند میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی جرأت، بے باکی، حق گوئی، غیرتِ ایمانی اور ملک کی تحریکِ آزادی میں عظیم الشّان قربانیوں کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ نہ خاندان کے لحاظ سے ہی برِّصغیر کے کسی ایک خاندان کی مثال پیش کی جاسکتی ہے جس نے مسلسل ایک صدی تک تحریکِ آزادی اور دین وسیاست کی بہ یک وقت قیادت کی ہو۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی میں ان کے پردادا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی نے اپنے بھائی، بیٹوں اور عورتوں اور بچوں کے ساتھ حصّہ لیا تھا اور دلّی کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی میں ناکامی ہوئی، حالات بدل گئے۔ چنانچہ آپ کے دادا مولانا محمدؒ اور ان کے بھائی شاہ عبدالعزیز لدھیانوی پھر آپ کے والد مولانا زکریا رحمہم اللہ مختلف طریقوں سے انگریزی استبداد کے خلاف مصروفِ پیکار رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے وقت وحالات کے ساتھ حریت پسند تحریکوں میں حصہ لیا۔ ملک کی آزادی کی کوششوں میں انھوں نے کانگریس کا ساتھ دیا لیکن کانگریس کے خیالات کو اوڑھنا بچھونا کبھی نہیں بنایا۔ ہمیشہ بڑے بڑے لیڈروں کو ان کی غلطیوں پر برملا ٹوک دیتے اور ان کے نتائج سے متنبّہ کر دیتے تھے۔

قید وبند کی زندگی میں بھی منفرد رہے۔ ان کی زندگی کا جس قدر حصّہ قید وبند میں گزر گیا۔ برّصغیر پاکستان وہندوستان کے بہت سے لیڈروں کی پوری سیاسی زندگی بھی اس سے کم ہی ہوگی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ان کو زندگی بھر ایک خاص لگاؤ رہا۔ وہ مولانا کو

"ہندوستانی تہذیب میں مسلمانوں کا حصّہ" اور "حضرت محمد" (صلے اللہ علیہ وسلم) انگریزی اور ہندی میں شائع کئے ہیں۔ یہ رسائل ان کی بے تعصبی، بلند اخلاقی، وسیع النظری اور انصاف پسندی کو ظاہر کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ۱۹۱۲ء میں واقفیت پیدا ہوئی تھی اس کے بعد کلکتہ کے دس سالہ قیام کے دوران میں مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ مولاناؒ سے حد درجہ عقیدت رکھتے ہیں۔ مولانا مرحوم بھی ان کے اخلاص و محبّت اور بے غرضانہ تعلق سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ مولاناؒ کا برتاؤ ان کے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ رہا۔

پنڈت بنارسی داس مولانا آزادؒ کے علمی تبحر کے حد درجہ معترف اور مدّاح ہیں، ان کے خیال کے مطابق برِّ صغیر ہندوستان و پاکستان کی آزادی میں مولانا آزادؒ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور جو بے مثال قربانیاں دی ہیں ان کو فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی جدید تعمیر میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ آزادی کے بعد ان کی بیشتر صلاحیتیں انسانوں کی تعمیر اور ذہنوں کے بنانے میں صرف ہوتی رہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ ان کا ملک پر اتنا بڑا احسان اور وہ عظیم کارنامہ ہے جس کے اعتراف و تذکرہ اور مولاناؒ کو خراجِ عقیدت پیش کئے بغیر جدید ہندوستان کا مؤرخ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ مولانا آزادؒ کی خاموش اور ٹھوس خدمات نے ذہنوں پر جو اثر ڈالا ہے اس کا وہی لوگ کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں جنھوں نے سنہ ۱۹۰۴۷ء کے فرقہ وارانہ حالات دیکھے ہوں اور سنہ ۵۸ء میں مولاناؒ کے انتقال پر ملک کے ماتم کا نظارہ بھی کیا ہو۔

بارہ۱۲ سال تک صدر الصدور کے عہدہ پر مامور رہے۔ نظام نے نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب دے کر آپ کی خدمات کا اعتراف کیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و فضل اور بے شمار اخلاقی کمالات سے بہرہ مند کیا تھا۔ علم و ادب، فضل و کمال، بصیرت و دانائی، . . . . اخلاق و مروّت، شرافت و تواضع، وضع داری و مہمان نوازی وغیرہ خوبیاں و محاسن آپ کی ایک ذات میں جمع ہو گئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے آپ کی پہلی ملاقات ۱۹۰۵ء۔ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی اس وقت مولانا آزادؒ "الندوہ" کے ایڈیٹر تھے اور مولانا شروانی اور علامہ شبلیؒ "الندوہ" کے چیف ایڈیٹر تھے اس وقت دونوں بزرگوں میں جو رشتہ اخلاص و محبّت استوار ہوا تھا وہ آخر تک قائم رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ سیاسی راہیں دونوں کی جدا تھیں لیکن اس اختلاف سے رشتۂ اخلاص و محبّت کبھی متأثر نہ ہوا۔ مولانا آزادؒ نے ابتدا ہی میں حضرت شروانیؒ کے سیاسی مسلک کو معلوم کر لیا تھا پھر آخر تک اس تذکرے کو بیچ میں نہ آنے دیا۔ دونوں میں مایہ الاشتراک علمی و ادبی ذوق تھا۔ دونوں بزرگوں کو ایک دوسرے سے جو تعلق و محبت تھی اس کو "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد اجمل خاں صاحب نے دونوں بزرگوں کے تعلقات کے بارے میں "غبارِ خاطر" کے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"ایسے خوش قسمت اصحاب جنھیں مولاناؒ اپنے دوستوں میں تصور کرتے ہوں خال خال ہیں اور صرف وہی ہیں جن سے علم و ذوق کے اشتراک اور رجحان طبیعت کی مناسبت نے انھیں وابستہ کر دیا ہے۔ ایسے ہی خال خال حضرات ہیں ایک شخصیت نواب صدر یار جنگ کی ہے۔

نواب صاحب مسلمانانِ ہند کے گزشتہ دورِ علم و مجالس کی یادگار ہیں۔ آج سے

صرف سیاسی رہنما ہی نہ مانتے تھے ان کو اپنا مذہبی پیشوا بھی سمجھتے تھے۔ حضرت مولاناؒ کو بھی ان سے ان کی دینی حمیت، اسلامی غیرت، جرأت و بے باکی اور حق گوئی کی بنا پر تعلق خاطر تھا۔

مولانا آزادؒ سے عمر میں تقریباً چار سال چھوٹے تھے اور ان کی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل اس دارِ فانی سے رختِ سفر باندھا۔ آخری آرام گاہ جامع مسجد دہلی کے پہلو میں ہے۔

۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ۱۸۶۶ء میں اپنے آبائی قلعہ بھیکن پور ضلع علی گڑھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ مورث اعلیٰ "شروانی" غالباً نویں صدی ہجری کے شروع میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔

ملک کے اکابر علماء و فضلاء سے عربی، فارسی اور علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ آپ کے والد محمد تقی خاں شروانی اردو ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے نیز مردانہ فنون میں طاق تھے۔ آپ کے چچا محمد عبدالشکور خاں شروانی عربی کے عالم، امورِ ریاست کے ماہر اور مذہب کے بڑے پابند تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کو علم و ادب کا اعلیٰ ذوق، امورِ ریاست کی اعلیٰ بصیرت و مہارت اور مذہبی پابندی والد اور چچا سے وراثت میں ملی۔

۱۸۸۳ء میں ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ تقریباً دو درجن بلند پایہ علمی، ادبی اور تاریخی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ سیاست سے ہمیشہ کنارہ کش اور علمی و ادبی اور تعلیمی و اصلاحی تحریکات میں پیش پیش رہے۔

۱۹۱۸ء میں امارتِ شرعیہ ریاست حیدرآباد دکن کی صدارت سے نوازا گیا

۱۰۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

حضرت شیخ الاسلام ۱۸۷۹ء میں قصبہ ٹانڈا ضلع فیض آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تاریخی نام چراغ محمد تھا لیکن حسین احمد مدنی کے نام سے مشہور ہوئے۔

آپ کے والد کا نام حبیب اللہؒ تھا جو ایک ولی کامل بزرگ تھے۔ سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم ٹانڈا میں ہوئی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے نامور شاگرد، فیض و تربیت یافتہ اور ان کے سیاسی کاموں میں شریک اور خفیہ سیاسی تحریک کے رازدار تھے۔

تقریباً بیس ۲۰ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد اور دیگر افرادِ خاندان کے ساتھ حجاز مقدس کا سفر کیا اور مدینہ منورہ میں قیام فرمایا ۱۹۱۵ء تک اگرچہ برصغیر ہندو پاکستان کے کئی سفر کئے لیکن مستقل قیام مدینہ منورہ میں رہا۔ ۱۹۱۵ء میں شریف حسین نے جوار حرم نبویؐ میں حضرت شیخ الہندؒ کے ہمراہ آپ کو بھی گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ برٹش حکومت نے آپ کو جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا۔ جون ۱۹۱۹ء میں آپ کو رہائی ملی تو ہند پاکستان تشریف لائے اور برصغیر کی جدوجہد آزادی میں حصّہ لیا حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد آپ کو دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث اور صدر مقرر کیا گیا۔ وفات تک آپ ان مناصبِ جلیلہ پر فائز رہے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تدریسی مشغولیتوں، دارالعلوم کی صدارتی ذمہ داریوں، درس و تدریس، تالیف، رشد و ہدایت، اصلاح و تذکیر کی مصروفیتوں

تیس چالیس برس پیشتر کا زمانہ مولانا آزادؒ کی ابتدائی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہ اس وقت کے تمام اکابر و افاضل سے عمر میں بہت چھوٹے تھے یعنی ان کی عمر سترہ اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور محیّر العقول علمی قابلیت کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم ہوگئے تھے اور معاصرانہ اور دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، خلیفہ محمد حسین (پٹیالہ) خواجہ الطاف حسین حالیؒ۔ مولانا شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہم، سب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور علمی و ادبی صحبتیں رہا کرتی تھیں۔ اسی عہد کی صحبتوں میں نواب صدر یار جنگ سے بھی ان کی شناسائی ہوئی اور پھر شناسائی نے عمر بھر کی دوستی کی نوعیت پیدا کرلی۔ مولاناؒ اس رشتے کو خصوصیت کے ساتھ عزیز رکھتے تھے۔ کیوں کہ یہ اس عہد کی یادگار رہے جو بہت تیزی کے ساتھ گزر گیا اور ملک کی مجلسیں قدیم صورتوں اور صحبتوں سے یک قلم خالی ہوگئیں۔"

اس اقتباس پر اس انداز سے نظر ڈالی جائے کہ یہ اجمل خاں کی تحریر نہیں بلکہ خود مولاناؒ کی تحریر ہے تو یہ دونوں بزرگوں کے تعلقات کی بہت قیمتی دستاویز بن جاتی ہے۔

دونوں کی آخری ملاقات ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ میں ہوئی جب مولانا مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ اس سے اگلے سال ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء میں حضرت نواب صدر یار جنگ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت نواب صاحب کی موت فرد واحد کی موت نہ تھی بلکہ علم و فضل اور تہذیب و اخلاق کے ایک پورے عہد کا آپ کی ذات پر خاتمہ ہوگیا۔

میں وہ گہرا رشتہ اخلاص ومحبت قائم ہوا جو زندگی کے آخری لمحوں تک باقی رہا۔

افسوس ! اس صدی کا یہ مجدّد، آفتاب علم وفضل اور صاحب کشف و
کرامات بزرگ ۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوگیا۔

اور پھر سیاسی کاموں میں ان کے ..... انہاک اور روز وشب کے معمولات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے تھے، مشاغل کو جاری رکھتے تھے اور معمولات کی پابندی کرتے تھے؛ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی ہر ذمہ داری سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوتے اور ہر مشغلہ اور معمول کو پوری دل جمعی کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھا۔

حضرت شیخ الاسلام اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، شیخ طریقت، ولی کامل، شب بیدار، زندہ دل، ایک بڑے سیاست دان، محبِّ وطن اور بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت تھے۔ ان کی زندگی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے قول "باللیل رھبان وبالنھار فرسان" کا کامل نمونہ تھی۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ نے ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ کی مدینہ منورہ میں گرفتاری ہوئی تو ان کے جاں نثار شاگرد کی حیثیت سے آپ کا نام سُنا تھا۔ پھر جب ۱۹۱۹ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی ملی تو ایک جانباز و مجاہد حریت و استقلال وطن کی حیثیت سے آپ کا شہرہ سُنا۔ ۱۹۲۱ء میں جب تحریک ترک موالات شباب پر تھی، مولانا آزادؒ نے جامع مسجد کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو صدارت کے لئے قرعۂ فال آپ ہی کے نام نکلا۔ ابھی تک مولانا آزادؒ نے صرف آپ کا نام سُنا تھا۔ اب سیرت وکردار اور علم وفضل کا مشاہدہ واندازہ کرنے کا موقع ملا تو آپ کی سنجیدگی ومتانت، اخلاق وکردار، تبحرِ علمی واصابتِ رائے، جذبۂ آزادی وحب الوطنی، اسلام سے والہانہ شیفتگی، قول وفعل کی ہم آہنگی کو بدرجۂ اتم پایا تو ان کی نظروں میں آپ کی قدر ومنزلت اور بڑھ گئی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کو بھی اس چند ماہ کی قربت میں مولانا آزادؒ کو خوب اچھی طرح جاننے پہچاننے اور جانچنے پرکھنے کا موقع ملا۔ اس زمانہ سے ہر دو اعاظمِ رجال

نہیں، بلکہ بعض جگہ وہ ان سے آگے نکل جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

۱۔ یورپی ادب کے ان گوشوں سے کماحقہٗ جان پہچان رکھتے ہیں۔

۲۔ اُردو، فارسی، عربی کے باب میں ان کا ذوق نہایت درجہ منجھا ہوتا ہے۔

۳۔ اپنے ہم نفسوں اور ہم نشینوں کا خاکہ کھینچتے وقت وہ ان کی سیرت کے خفی و جلی سبھی پہلوؤں سے آشنا ہوتے ہیں۔"

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے رشید صاحب کی عقیدت کا سرآغاز "الہلال" کے دَور سے ہوتا ہے۔ عقیدت کی کہانی آپ ہی کی زبانی سنیئے۔

"بہت سے دوسرے اصحاب کی مانند مولاناؒ سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی۔ "الہلال" میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔"

مولانا آزادؒ کی شخصیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفرینندۂ عہد تھے۔ اس لئے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدۂ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب، اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے۔ اس کا احساس آج ہو رہا ہے، جب وہ ہم میں نہیں رہے۔ کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے۔"

۱۱۔ رشید احمدؒ صدیقی

محترم رشید احمدؒ صدیقی صاحب ۱۸۹۶ء میں جونپور (یوپی) کے ایک قصبہ میں پیدا ہوتے۔ مڈل اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ آگئے۔ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اسی یونیورسٹی میں لکچرار مقرر ہوتے ۔ ۱۹۲۵ء میں اُردو کے ریڈر ہوتے بعد میں پروفیسر بنادیئے گئے۔ برسہا برس تک علم وادب اور تعلیم و تدریس کی بیش بہا خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔ لیکن علی گڑھ سے رشتۂ رفاقت توڑنا گوارا نہ کیا چنانچہ مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کرلی۔

علمی وادبی دنیا میں رشید احمدؒ صدیقی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ متعدّد بلند پایہ علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں کے مُصنّف ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے ان کے ادبی مقام و ذوق کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا مرحوم کا یہ اعتراف ان کی عظمت کی سند ہے۔ اور بقول شورش کاشمیری ان کی رائے حرفِ آخر ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

" بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے (رشید احمدؒ صدیقی کے) رشحاتِ قلم مطالعہ کی تنہائی میں دماغ کو مسرت دیتے ہیں۔ ان میں آورد نہیں آمد ہے۔ ایک ایک لفظ تُلا ہوتا ہے ان کی تحریروں کی تہ میں بھی کچھ ہوتا ہے۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق وہ اس وقت بحیثیت ادیب، اُردو کے ایک بہت بڑے طنّاز ہیں۔ وہ اپنے طنزوں میں انتقام نہیں لیتے، موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی، کا رنگ باندھتے اور مطالعہ کی نظروں میں کھبتے چلے جاتے ہیں۔

...... انھیں سوانحی خاکے کھینچنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ یہ بات بعض انگریزی اور فرانسیسی ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔ رشید احمدؒ کسی طرح ان سے پیچھے

سب سے بڑی غلطی یہ کر بیٹھے کہ پھر دوسری دفعہ بھی اسی گوتم جی
کی روح لئے بیسویں صدی جیسے ۔۔۔۔۔۔۔ زمانہ میں جنم لے بیٹھے
۔۔۔۔۔ آپ ہی بتائیے کیا گوتم جی کو پھر دوبارہ اس نرک میں جنم
لینا چاہیئے تھے ؟

ایم ای زکریا صاحب بڑے سنجیدہ، خاموش طبع اور با اخلاق بزرگ ہیں۔ طبیعت میں غنا ، اور بے نیازی شروع ہی سے تھی اور اب تو صبر و توکل کی ایک مثال بن گئے ہیں۔ بھاگلپور میں گوشہ نشینی اور غربت کی زندگی گزار رہے ہیں یا ماضی کی حسین یادوں کو سینے سے لگائے اب اپنی ہی شام زندگی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

۱۲۔ جناب ایم۔ ای۔ زکریا صاحب

ایم ای زکریا صاحب ۱۸۸۰ء میں بنگال کے ایک شہر مالدہ میں پیدا ہوئے۔ نسلاً ایک کشمیری اور صاحب ثروت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کلکتہ، بہار اور یوپی میں تعلیم پائی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ساتھ کچھ دنوں شریک درس بھی رہے اور جب مولاناؒ نے طلباء کو پڑھانا شروع کیا تو کچھ دنوں مولاناؒ سے پڑھتے بھی رہے۔

ادبی زندگی کا آغاز کان پور کے مومن گزٹ کی ادارت سے ہوا۔ مولانا آزادؒ نے "الہلال" جاری کیا تو زکریا صاحب کو اپنے پاس بلالیا۔ ۱۹۱۶ء تک مولاناؒ کے ساتھ رہے۔ ۱۹۱۶ء میں جب مولاناؒ کو کلکتہ چھوڑ دینے کا حکم ہوا تو مولاناؒ رانچی چلے گئے۔ بعد میں زکریا صاحب بھی رانچی تشریف لے گئے اور مدرسۂ اسلامیہ میں قیام کیا۔ اس زمانہ میں کچھ دنوں تک علامہ ٹیگور کے ادارۂ شانتی نکیتن میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

ایم ای زکریا صاحب کئی زبانوں سے واقف اور صاحب استعداد و صلاحیت بزرگ ہیں۔ لیکن استعداد و صلاحیت کے باوجود شہرت و مقبولیت سے دور رہے ممکن ہے اس میں ان کے بعض خیالات کی غرابت کو دخل ہو۔ ان کے خیالات کے اس پہلو کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ان کے صاحبزادہ محترم محمد علی صاحب نے ان کے بارے میں راقم الحروف کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں:

"ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے آج سے ہزاروں سال پہلے مہاتما گوتم بدھ جی کے قالب میں جنم لیا تھا لیکن

۱۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی

آپ کا نام انیس الحسن اور کنیت ابو نجیب تھی لیکن سید سلیمان ندوی کے نام سے شہرت پائی۔ مورث اعلیٰ تقریباً دو سو برس پہلے جزیرۃ العرب سے ہندوستان تشریف لائے اور عظیم آباد (صوبہ بہار) کے نواح میں مشہور قریہ سادات "دسنہ" میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد اور جدّ امجد اپنے وقت کے مشہور و معروف طبیب تھے۔

سید صاحب مرحوم ۲۲۔ نومبر ۱۸۸۴ء میں دسنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی حکیم ابو حبیب سے حاصل کی جو ایک جید عالم اور مشہور طبیب تھے۔ بعض کتابیں اسلام پور، پھلواری شریف اور دربھنگہ کے مدارس میں ختم کیں۔ اس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت عام ہو چکی تھی چنانچہ ۱۹۰۱ء میں ندوہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۶ء میں فارغ عن التحصیل ہوئے۔

علمی دنیا میں پہلے پہل "الندوہ" کے مطلع پر نمودار ہوئے "الہلال" سے روشنی حاصل کی اور ایک عالم کو منوّر کیا۔ کچھ دنوں پونا کالج میں پروفیسر رہے۔ استادِ عزیز علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کی زیر تالیف "سیرت النبیؐ" کو مکمل کیا اور دار المصنّفین کے تصوّر کو عملی شکل دی۔

دار المصنّفین سے کامل تیس سال (۱۹۱۴ء تا ۱۹۴۶ء) کے تعلق کے بعد بعض اسباب خاص کی بنا پر دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد قاضی القضاۃ اور جامعہ احمدیہ کی صدر کی حیثیت سے آپ بھوپال تشریف لے گئے۔ تین سال تک ریاست بھوپال کی تعلیمی و مذہبی اصلاح و تعمیر میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۹ء میں پاکستان تشریف لے آئے۔

حضرت علامہؒ اس دَور کے بہت بڑے سیرت نگار، مورّخ، محقق اور

۱۳- ساؔغر نظامی

آپ کا اصل نام صمد یار خاں اور ساؔغر تخلص ہے۔ ۲۱؍ دسمبر ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ڈاکٹر احمد یار خاں علی گڑھ کے ایک مشہور طبیب تھے۔ قدیم وطن باندہ (یوپی) تھا۔ لیکن مستقل سکونت علی گڑھ میں اختیار کر لی تھی۔

ساؔغر، خواجہ حسن نظامیؒ سے بیعت ہیں، اور اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ 'نظامی' لکھتے ہیں اور اب تو یہ نسبت بھی ان کے نام کا ایک جزو بن چکی ہے۔

ساؔغر نظامی کا شمار دَورِ حاضر کے اچھے شعراء اور انشاء پردازوں میں ہوتا ہے علامہ سیمابؔ اکبر آبادی کے اکابر تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کے کلام کے بارے میں مولانا آزادؒ کی رائے ایک بہترین سند ہے۔

"بادۂ مشرق" ان کا مشہور مجموعہ کلام ہے۔ اس کے علاوہ "بزمِ ساغر" اور "مے خانہ" آپ کے کلام کے دو۲ مجموعے اور بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ کے عقیدت مند اور ان کے فضل و کمال اور ان کی خدماتِ علمی، دینی اور سیاسی کے مدّاح ہیں۔ مولانا مرحوم کی ذات کو قوم و ملک کے لئے باعثِ افتخار اور ایک نادرۂ روزگار ہستی تصوّر کرتے ہیں۔ حضرت مولانا کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا۔

۱۵. علامہ شبلی نعمانیؒ

محمد شبلی نام، نعمانی لقب اور شمس العلماء خطاب تھا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا۔ مورث اعلیٰ تقریباً چار سو برس پیشتر راجپوت ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔

قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ اعظم گڑھ میں وقت کے مشہور عالم مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹیؒ سے تحصیل کی اس کے علاوہ فقہ میں مولانا ارشاد حسین رامپوری، ادب میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور حدیث میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری جیسے یگانۂ عصر اساتذہ سے اکتساب فیض کیا اور اس غرض سے لاہور، رامپور اور سہارنپور وغیرہ کے سفر کئے۔ دارالعلوم دیوبند میں اگرچہ داخلہ نہیں لیا لیکن ایک ماہ قیام کر کے علم الفرائض کی تحصیل و تکمیل کی۔ ۱۸۷۶ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔

علامہ شبلیؒ اپنے وقت کے بہت بڑے محقق، مورخ، ادیب، شاعر، سیرت نگار، اور عالم دین تھے۔ وہ نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے مصنف تھے بلکہ ان کے فیض صحبت سے بڑے بڑے مصنف پیدا ہوئے۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک سابق ریاست حیدرآباد دکن میں سررشتہ علوم و فنون کے ناظم رہے۔ ۱۹۰۵ء میں حالات سے دل برداشتہ ہو کر نظامت سے استعفیٰ دیدیا۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے، پھر معتمد مقرر ہوئے۔ آپ کی معتمدی کا دور ندوۃ العلماء کی تاریخ کا سب سے شاندار دور تھا۔ ندوۃ العلماء کے معاملات و سیاست میں جب کچھ لوگوں سے اختلاف پیدا ہوا، حالات ناقابلِ برداشت اور فضا مکدر ہو گئی تو معتمدی سے (۱۹۱۳ء میں) استعفیٰ دیدیا۔

عالم دین تھے۔ ان کی ذات سے صرف افراد ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ انھوں نے پورے عہد کو متاثر کیا۔ متعدد بلند پایہ تصنیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

۱۹۰۵ء میں مولانا آزادؒ سے واقف ہوتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں چند ماہ الہلال کے ادارے سے وابستہ رہے۔ مولانا آزادؒ کو ہمیشہ اپنے اخلاص و محبت کا یقین دلایا لیکن دل رنجشوں اور شکایتوں سے لبریز تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ فرماتے ہیں:

"سید صاحبؒ کو مولاناؒ سے متعدد رنجشیں اور شکایتیں رہیں۔ جن کا اظہار وہ اپنی صحبتوں میں برابر کیا کرتے تھے۔" (مکتوب بنام شورش کاشمیری، ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان لاہور)

۱۶۔ شورش کاشمیری

کسی بزرگ نے کہا ہے کہ جنت کیا ہے، ایک چٹیل میدان! جو شخص چاہے اپنے ایمان اور عمل سے گلزار بنالے۔ اس بارے میں تو ہم کوئی رائے نہیں دے سکتے لیکن اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ ایک غریب گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا آنکھیں کھلیں تو اس کے سامنے ایک چٹیل میدان تھا، نہ دولت و ثروت تھی نہ خاندان میں علم و فضل کا کوئی بلند نمونہ تھا۔ لیکن اس بچے نے رفتہ رفتہ اپنے عمل و سعی سے اس میدان کو گلزار میں تبدیل کر دیا اور اپنے ہی فراہم کردہ سر و سامان سے اپنی زندگی کا ایک عالیشان محل بنالیا۔ کل وہ دنیا میں ایک ناقابل التفات وجود تھا لیکن آج اس کے گرد وپیش لاکھوں انسانوں کی دنیا آباد ہے جو اس کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو سننے کے لئے بے تاب و بے قرار رہتی ہے۔

یہ بچہ جو آج پچاس کے پیٹے میں ہے، ملک کا مایۂ ناز ادیب، بدیہہ گو شاعر، نڈر صحافی اور شعلہ نوا خطیب شورش کاشمیری ایڈیٹر ہفت روزہ "چٹان" لاہور ہے۔

اصل نام عبدالکریم ہے، لیکن شورش کے عرف و تخلّص اور کاشمیری کی نسبت سے دنیا میں مشہور ہیں۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے ۱۹۳۳ء سے جب کہ اسکول میں ساتویں جماعت کے طالبِ علم تھے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) تک دس سال اور تقریباً چھ ماہ قید و بند میں بسر ہوئے گویا زندگی کا تہائی حصہ ملک کی آزادی کی قربان گاہ پر نذر چڑھا چکے تھے۔ اب ایک مدت سے سیاست سے کنارہ کش اور خالص ادبی زندگی کے شب و روز بسر کر رہے ہیں۔

شورش، ابھی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور سیاسی زندگی میں قدم رکھا ہی تھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے عقیدت و ارادت کا رشتہ قائم ہوا اب اس پر تقریباً

۱۹۱۴ء میں ہندوستان کا عظیم اسلامی ثقافتی تحقیقی ادارہ "دارالمصنفین" قائم کیا۔ الفاروق، الغزالی، شعرالعجم، سوانح مولانا روم، سیرت النعمان، الکلام اور سیرت النبیؐ (حصہ اوّل) وغیرہ آپ کی مشہور تصنیفات اور اردو زبان کا سرمایۂ افتخار و فضیلت ہیں، حکومت نے ان کو علمی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب دیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ان کی پہلی ملاقات دسمبر ۱۸۹۹ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا۔ دوسری ملاقات ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں ہوئی اس ملاقات کے بعد علامہ شبلیؒ کی گرویدگی اور مولانا آزادؒ کی عقیدت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ علامہ شبلیؒ مولانا آزادؒ کے دماغ اور حافظہ کو عجائبِ روزگار میں سے تصوّر کرتے تھے اور مولانا آزادؒ علامہ شبلیؒ کی ان صحبتوں کو جو ۱۹۰۵-۶ء میں بسلسلۂ ادارت "الندوہ" لکھنؤ میں قیام کے زمانہ میں میسّر آئی تھیں، اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

۱۷۔ مولوی ضیاء اللہ خاں

مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب نومبر ۱۸۸۳ء میں ریاست رام پور میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام عطاء اللہ خاں مرحوم تھا۔ جدِّ اعلیٰ مولوی غلام جیلانی خاں علاقہ بونیر (ریاست سوات) سے احمد شاہ کے عہد میں ہندوستان تشریف لے گئے اور بادشاہ کی جانب سے جاگیر و خلعت پائی۔

مولوی صاحب موصوف نے مولوی عبدالغفار خاں، مولوی فضل حق رام پوری پرنسپل مدرسۂ عالیہ رام پور، مولوی عبدالرزاق خاں پروفیسر مدرسۂ عالیہ رام پور اور دیگر اساتذہ سے درسِ نظامیہ کی تکمیل کی اور فارسی ادبیات میں استفادہ کیا۔

مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رام پور کے ایک ذی حیثیت خاندان کے ایک فرد ہیں۔ ان کے جدِّ اعلیٰ مولوی غلام جیلانی خاںؒ نے ریاست رام پور کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لیا تھا۔ آپ نے ریاست کے انتظام و انصرام میں عمر گزاری اور ریاست کے مختلف عہدوں پر فائز رہ کر ۱۹۴۳ء میں خدمات سے سُبک دوش ہوئے۔

مولانا آزادؒ سے پہلا تعارف ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا جب "الہلال" ہندو پاکستان کے مطلعِ صحافت پر نیا نیا چمکا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا آزادؒ رام پور تشریف لائے تھے اور جامع مسجد میں تقریر فرمائی تھی۔ مولاناؒ سے آپ کی پہلی ملاقات اسی موقع پر ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں ملاقات ہوئی اور پھر مختلف مقامات پر مختلف اوقات میں صحبت رہی۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وسیع النظری، تبحرِ علمی اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کے قائل و معترف ہیں۔

۳۲ سال کے لیل و نہار گزر چکے ہیں۔ اس میں کڑے وقت بھی آتے اور نازک دور سے بھی گزرنا پڑا لیکن یہ رشتۂ ارادت ہر آنچ اور ہر اثر سے محفوظ رہا، شورش کاشمیری نے لکھا ہے!

"میرا خیال ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے میری عقیدت کا رشتہ استوار ہے اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔ میں نے راہنماؤں میں سب سے زیادہ محبّت انہی سے کی ہے۔ قید خانہ میں مجھ سے یوسف مہر علی نے پوچھا تھا اگر تمھیں راہنماؤں میں سے ایک رہنما منتخب کرنے کے لئے کہا جائے اور کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب، تو تم کس کا انتخاب کروگے؟ میں نے ایک لحظہ توقف کئے بغیر جواباً کہا تھا۔ راہنماؤں میں ابوالکلام آزادؒ اور کتابوں میں "ترجمان القرآن" میری زندگی ان دونوں سے متاثر ہے اور میں نے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ انہی کی بدولت ہے۔"

مولانا آزادؒ کو بھی شورش کاشمیری سے گہرا تعلق خاطر تھا اور جن خوش نصیبوں کو حضرت مولاناؒ نے "عزیزی" کے محبّت آمیز القاب سے مخاطب فرمایا ان میں شورش کاشمیری کا نام بھی آتا ہے شورش کے بارے میں مولاناؒ نے اپنے سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب سے فرمایا تھا:

"شورش نے زندگی میں بہت سے مصائب سہے ہیں ایک زمانہ میں تو سخت پریشان تھے لیکن کسی مرحلے میں بھی شدائد نے دل آزردہ نہ کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں جوانمردی سے برداشت کیں۔ اس کے نا موافق حالات اور بھی سنگ دلانہ تھے۔ لیکن ان کا پورے عزم کے ساتھ مقابلہ کیا۔"

اور خود شورش سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

"ظاہر ہے ان حالات میں وقت کی آلودگیاں اپنے کچھ داغ چھوڑ جاتی ہیں لیکن مجھے یہ معلوم کر کے ہمیشہ راحت ہوئی کہ آپ ایسی ہر آنچ سے محفوظ رہے ہو۔"

مولانا ظفر علی خاںؒ اس دَور کے عظیم صحافی، بلند پایہ شاعر اور بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی اصل سیاسی زندگی ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتی ہے۔ ملکی اور قومی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سے گزرے، ہر بڑے سیاسی لیڈر سے رشتۂ اتحاد باندھا، ہر جماعت کی تعمیر میں حصّہ لیا، ہر تحریک کا ساتھ دیا اور اس دَور کے کتنے ہی ہنگاموں کی رہنمائی فرمائی۔ شاعرانہ مزاج اور جذباتی طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے اشتراکِ فکر و عمل کی بنیاد ہمیشہ وقتی حالات اور جذباتِ صادقہ رہے۔ ان کی حیثیت ایسے رہنما کی نہ تھی جو عوام کو اپنے پیچھے لے کر چلتا ہے بلکہ ان کی حیثیت ایسے لیڈر کی تھی جو عوام کے جذبات اور خیالات کے مطابق ان کی رہنمائی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جوں جوں حالات میں تبدیلی ہوتی گئی ان کے اشتراکِ فکر و عمل کے انداز بدلتے گئے۔ تحریکِ خلافت، کانگریس، احرار، اتحادِ ملّت اور مسلم لیگ وغیرہ کے ساتھ ان کا ایسا ہی تعلّق رہا۔ حضرت مولانا آزادؒ نے ان کی طبیعت کی اس بوقلمونی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

> "کوئی تحریک مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اٹھانا چاہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو، وہ بسُرعت تمام عمارت کھڑی کر دیں گے، لیکن عمارت تیار ہو جائے تو انھیں فوراً نکال لو، کیونکہ وہ بنانے کے بعد ڈھانے لگتے ہیں۔"

جب ان کا آفتاب نصف النّہار پر تھا تو ایک ہنگامہ تھے، لیکن آخری دنوں میں تو ایک گمشدہ ورق تھے۔ کبھی ان کے جلوس میں لاکھوں آدمیوں کا ایک متلاطم سمندر ہوتا تھا، لیکن آخری سفر پیش آیا تو ایک درجن آدمی بھی کاندھا دینے والے موجود نہ تھے۔ بقول شورش کاشمیری صاحب، ایک بیٹا، دو پوتے، تین بھائی اور چار ملازم تھے جن کے ہاتھوں آخری رسومات انجام پائیں۔

۱۸۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم

مولانا ظفر علی خاں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سراج الدّین احمد اور دادا کا نام کرم الٰہی خاں ابن محمد حسن خاں تھا۔ آپ کا خاندان کئی صدیوں سے دارا پور میں آباد تھا، پردادا نے سیال کوٹ کے پرکھا گاؤں میں سکونت اختیار کی، بعد میں وزیر آباد چلے آئے اور شہر سے کچھ فاصلے پر کرم آباد کی بنیاد رکھی۔ مولاناؒ کے والد سراج الدّین احمدؒ محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اخبار زمیندار جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاںؒ نے وزیر آباد مشن ہائی سکول سے مڈل اور مہندر سنگھ کالج پٹیالہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور بی اے کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔

حیدر آباد (دکن) میں ملازمت اختیار کی اور اسسٹنٹ ہوم سکریٹری اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار کے بلند عہدوں پر مامور رہے۔ حیدر آباد میں ۱۲-۱۳ سال قیام رہا اس دوران میں کئی کتابوں کے ترجمے کئے، مثلاً خیابانِ فارس، فسانۂ لندن، سیر ظلمات اور معرکۂ مذہب وسائنس، اوّل الذکر ترجمہ پر پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے پانچ سو روپے نقد، اور مصنّف (لارڈ کرزن) کی جانب سے طلائی دستہ کی ایک چھتری انعام میں ملی۔

میر عثمان علی خاں کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے کے جرم میں حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔ اور وہاں سے بمبئی چلے گئے۔

۹ر نومبر ۱۹۱۹ء کو آپ کے والد مولوی سراج الدّین احمدؒ کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق "زمیندار" کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دوستوں کے مشورے سے کرم آباد کی بجائے لاہور سے شائع کیا۔

۱۹۔ محمد عبدالشاہد خاں شروانی

ابوالمجاہد محمد عبدالشاہد خاں شروانی جنوری ۱۹۱۵ء میں بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام محمد عبدالواجد خاں تھا ابتدائی تعلیم گھر پر والد ماجد اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی ۱۹۲۴ء میں حضرت والد کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۵ء میں خاندانی دارالعلوم، مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ، دادوں، ضلع علی گڑھ میں داخل ہوئے اور ابتدائی کتب پڑھیں اور علامہ وحیدالدین احمد خاں صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا، اس کے بعد چند سال مدرسۂ عربیہ نیازیہ خیرآباد میں تعلیم حاصل کی لیکن تکمیل دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف میں حضرت علامہ معین الدین اجمیری ہی سے کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد چند سال تک مدرسہ عربیہ حافظیہ سعیدیہ میں خدمات تدریس انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۵ء سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لٹن لائبریری میں عربی و فارسی کتب کے شعبے کے انچارج کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ آج کل مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیشنل اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

عبدالشاہد خاں صاحب ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جو خاندانی روایات کے برخلاف ہمیشہ جادۂ حریت پر قائم و گامزن رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب کہ وہ تعلیم سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ملکی سیاسی معاملات میں ان کا تعلق قوم پرور مسلمانوں کے گروپ اور کانگریس کے نظریۂ سیاست کی ہمنوا جماعتوں سے رہا۔

عبدالشاہد خاں اردو کے بلند پایہ ادیب و شاعر ہیں، فارسی میں بھی شعرگوئی کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے علمی مقام کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ

مولانا ظفر علی خاںؒ نے ۸۴ برس کی عمر پائی، جن میں سے تقریباً ۱۴ برس قید کی نذر ہو گئے گویا عمر کا چھٹا حصّہ جیل میں بسر ہوا۔

مولانا ظفر علی خاںؒ کی زندگی میں مولانا آزادؒ سے اتحاد و اتفاق کے مختلف زاویے بنتے چلے گئے لیکن اس کے باوجود سیاسی زندگی کے بہت سے مسائل میں مثلاً تحریک خلافت، خلافت اور ترکی، شاہ سعود اور مسئلہ حجاز، احرار کا قیام و انہدام وغیرہ بے شمار مسائل میں اصولی اور فکری اعتبار سے وہ حضرت مولانا آزادؒ سے سب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا آزادؒ کے متعلق ان کے ...... خیالات کا اندازہ ان کے ان اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے، جن میں انھوں نے حضرت مولاناؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ دیکھئے! اس خوبی کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں:

جہانِ اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو تو پوچھ، بوالکلام سے

۲۰- چودھری خلیق الزّماں صاحب

چودھری صاحب موصوف ۲۵- دسمبر ۱۸۸۹ء میں مرزاپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ عبدالرحیم بعہد شہنشاہِ اکبر حجاز سے چل کر وارد ہند ہوئے۔ شہنشاہِ اکبرؒ نے ان کو خلعت سے سرفراز فرمایا اور لکھنو اور اس کے ساتھ کچھ پرگنے بطورِ جاگیر عطا فرمائے۔ آپ کے پوتے محمدؐ زماں صاحب گلشنِ محمدی' اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں صاحبِ منصب تھے۔ چودھری صاحب کے والد ماجد صاحبِ گلشنِ محمدی کی ساتویں پُشت میں اور انہی کے ہم نام تھے۔

چودھری صاحب کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم لکھنو میں ہوئی اعلیٰ تعلیم کے لئے ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے کالج میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۱۲ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

دسمبر ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی معیت میں طبی وفد کے سکریٹری کی حیثیت سے ترکی تشریف لے گئے۔ آپ کی سیاسی زندگی کی یہ گویا ابتدا تھی۔ اس کے بعد تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، کانگریس، مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا اور مختلف تعلیمی اصلاحی تحریکات سے وابستہ رہے۔ مقامی سیاسیات سے لے کر کل ہند معاملات تک میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

تقسیم ملک کے بعد پاکستان تشریف لے آئے۔ بیرونِ ملک پاکستان کی سفارت و نمائندگی کے عظیم فرائض انجام دیئے اور اندرونِ ملک مشرقی پاکستان کے گورنر کی حیثیت سے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ حکومت سے باہر رہ کر بھی آپ نے ملک و قوم کی تعمیر و اصلاح کی بہترین خدمات انجام دیں اور شریک حکومت ہو کر بھی قوم و ملک کی رہنمائی فرمائی۔ بلاشبہ آپ کا شمار پاکستان کے اکابر سیاست دانوں

حضرت امام الہندؒ اور نواب صدر یار جنگؒ کے علمی مخاطب اور شریک بزم علم وادب رہے ہیں حضرت نواب صاحبؒ تو ان کے خاندانی بزرگ بھی تھے۔ دونوں بزرگوں سے ان کو غایت درجہ عقیدت اور محبّت تھی۔ حضرت مولانا آزادؒ کی وفات پر نظم ونثر میں اپنے جذباتِ عقیدت کا بھی اظہار کیا ہے اور مولاناؒ کے علمی ادبی اور سیاسی مقام پر بلند ترین مقالات بھی پیش کئے ہیں۔

حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کی مشہور کتاب "الثورۃ الہندیہ" کے مترجم اور "کاروانِ خیال" کے مقدمہ نگار کی حیثیت سے وہ علمی وادبی حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالحق خیر آبادی کی کتاب زبدۃ الحکمۃ بھی آپ کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔ شعر وادب اور سیاست کی طرح صحافت سے بھی آپ کا علمی وعملی تعلق رہا ہے اور ملک کی آزادی کے بعد وہ کئی رسائل کی ادارت وسرپرستی فرما چکے ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے عبدالشاہد خاں شروانی نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں رشتۂ اخلاص ومحبّت قائم کیا تھا جو آج تک استوار ہے۔ اس دوران میں ملکی سیاسیات میں مختلف نشیب وفراز آئے جس سے حضرت مولاناؒ کے بعض ہم خیال حتےٰ کہ عقیدت مند بھی متاثر ہوئے اور وہ مخالف کیمپ میں چلے گئے اور بعض نے تو مخالفت کو بھی آخری حدوں تک پہنچا دیا لیکن عبدالشاہد خاں کی محبت اور عقیدت ہر آنچ سے محفوظ رہی بلکہ ان کے گہرے سیاسی مطالعہ اور مشاہدے نے حضرت مولانا کی عقیدت اور محبت کے نقش کو اور گہرا کر دیا۔ عبدالشاہد خاں کی اس بے غرض محبّت اور اخلاص سے حضرت مولاناؒ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ شاہد صاحب ان معدودے چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن کو ان کے اخلاص ومحبت کی بنا پر مولاناؒ "عزیزی" کے لقب سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔

۲۱- خواجہ عبدالوحید صاحب

حضرت خواجہ صاحب کا تعلق کشمیر کے ایک اعلیٰ خاندان سے ہے جو اپنی بزرگی اور شرافت کی وجہ سے "خواجہ" کہلاتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہ خاندان وارد لاہور ہوا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاریخ اقوام کشمیر میں محمد دین فوق نے اس معزز خاندان کا بہ تفصیل تذکرہ ۔۔۔ کیا ہے۔

خواجہ صاحب ۳۰ رجنوری ۱۹۰۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے مشہور گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول اور گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔

تصنیفی و تالیفی زندگی کا آغاز ۱۹۲۷ء میں کیا اور وقت کے مشہور رسائل واخبار مثلاً مخزن (حفیظ جالندھری) اختر ستان (اختر شیرانی مرحوم) زمیندار (مولوی ظفر علی خاںؒ) اور معارف (سید سلیمان ندویؒ) میں آپ کی نگارشات شائع ہوتی رہیں۔ ۱۹۳۴ء سے اپنا رسالہ "الاسلام" (انگریزی) لاہور سے جاری کیا جو ۱۹۴۷ء تک نکلتا رہا اور تقریباً دس سال تک کراچی سے نکلتا رہا افسوس کہ یہ مفید رسالہ ۱۹۶۳ء میں بند ہو گیا۔

اخبارات و رسائل میں سینکڑوں بلند پایہ مضامین و مقالات کے علاوہ تاریخی، اسلامی، اصلاحی اور تحقیقی موضوعات پر متعدد چھوٹے چھوٹے رسائل شائع کئے۔ ان کا عظیم الشان علمی کارنامہ "ببلیوگرافی آف اسلام" کی ترتیب ہے جو فل اسکیپ سائز کے دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے اس میں اسلام، مسلمانوں اور علوم اسلامیہ کے بارے میں مشرق و مغرب کی بڑی بڑی زبانوں میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے دو ہزار سے زائد عنوانات کے تحت اس کے حوالے جمع کر دیئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے آپ کے اس کام کو ایک معجزہ قرار دیا ہے۔

اور رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ "پاتھ وے ٹو پاکستان" آپ کی عظیم اور قابل قدر تصنیف ہے۔

سیاسی و نظریاتی اعتبار سے چودھری صاحب موصوف کا مولانا ابوالکلام آزادؒ سے نہ صرف اختلاف رہا بلکہ بارہا ٹکراؤ کی نوبت بھی آئی لیکن ذاتی تعلقات کے لحاظ سے چودھری صاحب لیگی رہنماؤں میں مولانا آزادؒ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ ذاتی حیثیت سے آپ نے مولاناؒ کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھا وہ مولاناؒ کی شخصیت کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کے بعض سیاسی خیالات سے اختلاف رکھتے تھے۔ چودھری صاحب نے اکثر مواقع پر سختی سے ان کے خیالات کی تردید کی لیکن آپ کا یہ اختلاف اصولی تھا اور اس کے کچھ حدود مقرر کر لئے تھے ان کو کبھی نہیں توڑا۔ اسی وجہ سے حضرت مولاناؒ کے دل میں بھی آپ کی قدر و منزلت تھی۔
حضرت مولاناؒ نے اپنے خطوط میں جس بے تکلفی اور "صدیقی العزیز" کے محبت بھرے القاب سے آپ کو مخاطب کیا ہے وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے۔

اور عجائب روزگار حافظہ اور ان کی ذہانت کے معترف ہیں بلکہ ان کی اسلامی خدمات اور تحریک آزادی میں ان کی بے مثال قربانیوں اور کارناموں کے بہت بڑے مدّاح ہیں اور ان کو اسلامی و قومی تاریخ کا زرّیں باب تصوّر کرتے ہیں۔

۲۲۔ عمر رضا

عمر رضا مصر کے رہنے والے تھے۔ ترکی چلے گئے اور ایک مدت تک وہیں رہے۔ جس زمانہ میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مصر میں۔ زیر تعلیم تھے اور قسطنطنیہ تشریف لے گئے ... اس زمانہ میں وہ وہاں موجود تھے۔ "پان اسلام ازم" کے ایک لیڈر اور ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا نے ایک رسالہ "جہانِ اسلام" جاری کرایا تھا۔ یہ رسالہ اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اردو حصّہ کے ایڈیٹر ابوسعید العربی الہندی ایک صاحب تھے، ترکی حصہ کے ایڈیٹر ایک اور بزرگ تھے، عربی حصے کے ایڈیٹر یہی عمر رضا صاحب تھے۔ ابوسعید سے ملیح آبادی کی ملاقات مصر میں ہو چکی تھی، ملیح آبادی قسطنطنیہ پہنچے تو ابوسعید نے "جہانِ اسلام" کے حصہ اردو کی ادارت انھیں سونپ دی یہیں ان کی ملاقات عمر رضا سے ہوئی اور بہت جلد دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ مولانا ملیح آبادی ہندوستان واپس آ گئے جب بھی ان سے تعلقات برابر قائم رہے، ملیح آبادی نے ان کا تعارف اپنی آپ بیتی میں ان الفاظ میں کرایا ہے۔

("جہانِ اسلام کے) عربی حصہ کے ایڈیٹر بھی مجھ سے آٹھ دس بڑے ہوں گے۔ لیکن بڑے پھرتیلے اور خوش مزاج مصری تھے۔ ان کا نام عمر رضا تھا۔ مصر اور ترکی کی اخباری دنیا میں انھوں نے

اسی قسم کا ایک اور علمی کام "اقبال ببلیوگرافی" کی ترتیب ہے یہ کتاب حال ہی میں اقبال اکیڈمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے آپ کی ایک اور مفید تالیف حال ہی میں تکمیل کو پہنچی ہے۔ اس میں سینکڑوں عنوانات کے تحت قرآن کی آیات کو ترتیب دیا ہے۔ یہ اس موضوع پر آخری، جامع اور مفید ترین کتاب ہے۔ یہ تالیف مرکزی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی جانب سے اُردو اور انگریزی تراجم کے ساتھ علیحدہ علیحدہ دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔

شاید یہ بات خواجہ صاحب کے بہت قریبی دوستوں اور جاننے والوں کو بھی معلوم نہ ہو کہ خواجہ صاحب ایک اچھے افسانہ نگار، شاعر اور مقرر بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "تلاش سکون" کے نام سے "تاج کمپنی" نے شائع کیا تھا جو اب نایاب ہے۔ شعری تخلیقات، موقتہ اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہیں لیکن خواجہ صاحب شعر و شاعری اور افسانہ نگاری سے زیادہ دنوں تک دلچسپی نہ لے سکے۔

علمی مشاغل کے ساتھ متعدد تعلیمی، اصلاحی اور تحقیقی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے علمی مقام اور ان سے استفادہ کا مشرق و مغرب کے متعدد اہلِ قلم اور مفکرین نے اعتراف کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ کی مشہور انگریزی تفسیر پر نظرِ ثانی اور اصلاح کی خدمات آپ ہی نے انجام دیں۔

برِّ صغیر پاک و ہند کے تمام مشاہیر سے ان کے تعلقات رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ سے تو ان کی رشتہ داری بھی تھی۔ مولانا سیّد سلیمان قیامِ پاکستان سے قبل جب بھی لاہور تشریف لاتے تو آپ ہی کے یہاں قیام فرماتے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے خواجہ صاحب کو ایک خاص عقیدت اور تعلّقِ خاطر رہا ہے۔ خواجہ صاحب مولانا آزادؒ کے نہ صرف علم و فضل اور اخلاقی کمالات

تیس کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم تھے۔ ان کی آخری کتاب "ذکر آزاد" ہے جس میں مولانا آزادؒ کی رفاقت کے اڑتیس سال کی کہانی ہے۔

مولانا آزادؒ سے ۱۹۲۰ء میں رشتۂ محبت و عقیدت قائم ہوا تھا جو آخر دم تک قائم رہا اگرچہ فکر و نظر کے بعض گوشوں میں شدید اختلاف تھا لیکن یہ تعلق ہر آنچ اور ہر اثر سے محفوظ رہا اور یہ رشتہ کبھی منقطع نہ ہوا۔

۱۹۲۰ء میں ملاقات کے چند دن بعد ہی حضرت مولاناؒ نے ان کو حلقۂ یوپی میں تنظیم و قیام جماعت کے لئے اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ اواخر ۱۹۲۰ء میں جب مولانا آزادؒ نے جامع مسجد کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو ملیح آبادی کو لکھنؤ سے بلا کر مدرسہ کا مہتمم مقرر کیا۔ "پیغام" جاری ہوا تو اس کا ایڈیٹر ملیح آبادی کو بنایا۔ ۱۹۲۱ء کے آخر میں ملیح آبادی گرفتار ہوئے تو "پیغام" میں مولانا آزادؒ نے ملیح آبادی پر ایک رُقعہ تحریر لکھی۔ تقریباً ایک سال کے بعد قید سے رہا ہوتے تو "الجامعہ" (عربی) ملیح آبادی کی ادارت میں نکالا۔ ۱۹۲۷ء میں "الہلال" دوبارہ نکلا تو اس کا سارا انتظام آپ ہی کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۲۷ء کے خاتمہ کے ساتھ ہی مولانا آزادؒ کی رفاقت کا تقریباً آٹھ سالہ دَور بھی ختم ہوگیا۔ ابھی تک وہ مولانا آزادؒ کے ساتھ رہتے تھے اب انھوں نے علٰحدہ رہائش کا بندوبست کرکے مصر و قسطنطنیہ کے اخبارات کی نامہ نگاری اور تالیف و ترجمہ کا شغل اختیار کیا۔ پھر کلکتہ ہی سے اپنا اخبار نکالا اور خوب چلایا۔

ملک کی آزادی کے بعد مولانا آزادؒ ہندوستان کے وزیر تعلیم بنے انھوں نے ملیح آبادی کو بھی (۱۹۴۹ء کے آخر میں) دہلی بلا لیا اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا عربی سہ ماہی رسالہ "ثقافۃ الہند" آپ کی ادارت میں جاری کیا گیا کچھ دنوں کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے عربی شعبے کے مشیر (ایڈوائزر) اور پھر مدیر (سپروائزر) مقرر

بعد میں بہت نام پیدا کیا۔" (آزاد ہند۔ کلکتہ ملیح آبادی نمبر ص ۱۹۹)

الہلال کے ایڈیٹر، تحریک خلافت اور ترک موالات کے لیڈر کی حیثیت سے عمر رضا مولانا آزادؒ کا شہرہ سن چکے تھے اور مولاناؒ کے لئے اپنے دل میں بڑی عزت رکھتے تھے۔ جب انھوں نے قولِ فیصل کا عربی ترجمہ "ثورۃ الہند" (از ملیح آبادی) دیکھا تو اس سے بہت متاثر ہوئے اور ترکی زبان میں اس کا ترجمہ شائع کیا۔

اگرچہ مولانا ابوالکلام آزادؒ الہلال کے زمانہ سے ترکی کے علمی، سیاسی اور صحافتی حلقوں میں ایک معروف شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ قولِ فیصل کے ترکی ترجمہ کی اشاعت سے مولانا آزادؒ کی شخصیت کا نقش داعی حق، صاحب عزیمت، تحریکِ آزادی کے ایک بڑے رہنما اور سیاست داں کی حیثیت سے اور گہرا ہوگیا۔

۲۳۔ مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادی

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تقریباً ۱۸۹۵ء میں لکھنو کے مشہور قصبہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں حاصل کی ۱۹۱۴ء میں مصر چلے گئے اور علامہ رشید رضاؒ کے مدرسہ "دعوت وارشاد" میں داخل ہوگئے اور علوم ادبیہ اور تفسیر قرآن وغیرہ کی تحصیل کی۔ دورانِ تعلیم میں قسطنطنیہ کا سفر کیا اور ۱۹۱۸ء میں ہندوستان واپس آئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دوبارہ داخلہ لیا اور علم حدیث کی تکمیل کی۔

مولانا ملیح آبادی علمی وادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ تقریباً

دفتر دہلی لے آئے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں آپ پاکستان تشریف لائے
۔ کراچی میں مستقل قیام کیا۔ آپ کی کوششوں سے انجمن ترقیٔ اردو کا احیاء ہوا،
اردو کالج کا قیام آپ کا بہت بڑا کارنامہ اور اردو یونیورسٹی آپ کی بہت
بڑی تمنا تھی جو افسوس کہ ان کے انتقال کے بعد بھی ابھی تک پوری نہ ہو سکی

مولوی عبدالحق مرحوم اردو کے بہت بڑے ادیب، محقق، نقاد اور لسانیات
کے ماہر تھے۔ متعدد بلند پایہ تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم کبھی
کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا ایک شعر خاصا مشہور ہے جو ان کی زندگی کی صحیح معنوں
میں عکاسی کرتا ہے۔

نہ عشق بتاں ہے نہ فکر معیشت مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

اردو کا یہ محسن و عاشق سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ۱۶۔ اگست ۱۹۶۱ء
میں اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

۱۹۰۳ء میں مولانا آزادؒ نے "لسان الصدق" جاری کیا تو اس کے مقاصد
میں اردو کی ترقی اور ادبی مذاق کی اشاعت بھی شامل تھی ایجوکیشنل کانفرنس
نے اس کو اپنا ترجمان ..... بنایا تھا۔ انجمن ترقیٔ اردو اس وقت کانفرنس کا
محض ایک شعبہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اسی زمانہ میں مولوی عبدالحقؒ مولانا آزادؒ
سے واقف ہوئے۔

۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب مرحوم انجمن ترقیٔ اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے
تو انھوں نے مولانا آزادؒ کے "الہلال" کو انجمن ترقیٔ اردو کے اغراض و مقاصد
کی تبلیغ و اشاعت اور اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔
تقسیم ملک کے بعد دونوں بزرگوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کے مرکز
اور طریقۂ کار کے بارے میں اختلاف رائے تھا۔ مولوی صاحبؒ پاکستان تشریف لے آئے

ہوئے۔

فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزادؒ نے اس دارِ فانی سے رحلت کی تو ملیح آبادی کا دل بھی اُچاٹ ہوگیا۔ صحت تو ۱۹۵۳ء سے خراب تھی کینسر کے موذی مرض کی ابتدا ہو چکی تھی۔ کئی بار مرض اُبھر چکا تھا اور علاج سے عارضی افاقہ ہوگیا تھا۔ مولانا آزادؒ کی وفات کے بعد مرض عود کر آیا، صحت روز بروز گرتی چلی گئی بالآخر ۴ر جون ۱۹۵۹ء میں تقریباً ۶۴ برس کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔

۴۲۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحقؒ

مولوی عبدالحق مرحوم ۲۰۔ اپریل ۱۸۷۰ء میں ضلع میرٹھ (یوپی) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پنجاب میں محکمۂ مال میں ملازم تھے۔ اس وجہ سے مولوی صاحبؒ کی ابتدائی تعلیم پنجاب میں ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ آگئے۔ ۱۸۹۴ء میں بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد حیدر آباد تشریف لے گئے اور مدرسۂ آصفیہ کے صدر مدرّس مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات کے منصبِ اعلیٰ تک پہنچے۔ ۱۹۲۴ء میں عثمانیہ کالج قائم ہوا تو آپ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ پانچ سال کے بعد اسی عہدے سے پنشن لی۔ اس کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر بنائے گئے لیکن ۱۹۳۷ء میں اس عہدے سے آپ نے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۱۲ء میں آپ کو انجمن ترقی اُردو کا سکریٹری منتخب کیا گیا تھا اس وقت سے وفات تک انجمن سے تعلق رہا۔ ابتداءً انجمن ترقیِ اُردو کا دفتر اورنگ آباد میں تھا لیکن حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء میں انجمن کا

۲۵- مولانا عبدالباری ندوی

مولانا عبدالباری ندوی، صاحب برّصغیر پاک و ہند کے مشہور مصنّف اور اہلِ قلم ہیں۔ آبائی وطن بارہ بنکی ہے لیکن مستقل قیام ایک مدّت سے لکھنو میں ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ عن التحصیل اور مولانا شبلی نعمانیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور اس گروپ سے تعلّق رکھتے ہیں جن کی مولاناؒ نے خاص طور پر تربیت فرمائی۔ عرصہ تک دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دیتے رہے۔ غالباً ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے اور جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

فلسفہ اور اخلاق و تصوّف اور تعلیم وغیرہ پر آپ کی مفید و بلند پایہ تصانیف و تراجم ہیں۔

آپ کے نام مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولاناؒ سے ان کے تعلّقات قریبی تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:

> "مولانا آزادؒ کے ان کے تعلّقات ایک حد تک بے تکلّفی کے اس زمانہ میں قائم ہو گئے تھے۔"

اگرچہ سیاسیات ان کا علمی موضوع یا عملی میدان نہ تھا نیز مولانا اشرف علی تھانویؒ کی صحبت و تربیت نے ایک دوسرا ہی رنگ چڑھا دیا تھا لیکن مولانا آزادؒ سے ان کے اخلاص و محبّت میں کبھی فرق نہ آیا۔ مولاناؒ کے علم و بصیرت کے متعلّق ان کی رائے ہمیشہ بلند رہی اور ان کی عظمتِ کردار اور اخلاقی کمالات کے ہمیشہ مدّاح و معترف رہے۔ مولانا آزادؒ کی رائے بھی ان کے بارے میں ... اچھی رہی۔ مولانا دریابادی کے نام ایک خط میں اُن کے ایک سلسلہ مضمون "مکالمات بر کلے" مطبوعہ معارف،

اور یہاں انجمن ترقی اُردو کا احیاء کیا۔ مولانا آزادؒ کی کوششوں سے ہندوستان میں سامان لخت لخت جمع ہوا اور انجمن کو دوبارہ زندگی ملی۔

اگرچہ مولوی صاحبؒ کے یہاں مولانا آزادؒ کی علمی و ادبی شخصیت سے انکار کی حد تک بُعد پایا جاتا ہے لیکن پاکستان آنے کے بعد مولوی صاحبؒ کے خیالات کافی بدل گئے تھے اور مولانا آزادؒ کی اصابتِ رائے کے قائل ہو گئے تھے یہی وجہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مولانا آزادؒ کی تقریر (۱۹۴۹ء) کو انھوں نے قومی زبان میں نام اہتمام کا بصیرت افروز خطبہ" کے جلی عنوان سے نمایاں طور پر شائع کرایا۔

مولاناؒ کی آخری بیماری کے زمانہ میں مولوی صاحبؒ جس طرح پریشان اور بے چین رہے وہ ان کے قریبی لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ پھر مولاناؒ کی وفات پر انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ایک ہنگامی اجلاس بُلایا گیا اس میں خود قرار دادِ تعزیت پیش کی اور شاندار الفاظ میں مولاناؒ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ نیز مولاناؒ کی زندگی اور علمی و ادبی شخصیت پر قومی زبان کا ایک پورا نمبر مرتب کرایا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابائے اُردو کو مولاناؒ سے بُعد نہیں رہا تھا اور وہ دل سے مولاناؒ کی عزت کرتے تھے۔

ادارتی فرائض انجام دے چکے تھے اور علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں خوب متعارف تھے۔ مولوی عبداللطیف سے بھی غائبانہ تعارف تھا۔ لیکن کوئی تعلقات نہ تھے۔ دارالسلطنت کے زمانۂ اجراء میں ذاتی تعلقات بھی کسی قدر پیدا ہو گئے تھے ۱۹۰۷ء کے شروع میں کچھ دنوں تک دارالسلطنت جاری رہا لیکن مولانا آزادؒ نے جلد ہی اس سے قطع تعلق کر لیا اور پھر اخبار بھی بند ہو گیا۔ قطع تعلق کی وجہ مولانا آزادؒ یہ بتاتے ہیں!

"میں نے محسوس کیا کہ مرحوم مولوی عبداللطیف جو خود ذاتی دلچسپی اس کام میں نہیں رکھتے تھے، دوسرے لوگوں کے اغراض سے متاثر ہوتے ہیں اور اخبار کی پالیسی اور وقت کے مسائل کی نسبت دخل دینے لگتے ہیں۔ میں نے چونکہ محض اپنے لئے ایک مشغلہ سمجھ کے اسے اختیار کیا تھا۔ ان باتوں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر اخبار بھی بند ہو گیا۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۳۲۲)

مولوی عبداللطیف کا سن وفات صحیح معلوم نہیں ہو سکا البتہ اس قدر معلوم ہے کہ ۱۹۲۲ء سے قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ آزاد کی کہانی (۱۹۲۲ء) میں مولانا آزادؒ ہی سے یہ جملہ ہے۔

"افسوس ہے کہ اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔"

کی تحسین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حکیم عباری (مولانا عبدالباری ندوی) صاحب "تصوراتِ کلیہ" بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں، جس قدر کہ آپ"۔
(مکتوب مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء)۔

مولانا آزاد کی یہ رائے تو ان کے متعلق ۱۹۱۸ء میں تھی جب کہ ان کی علمی زندگی کی ابتدا ہی تھی، عروج انھیں بعد میں نصیب ہوا۔

۲۶۔ مولوی عبداللطیف

مولوی عبداللطیف صاحب، کلکتہ کے مشہور تاجر چرم تھے۔ ان کے والد مولوی عبدالباری مرحوم بھی چرم کی تجارت کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے قبل کلکتہ سے فارسی میں کئی اخبار نکلتے تھے۔ منجملہ ان کے "دوربین" تھا۔ انقلاب کے بعد جب فارسی کا دورِ انحطاط شروع ہوا اور اُردو نے اس کی جگہ لے لی تو "دوربین" نے "اردو گائیڈ" کا قالب اختیار کر لیا۔ پھر جب مولوی عبدالباری کے قبضہ میں آیا تو انھوں نے اسے "دارالسلطنت" کے نام سے نکالا۔ مولوی عبدالباری کے انتقال کے بعد دارالسلطنت بند ہو گیا مولوی عبداللطیف صاحب اپنے والد کی یادگار کو دوبارہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ مولانا آزاد ۱۹۱۰ء کے آواخر میں امرتسر سے کلکتہ گئے تو مولوی محمد یوسف جعفری رنجور نے مولانا آزاد سے مولوی عبداللطیف کا تعارف کرایا اور مولانا آزاد کو دارالسلطنت کی ادارت سنبھالنے پر راضی کر لیا مولانا آزاد اس وقت تک نیرنگِ عالم، المصباح، احسن الاخبار، خدنگِ نظر (حصہ نثر)، لسان الصدق، الندوہ، اور وکیل کے

پاکستان چلے آنے کے بعد انجمن ترقی اُردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔

ان کی پہلی شہرت ایک نڈر اور بے باک صحافی کی حیثیت سے ہوئی لیکن "لیلیٰ کے خطوط" نے ان کی ادبی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ "مجنوں کی ڈائری" بھی ان کی مشہور کتاب ہے۔ علمی تصانیف میں "آثار جمال الدّین افغانی" "حیاتِ اجمل" اور "آثار ابوالکلام" ان کی مشہور و مقبول کتابیں ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ان کی واقفیت "الہلال" کے زمانہ سے تھی۔ تحریکِ خلافت اور تحریک عدم تعاون میں مولاناؒ کے ساتھ کام بھی کر چکے تھے۔ مولانا مرحوم ان سے واقف تھے لیکن اس وقت تک کوئی خاص تعلقات نہ تھے بہ ۱۹۳۶ء کے بعد تعلقات بہت گہرے اور بالکل گھریلو قسم کے ہو گئے تھے۔ قاضی صاحب جگر کے سرطان میں مبتلا ہوئے اور مسلسل علاج سے مالی حالت بھی خراب تھی۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کی تجویز کی لیکن قاضی صاحب کی جیب خالی تھی اور اس لئے پس و پیش کر رہے تھے۔ مولاناؒ کو علم ہوا تو اصرار کر کے ان کو دہلی کے نرسنگ ہوم میں داخل کرایا اور تمام اخراجات خود برداشت کئے۔

اواخر ۱۹۴۷ء سے تقریباً دو سال تک دہلی میں حضرت مولاناؒ کی کوٹھی پر قیام کیا اسی دوران میں انھوں نے "آثار ابوالکلام" کے نام سے حضرت مولاناؒ کی شخصیت اور ان کے علم و فضل کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا۔

قاضی صاحب مرحوم مولانا آزادؒ کے علم و فضل، ان کی ذہانت و ذکاوت اور ان کی مجتہدانہ بصیرت کے بھی قائل تھے، اور صحافت، سیاست اور ملک کی جنگِ آزادی میں بھی ان کو اپنا قائد و رہنما تسلیم کرتے تھے ان کے نزدیک حضرت مولاناؒ کی حیثیت ایک عظیم ثقافتی رہنما اور وقت کے مجتہد اور مجدّد کی تھی۔ قاضی صاحب مرحوم مدتوں مولانا آزادؒ کی جلوتوں اور خلوتوں میں شریک اور ان کے ہم راز و

۲۷۔ قاضی عبدالغفارؒ

قاضی عبدالغفار مرحوم مراد آباد کے ایک معزز اور صاحبِ ثروت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا حامد علیؒ مراد آباد کے قاضی تھے۔ یہ ان کا خاندانی منصب تھا۔ اسی نسبت سے عبدالغفار مرحوم بھی "قاضی" مشہور تھے بحث۱۸۵۷ء میں برصغیر پاک وہند کے بسنے والوں پر جو ابتلا آئی اس سے یہ خاندان بھی نہ بچا۔ قاضی حامد علیؒ کو ایک مغل شہزادے کو جو کسی طرح بھاگ کر دہلی سے مراد آباد پہنچا تھا، پناہ دینے کے جرم میں سولی پر لٹکا دیا گیا اور مکان و جائداد پر انگریزی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ حالات اعتدال پر آئے تو اس شہید غیرت و اخوت کا قصور معاف ہوا اور جائداد و مکان پر قاضی صاحب کے والد قاضی ابرار احمدؒ کو قبضہ ملا۔ غالبؒ نے شاید آپ ہی کے لئے کہا تھا ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

علمی و ادبی حیثیت سے قاضی عبدالغفار مرحوم کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ اُردو کے ایک نامور اور صاحب طرز ادیب، بے مثال طناز اور نڈر صحافی تھے۔ انھوں نے اپنی سحر طرازیوں سے پورے ایک دَور کو متاثر کیا۔ وہ بڑے کامیاب صحافی اور پُر جوش و مخلص قومی کارکُن تھے۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کے مشہور رسالہ "ہمدرد" کے عملۂ ادارت میں شریک رہ چکے تھے۔ ترکِ موالات اور تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ خلافت کے دَور کے بعد عملی سیاست میں حصہ لینے کی بجائے وہ پوری طرح صحافت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پہلے کلکتہ سے ایک اخبار نکالا پھر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں سے "پیام" اخبار نکالتے رہے۔ بحث۱۹۴۸ء میں وہاں کے حالات بدلے تو پہلے لکھنؤ آگئے اور پھر دہلی آگئے تھے۔ مولوی عبدالحق مرحوم

جب کہ وہ ابھی درسیات سے بھی فارغ نہ ہوئے تھے۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری سے متاثر ہوئے۔ اس وقت مولانا کانپوری علمی دنیا میں خوب متعارف بھی نہ ہوئے تھے۔ جہاں تک میرا خیال ہے "مرقع عالم" ہردوئی ذریعہ تعارف بنا ہوگا۔ مولانا آزادؒ اس کے مستقل قاری تھے، بعد میں انھوں نے اس میں بعض مضامین بھی لکھے۔ اس زمانہ میں "مرقع عالم" کے اڈیٹر حکیم محمد علی کا ناول "عباسیہ" مرقع عالم میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ عباسیہ میں بعض واقعات تاریخی اعتبار سے بے بنیاد تھے۔ اسی پس منظر میں مولانا کانپوری نے اپنی کتاب "البرامکہ" لکھی تھی۔ ممکن ہے اس سلسلے میں کوئی تحریر "مرقع عالم" میں نکلی ہو اور وہی ذریعہ تعارف بن گئی۔

مولانا آزادؒ کے ان کے نام خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا کانپوری کے علم و فضل سے بہت متاثر تھے۔ لیکن یہ تاثر تھوڑے دنوں تک رہا اس کے بعد مولاناؒ کی پوری زندگی میں اس تاثر کا پتہ نہیں چلتا۔

۲۹۔ عبدالغفور احمد

مولوی عبدالغفور احمد ۸ ستمبر ۱۹۰۳ء میں مھسلہ ضلع کلابہ (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے۔ ہرزک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دادا محمد علی ہرزک سابق ریاست جنجیرہ کے صاحبِ علم اور سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے۔ جوانی میں انتقال فرمایا۔ مولوی عبدالغفور احمد کے والد میاں احمد اس وقت ڈیڑھ برس کے تھے۔ والدہ نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ ریاست جنجیرہ میں ایک چھوٹی سی ملازمت سے ترقی کرکے محکمۂ جنگلات کے افسر اعلیٰ ہوگئے تھے۔ اڑتالیس برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مرحوم بڑے ذہین، عقلمند اور ہر دل عزیز شخصیت تھے۔

ہم زبان رہے تھے اور یہ شرف بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا۔

۲۸- مولانا عبدالرزّاق کانپوری

مولانا عبدالرزاق کانپوری اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے آپ کے والد منشی الٰہی بخش اپنے وقت کے مشہور منجّم اور رمّال تھے۔ آباء و اجداد فرخ آباد (یوپی) کے رہنے والے تھے لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد آپ کے والد نے ترک سکونت کر کے کان پور کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔

اُردو کی ابتدائی تعلیم فتحپور ہسوہ ضلع آگرہ میں پائی۔ درسِ نظامیہ کی تحصیل مدرسہ فیض عام کے مشہور مدرس مولانا احمد حسن معقولی اور مدرسہ مسجد رنگیاں سے کی اور حدیث کا کچھ حصہ مولانا محمد علیؒ ناظم اوّل، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے ان کے قیام کان پور کے زمانہ میں پڑھا۔

سنہ ۱۸۸۹ء سے سنہ ۱۸۹۶ء تک کلکٹری کان پور میں ملازم رہے۔ اکتوبر سنہ ۱۸۹۶ء میں میونسپل بورڈ میں سررشتہ دار ہو گئے۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء میں ملازمت چھوڑ کر بھوپال چلے گئے اور تحصیل دار مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں تاریخ اسلام کے منتظم کے عہدہ پر تقرر عمل میں آیا۔

البرامکہ، نظام الملک طوسی، تاریخ ماثر جلالی، تاریخ اسلام، عہد جاہلیت عرب، عہدِ رسالتؐ اور عہد خلافتِ راشدہ آپ کی تصانیف ہیں۔

مولانا کان پوری اس دَور کے مشہور محقّق اور تاریخ دان تھے۔ ۱۰ فروری سنہ ۱۹۴۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنے مطالعہ و تالیف و تصنیف کے بالکل ابتدائی زمانہ میں

ودلولہ پیدا ہوا۔ پھر ترجمان القرآن جلد اوّل و دوم درس قرآن میں عاجز پڑھا کرتا تھا اس سے مولاناؒ کا تبحر علمی اور ان کی عظمت دل پر نقش ہو گئی۔ مولاناؒ کے مضامین کے مجموعے اور دیگر تصانیف بھی پڑھا کرتا تھا۔ ابو سعید بزمیؔ کی کتاب "مولانا ابوالکلام آزادؒ (تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں)" مطالعہ کرنے سے ان کے علم و فضل اور اخلاق و کردار کے بارے میں رائے اور پختہ ہو گئی۔"

۳۰۔ منشی عبدالقیوم خاں خطاط مرادآبادیؒ

منشی صاحب موصوف نے راقم کی درخواست پر ایک خط میں اپنے حالات تحریر فرمائے ہیں اس میں اپنے خاندان کے بارے میں تحریر فرمایا ہے!

"احقر کے خاندان کو کوئی تاریخی حیثیت تو حاصل نہیں۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ روہیل کھنڈ پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد پردادا محب اللہ خاں متوطن ضلع بریلی سے ترک سکونت کر کے ریاست رام پور تشریف لے آئے تھے اور یہاں کوئی مختصر سا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں دادا حبیب اللہ خاں نے سنبھل میں سکونت اختیار کی والد عبدالحمید خاں نے اپنی عمر کا اکثر حصہ مرادآباد میں گزارا۔ علم متقدر میں نہ تھا۔ پیشہ ملازمت تھا۔ فارغ البالی حاصل نہ تھی۔ والدہ البتہ علمی خاندان کی تھیں۔ اپنی خالہ سے (جو حافظہ قرآن تھیں) قرآن مجید اور گلستان پڑھی تھی۔ میں نے بچپن میں گلستان کے بہت سے اشعار گفتگو میں انہی کی زبان سے سُنے۔"

اپنے حالات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں!

"میری حیات کا اولین یوم ۲۸ر نومبر ۱۸۸۶ء تھا ابتدائی تعلیم کچھ باقاعدہ

مولوی عبدالغفور نے مقامی اسکولوں میں اُردو، فارسی، مرہٹی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں محکمۂ مال میں محرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اپنی دیانت داری، فرض شناسی اور حُسنِ اخلاق کی بنا پر ترقی کر کے چند ہی سال میں صیغۂ خزانہ میں میر منشی کے عہدہ پر پہنچ گئے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں اسی عہدہ سے پنشن حاصل کی۔

مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی اصلاح و ترقی کا جذبہ آپ میں شروع سے تھا۔ اسی جذبہ کے تحت سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنے رفقاء کے تعاون سے "بزمِ تعلیم مسلمہ" کی بنیاد ڈالی اور اس کے زیرِ اہتمام آپ کی ادارت میں چار سال تک ایک ماہوار رسالہ "تعلیم" جاری رہا۔

ملک کی تقسیم اور ہندوستان میں سیکولر حکومت کے قیام کے بعد مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو شدّت کے ساتھ محسوس کر کے "جماعت المسلمین" کی تشکیل کی اس کے زیرِ اہتمام "مدرسۂ دینیات" جاری کیا اور چند سال تک مدرسہ کی صدارت اور اہتمام کی ذمہ داریوں کو بحُسن و خوبی انجام دیا۔

مولوی عبدالغفور اپنی متانت و سنجیدگی، بے لوث خدمات اور اخلاص کی بناء پر اپنے علاقہ میں ہر طبقۂ خیال کے مسلمانوں میں یکساں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے تعلق کے بارے میں آپ راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں!

"غالباً حُسنِ عقیدت سنہ ۱۹۲۲ء سے ہوئی جب کہ عاجز طالب علم تھا اور خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ الہلال و البلاغ کے فائل بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا جس سے اسلامی جوش

کاتب یکسر عاری ہے اور جس انشاء نویس قلم کی زبان درکار ہے وہ خامہ ابجد رقم کو کہاں حاصل ملک کے صاحب علم اور اہلِ قلم حضرات اور شعراء نے بہت کچھ تحریر فرمایا اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا" (روزنامہ الجمعیۃ دہلی آزاد نمبر ص ۲۲)۔

آپ کے صاحبزادہ محترم عبدالملک جامعی بی اے تبلیغی جماعت کے ایک پُر جوش مبلّغ ہیں اور ایک مدّت سے مدینہ منوّرہ میں مقیم ہیں۔

۲۱۱۔ محترم عبداللہ بٹ صاحب

عبداللہ بٹ ۱۰ر فروری ۱۹۱۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم الحاج میاں فضل الدّین لاہور میں تجارت کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے ایک معزز خاندان سے آپ کا تعلق ہے۔ اجداد صاحب علم و حکمت گزرے ہیں۔ تعلیم و تدریس اور تجارت جن کے محبوب مشاغل تھے۔ آپ کے نانا مرحوم مولوی سلطان احمدؒ ایک قدیم اہلِ حدیث خاندان کے ممتاز رکن اور جماعت اہلِ حدیث کے صدر تھے۔ وہ ریشم کا کاروبار کرتے تھے اور فارغ اوقات قرآن و حدیث کے درس و تدریس میں صرف کرتے تھے۔

عبداللہ بٹ صاحب ایک سرگرم سوشل ورکر، اور ایک ادیب و صحافی کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ متعدّد بلند پایہ علمی، ادبی اور تاریخی کتب کے مصنّف، مترجم اور مرتّب ہیں۔ ان میں سے ٹیپو شہیدؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، جمال الدّین افغانیؒ، یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ، ابوالکلام آزاد (مجموعہ مضامین) ابوالکلام آزاد (کتابچہ) "نہر سوئز" کے عنوان سے مصر اور مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ حریت، لیونارڈ شت کی کتاب "ہندوستان کی موجودہ حالت"

نہیں ہو سکی۔ قرآن مجید نانا جمال الدین خاں سے اور کچھ انگریزی و فارسی ماموں امام الدین خاں سے پڑھی۔ ۱۹۰۰ء میں ایک اُردو اسکول میں داخل ہو کر اپریل ۱۹۰۵ء میں اُردو مڈل (فرسٹ ڈویژن) پاس کیا۔ ..... ۱۹۰۵ء میں ایک اسکول میں مدرسی اختیار کی ۱۹۰۸ء میں چند ماہ محافظ خانہ کلکٹری میں نقل نویس مقرر ہوا۔ لیکن اپنی نادانی کے باعث مستقل نہ ہو سکا۔ بعدہٗ محکمۂ بندوبست میں کاغذاتِ پٹواری لکھتا رہا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک جدید الشیوع اخبار کے دفتر میں بحیثیت کلرک ملازم ہوا۔ ....

میں نے از خود کتابت کی مشق شروع کر دی تھی باقاعدہ فنِ خطاطی کو کسی استاد سے حاصل نہیں کیا۔ اس لئے خط پختگی اور خوبی سے عاری رہا۔ حُسنِ اتفاق سے مارچ ۱۹۱۵ء میں اخبار مدینہ بجنور کی کتابت کا کام مل گیا۔ یہاں مسلسل کام کرنے سے خط میں کچھ ترقی ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں قرآن مجید ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ جس کی کتابت ہند کے مشہور خوشنویس منشی محمد قاسم صاحب لدھیانوی نے فرمائی۔ اس کا ترجمہ اور فوائد کی کتابت میرے حصہ میں آئی اور دوبارہ بذریعۂ بلاک طبع ہونے کے لئے لکھا ......

اکتوبر ۱۹۳۴ء تا مارچ ۱۹۳۶ء مولانا آزادؒ کی خدمت میں رہ کر ترجمان القرآن جلد ثانی اور ۱۹۴۵ء میں "غبار خاطر" اور ترجمان القرآن جلد اوّل طبع ثانی کی کتابت کی۔"

مولانا آزادؒ کے علم و فضل اور ان کی جامعیت کے بارے میں باین الفاظ کچھ لکھنے سے معذوری ظاہر فرمائی ہے۔

"مولانا ابو الکلام آزادؒ کی عظیم الشان اور جامع کمالات شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے جس علم و استعداد اور اہلیت کی ضرورت ہے اس سے یہ نقال

۳۲۔ حکیم ابوعزیز غلام غوث صاحب

آپ کے اجداد ضلع ڈیرہ غازی خاں کے رہنے والے تھے۔ پھر لواں کوٹ خانپور میں بود و باش اختیار کر لی۔ ارا عین برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد حکیم احمد بخش اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے۔ ۱ر جمادی الاول ۱۳۱۰ھ میں وفات پائی۔ "رضی اللہ الحکیم" (۱۳۱۰) سے تاریخ نکلتی ہے۔[1]

حکیم غلام غوث صاحب ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۸۷۷ء) میں پیدا ہوئے۔ "فخر طبابت" سے آپ کی تاریخ پیدائش نکلتی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور اس کے بعد مولوی احمد یار خاں کے درس میں شریک ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل نہ ہوئی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے ذاتی شوق و مطالعہ سے قابل قدر استعداد بہم پہنچائی اور ریاست خیرپور میں سرکاری طبیب مقرر ہوئے۔

حکیم غلام غوث ایک اچھے طبیب اور علم و ادب کے شائق بھی تھے۔ آپ کے مضامین، نظم و نثر موقتہ رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ متعدد مضامین راقم الحروف کی نظر سے گزرے ہیں۔ حکیم اجمل خاںؒ نے آپ کی طبابت کے بارے میں عمدہ رائے کا اظہار فرمایا ہے۔[2] مشاہیر وقت سے آپ کے تعلقات تھے اور خط و کتابت رہتی تھی۔ "مکاتیب شبلی" حصہ اول میں ایک خط آپ کے نام بھی ہے۔ صاحب تصنیف بھی تھے۔ آپ کی ایک کتاب العائلہ (۱۹۱۴ء) اور دوسری "ماں بچے کا علاج" (۱۹۲۰ء) میں شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے اگرچہ عمر میں بہت بڑے تھے لیکن غایت درجے

---

[1] سلیم التواریخ (قوم ارائین کی تاریخ) مصنفہ صوفی اکبر علی میں ۱۹۶ پر آپ کا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ سطریں اسی سے ماخوذ اور اسی کا خلاصہ ہیں۔ [2] حکیم صاحب کا بھی سلیم التواریخ کے ص ۲۰۳ تا ص ۲۰۷ پر مفصل تذکرہ ہے۔

کا متعدد کتابچوں میں ترجمہ اور مضامین آزادؒ، مقالاتِ آزادؒ، بہت مشہور ہیں۔ مولانا ابوالکلامؒ پر آپ کا مرتبہ مجموعہ مضامین اور کتابچہ" انگریزی زبان میں بھی منتقل ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔

آپ علمی مشاغل کے ساتھ عملی کاموں میں بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں۔ مختلف علمی، ادبی، اصلاحی اور تعلیمی انجمنوں اور اداروں کے سرگرم رُکن رہے ہیں۔ اپنے زمانۂ طالب علمی سے لے کر اب تک متعدد علمی و ادبی رسالوں کو ایڈٹ کیا۔ ان میں بچوں کا ہفت روزہ "ہدایت" انجمن حمایت اسلام کا ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" اور لاہور کے مشہور ہفت روزہ "اقدام" کو برسوں ایڈٹ کیا اور متعدد اخبارات میں مستقل کالم نگار کی حیثیت سے کام کرتے رہے آجکل "حرف و حکایت" کے ایڈیٹر ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ان کا تعلق ذاتی بھی ہے اور خاندانی بھی علمی، ادبی اور مذہبی رشتہ بھی ہے اور سیاسی بھی ــــ پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ان چند عقیدت مندوں میں سے ہیں جنھوں نے ہر حال اور ہر دَور میں اپنی محبّت اور اخلاص کے چراغ جلائے ہیں۔ مولانا مرحوم سے پہلی ملاقات مولانا محمد علی قصوری ایم اے (کینٹب) مرحوم کے توسل سے ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کو آپ سے ایک خاص تعلقِ خاطر تھا اور آپ پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

کے مالک تھے۔ طبقہ علماء میں اپنی متانت و سنجیدگی، تقویٰ اور پرہیزگاری، دینی و سیاسی بصیرت اور اصابتِ رائے، غرضیکہ علم و فضل اور اخلاقی کمالات کے لئے مشہور تھے۔ طبیعت میں انکساری حد درجہ تھی، ان تمام فضائل و کمالات نے انھیں طبقۂ علمار کا محبوب بنادیا تھا۔ حضرت انور شاہ کاشمیری علیہ رحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ "حضرت مفتی صاحب کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے"۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ آپ کا حد درجہ احترام اور آپ کی رائے کی بڑی قدر کرتے تھے حضرت مفتی اعظمؒ بھی حضرت مولاناؒ کی بصیرت و دانائی کے بڑے مدّاح تھے اور ان کی قیادت و رہنمائی پر فخر کرتے تھے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں الہلال کے ذریعے مولانا آزادؒ سے متعارف ہوئے پھر ۱۹۲۰ء سے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور یہ قرب و اتصال ایسا مبارک ثابت ہوا کہ زندگی بھر یہ رشتہ و تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

یکم فروری ۱۹۵۳ء کی شب میں دہلی میں انتقال فرمایا اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے احاطہ کے قریب دفن ہوئے۔

۳۴۔ محمد میاں فاروقی

مولانا محمد میاں فاروقی ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ الہ آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام مولانا ولایت حسین اور دادا کا نام مولانا حکیم محمد حسینؒ تھا۔ حکیم صاحبؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز تھے۔ فارسی کے بہت بڑے فاضل، مصنّف، اپنے وقت کے شیخ طریقت اور حاذق حکیم تھے۔ مولانا ولایت حسینؒ بھی ایک عالم دین اور طبیب کی حیثیت سے

عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا آزادؒ کو آپ کی سادہ دلی۔ نیک نفسی اور عقیدت کی وجہ سے آپ سے تعلّقِ خاطر تھا۔ مولاناؒ نے ان کو احبابِ خاص اور بزرگانِ مخصوص میں شمار کیا ہے۔

۳۳۔ مفتیِ اعظم محمد کفایت اللہؒ شاہجہان پوری ثم الدہلوی

حضرت مفتیِ اعظمؒ کا مولد و منشاء طفولیت شاہجہان پور تھا لیکن عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا۔ آپ کے والد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا سلسلۂ نسب شیخ جمال یمنی سے ملتا ہے۔ اجداد سمندر کے موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ آپ کی قسمت میں علم و فضل کے موتی لٹانا لکھے تھے۔

حضرت مفتی صاحب ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن مالوف میں حاصل کی۔ تکمیل کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ فراغت کے بعد ۱۹۰۳ء میں مدرسۂ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور مفتی مقرر ہوئے۔ مدرسہ کے بانی و مہتمم مولانا امین الدینؒ کے انتقال کے بعد مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری بھی آپ ہی کو سونپ دی گئی۔ ساری عمر اسی درس گاہ میں گزار دی۔ پچاس برس تک مسلسل حدیث شریف کا درس دیا۔ ۲۰ سال تک جمعیۃ العلماء ہند کے صدر رہے ۱۹۳۹ء میں قاہرہ میں مؤتمر اسلامی میں ہندوستان کی قیادت فرمائی۔ ملک کی تحریکِ آزادی کی جد وجہد میں پیش پیش رہے اور قید و بند کے مراحل سے بھی گزرنا پڑا۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بین الاسلامی شخصیت

۳۵۔ مولانا محمد زکریا لدھیانوی ؒ

مولانا محمد زکریا لدھیانوی ؒ کے مورثِ اعلیٰ ان عربی النسل سپاہیوں میں سے تھے جو محمد بن قاسم ؒ کے ساتھ برصغیر پاک ہند میں وارد ہوئے تھے پھر ہمیشہ کے لئے یہیں آباد ہوگئے۔ اس خاندان کے ایک فرد حضرت شاہ عبدالقادر لدھیانوی ؒ اپنے وقت کے سربرآوردۂ علم و فن گزرے ہیں۔ آپ مولانا عبداللہ جے راجپوری (کرنالوی) کے خلیفۂ مجاز تھے۔ حضرت جے راجپوری حضرت شاہ عبدالقادر ابن حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کے خلفاء میں سے تھے۔

مولانا عبدالقادر لدھیانوی ؒ نے ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں حصہ لیا اور دہلی پہنچ کر انگریزوں کے خلاف ایک سخت معرکہ میں حصہ لیا۔ جہادِ حریت میں ناکامی کے بعد یہ خاندان پٹیالہ کے قریب جنگلوں میں روپوش ہوگیا۔ جب ہنگامہ دار و گیر ختم ہوا اور عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ خاندان جس میں ان کے چار بیٹے، بھائی، مستورات اور بچے وغیرہ شامل تھے اپنی جائے پناہ سے نکلا اور عازم لدھیانہ ہوا۔ راستے میں رئیس المجاہدین حضرت شاہ لدھیانوی ؒ کو سفرِ آخرت پیش آگیا۔ یہ زمانہ ٹھیک ۱۸۶۰ء کا تھا۔

آپ کے منجھلے بیٹے کا نام شاہ محمد تھا اور یہی مولانا محمد زکریا مرحوم کے والد ماجد تھے۔ مولانا محمد زکریا ۱۸۷۰ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم متوسط کتب تک اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر کانپور تشریف لے گئے اور حضرت مولانا علامہ احمد حسن کانپوری ؒ کے حلقۂ درس بخاری میں شریک ہوگئے۔ مولانا حسرت موہانی ؒ اور قاری عبدالرحمٰن الہ آبادی آپ کے ہم سبق تھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں تمام علوم دینیہ اور دیگر مروجہ علوم سے فارغ ہوگئے۔ بڑے ہی نیک،

الہ آباد میں کافی شہرت رکھتے تھے۔

مولانا محمدؒ میاں نے ابتدائی تعلیم الہ آباد میں اور درس نظامی کی تکمیل مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ سے کی۔ اس کے بعد جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے۔ جامعہ ازہر سے واپسی پر الہ آباد میں اپنے دادا رحمت اللہ کے نام پر ایک مدرسہ قائم کیا اور سلسلۂ تدریس شروع کیا ساتھ ہی خاندانی پیشہ طبابت کے ذریعہ مخلوق کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

دورِ خلافت سے ملک و قوم کی سیاسی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ سیاسی معاملات میں ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ قوم پرستانہ رہا۔ ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔

مذہب و شریعتِ اسلامیہ اور طریقت میں وہ اگرچہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت اور ان کے خلیفۂ مجاز ہیں لیکن مذہب سیاسی اور شریعت قومی میں وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بیعت اور ان کے مرید ہیں۔ مولانا آزادؒ سے زندگی بھر عقیدت مندانہ تعلق رہا۔ مولاناؒ کے علم و فضل کے مداح، ان کے اخلاقی کمالات کے گرویدہ ... اور ان کے علوم و معارف کے شیفتہ ہیں۔ مولانا آزادؒ کو بھی ان کے اخلاص کے بناء پر تعلقِ خاطر تھا بلکہ ان کے پورے خاندان سے اس کی علمی روایات اور دینی خدمات کی بناء پر ایک تعلق اور لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مولاناؒ نے متعدد بار ان کے مکان پر قیام فرمایا۔

کیا تو تعلّقات کی نوعیت کچھ مضمون نگار اور ایڈیٹر کی ہو گئی۔ پھر انھوں نے "مرقع عالم" کی اشاعت میں بھی دلچسپی لی اور ایک اچھی خاصی تعداد خریداروں کی مہیّا کر دی اس طرح تعلقات میں مزید ایک خصوصیت اور پختگی پیدا ہو گئی جسے دوستانہ تعلقات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تعلّقات ایک خاص دَور اور ایک خاص سلسلے میں پیدا ہوئے تھے اور اس دَور کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔

۳۷۔ حکیم محمُود احمد برکاتی

حکیم محمود احمد برکاتی صاحب ۱۳۴۴ھ میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حکیم محمد احمدؒ (م ۱۳۵۰ھ) تھا۔ آپ کے دادا سید برکات احمدؒ (م ۱۳۴۷ھ) ایک عالمِ دین اور طبیب کی حیثیت سے گزشتہ دَور علم وفن کی ایک مشہور ہستی تھے۔

حکیم محمود احمد برکاتی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، ایک سال جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل و تکمیل دارالعلوم خلیلیہ برکاتیہ (ٹونک) اور دارالعلوم معینیہ عثمانیہ (اجمیر) میں کی اور طب و جراحت کی تعلیم و تربیت طبیہ کالج (دہلی) میں حاصل کی۔

طب، تصوّف، ادب اور تاریخ و کلام ان کے خاص مضامین ہیں۔ تصنیف و تالیف کا خاص ذوق اور سلیقہ ہے۔ چند کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ سرسید کی ایک کتاب "سیرتِ فریدیہ" حال ہی میں موصوف کی ترتیب و حواشی اور ایک مفید اور علمی مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ متعدد کتب زیرِ تصنیف و تالیف ہیں۔

متقی، پرہیزگار اور عابد و زاہد شخص تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور اس کی تلاوت سے عشق تھا۔ نومبر ۱۹۴۳ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور میں انتقال فرمایا۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ان کی پہلی ملاقات اپریل ۱۹۰۵ء میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسۂ سالانہ کے موقع پر لاہور میں ہوئی تھی پھر جب مولانا آزادؒ "وکیل" امرتسر کے ایڈیٹر ہوئے تو تعلقات بہت قریبی ہو گئے اور تقریباً روزانہ ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مولانا آزادؒ کے متعدد خطوط یادگار تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گئے۔

۳۶۔ حکیم محمد علیؒ

حکیم محمد علی ہردوئی سے ایک رسالہ "مرقع عالم" نامی نکالا کرتے تھے۔ یہ ایک علمی، ادبی اور اصلاحی رسالہ تھا۔ اس میں حکیم صاحبؒ کے ناول بھی قسط وار چھپتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کو اردو رسائل سے دلچسپی پیدا ہوئی تو اس رسالہ کو بھی منگوانا شروع کیا۔

حکیم محمد علیؒ ایک ناول نگار کی حیثیت سے اس زمانہ میں بہت مشہور اور ان کے ناول بہت مقبول تھے۔ بعض لوگ تو ان کو شرر پر ترجیح دیتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فنی اعتبار سے حکیم صاحبؒ کے ناول شرر کے ناولوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حکیم صاحب مرحوم شاعر بھی تھے اور طبیب تخلص کرتے تھے۔

مولانا آزادؒ سے ان کے تعلقات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ ابتداً بالکل اس قسم کے تعلقات تھے جیسے کسی قاری اور اخبار یا رسالہ کے ایڈیٹر کے درمیان ہوتے ہیں۔ پھر مولانا آزادؒ اور ان کے بھائی نے خود بھی اس میں لکھنا شروع

بھی حاصل ہے۔ مولانا مرحوم کو بھی ان سے ایک خاص تعلّق خاطر تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جو برکاتی صاحب نے راقم السّطور کے نام مذکورہ خط میں تحریر فرمایا ہے:

"مرزا غالبؔ کے خطوط میں "طالع یار خاں" کا ذکر آتا ہے اس خاندان کے ایک فرد خان بہادر مرزا حامد علی خاں تھے، ٹونک میں نواب کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ تقسیم کے بعد موظّف ہو کر دہلی میں دوبارہ جا بسے تھے اور مولینا آزادؒ کے پاس گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ میرے ترکِ وطن کے بعد مرزا صاحب نے مولینا کو اطلاع دی تو بہت متاسف ہوئے اور بعد از وقت اطلاع کا شکوہ بھی کیا اور فرمایا "بھائی! ہمارے یہاں تو ٹونک اسی خانوادے سے عبارت تھا، ہمیں معلوم ہو جاتا تو ان حضرات کا انتقالِ مکانی ہر قیمت پر رُکواتے۔"

۳۸۔ این محمد اکبر باقوی

محمد اکبر صاحب ۱۹۱۹ء میں جنوبی ہند کے علاقہ شمالی ارکاٹ میں پیدا ہوئے آپ کے والد این عبدالوہاب صاحب علاقہ کے مشہور تاجر تھے اور بلا تفریق مذہب و ملّت ہر طبقۂ خیال میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کے برادرِ حقیقی ایچ ایم این انور صاحب اس علاقہ کی مشہور سیاسی اور ہر دلعزیز شخصیت اور پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔

باقوی صاحب نے اردو انگریزی کی ابتدائی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد بہار کے مشہور دارالعلوم "باقیات الصالحات" سے درس نظامی کی تکمیل کی

حکیم برکاتی صاحب علمی مزاج، حساس قلب اور سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو حسنِ عمل اور صحتِ فکر و عقیدہ کی دولت بخشی ہے۔ ان کا ذوق و وسعتِ مطالعہ اور حسنِ اخلاق و سیرت قابلِ رشک ہے۔

مولانا آزادؒ کے ان کے خاندان سے تعلقات تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کے دادا کا دلچسپ انداز میں تذکرہ آیا ہے۔ فرماتے ہیں!

"ٹونک میں اپنے بہت سے مخصوص احباب ہیں۔ نیز حکیم برکات احمد سے باوجود تو ہب خط و کتابت ہے اور وہ کہتے ہیں کہ" تم ایک گورا قسم کے وہابی ہو" (تبرکاتِ آزاد ص ۱۳)

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے برکاتی صاحب کو شروع سے عقیدت رہی اور اس کی بنیاد علم و نظر ہے نہ کہ حُسنِ ظن محض۔ راقم الحروف کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں!

"برِّ صغیر کی جن شخصیات سے غیر معمولی طور پر متأثر رہا ہوں ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست رہا ہے۔ اس تأثر کا موجب مولاناؒ کا فضل و کمال بھی تھا اور ان کی عظمتِ کردار بھی ...... مولانا آزادؒ اُردو ادب کے محسن تھے، اُردو صحافت کے محسن تھے، مسلمانانِ ہند و پاکستان کے محسن تھے۔ وہ عبقریوں کے سرخیل تھے، قدرت نے بعض صلاحیتیں بڑی فیاضی کے ساتھ انھیں بخشی تھیں۔ تابِ صبر، قوتِ حفظ، قدرتِ اظہار و بیان، زورِ قلم، جرأت، عزم، ثبات، ایثار اور "الکبر مع المتکبّرین" غرض بہت سی خوبیاں تھیں اس زندۂ جاوید ہستی میں۔"

برکاتی صاحب کو مولاناؒ سے خط و کتابت اور متعدد بار ملاقات کا شرف

غرضیکہ نہ صرف حق گوئی ان کا شیوہ رہا بلکہ اس جرم میں سنتِ یوسفیؑ کی تکمیل کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ زبان و قلم پر یکساں عبور حاصل ہے۔ وہ صرف اچھا لکھتے ہی نہیں خوب بولتے بھی ہیں۔

"ضبط کی کوئی انتہا بھی ہے" ایک کتابچہ اور "روحِ آزاد" کے نام سے مولانا آزادؒ پر چند بلند پایہ مقالات کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ آثار تیموری، انتخاب کلیاتِ جرأت، اور مجموعہ مضامین و مقالات، اشاعت کے لئے تیار ہے۔ مطالعہ میر سید علی غم گینؒ، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بچپن سے عقیدت ہے۔ "روحِ آزاد" حضرت مولاناؒ کی خدمت میں ان کا خراجِ عقیدت ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے متعدد بلند پایہ مضامین حضرت مولاناؒ پر شائع ہو چکے ہیں۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کو عصرِ حاضر کا مجدد، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو امام المتقین اور امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو عصرِ حاضر کا واحد خطیب سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود اور مولانا غلام رسول مہر صاحب سے عقیدت رکھتے ہیں۔

خالدی صاحب نے حضرت امام الہندؒ سے وسعتِ نظر و بلندیٔ فکر، حضرت شیخ الاسلامؒ سے قلب و نظر کی پاکی اور حضرت امیر شریعتؒ سے خطابت کا فن سیکھا ہے اور اس لئے علماء کے لئے ان کا وسیع مطالعہ، بوڑھوں کے لئے ان کی پاکباز زندگی اور نوجوانوں کے لئے ان کی خطابت قابلِ رشک ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ اس میں صرف ان کی قوتِ بازو ہی کو دخل نہیں بلکہ معاملہ اللہ کی دین کا بھی ہے۔ ۵

اسی نسبت سے اپنے آپ کو باقوی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اُردو، عربی، فارسی، انگریزی اور تامل زبان میں استعداد بہم پہنچائی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے آپ کو خاص عقیدت ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۴۲ سنہ تک سفر و حضر میں بسا اوقات حضرت مولاناؒ کے ساتھ رہے اور کلکتہ، الہ آباد، بمبئی اور دلّی وغیرہ کے سفر بھی کئے اور مولاناؒ سے صحبت و ملاقات سے فیض حاصل کیا۔ حضرت مولانا آزادؒ کی خواہش تھی موصوف جامعہ ازہر چلے جائیں لیکن گھریلو حالات نے ان کو اجازت نہ دی اور حضرت ممدوح و مرحوم کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔

اپنے وطن مالوف پرنام ٹب (جنوبی ہند) میں مصروف تجارت ہیں اور مقامی معاملاتِ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

۳۹۔ محمد یونس خالدی

محمد یونس خالدی صاحب ۷ محرم الحرام سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء یوم چہار شنبہ کو بارہ بنکیؔ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن لکھنؤ ہے۔

زمانۂ طالب علمی سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ درسی تعلیم کی تکمیل نہ ہو سکی لیکن تعلیم کا مقصود و مطلوب انھیں حاصل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہن رسا اور فکر بلند سے نوازا ہے۔ وسعتِ مطالعہ نے ان کو بہت سے منتہیوں سے بہت آگے بڑھا دیا ہے۔ ملک کی آزادی کی خاطر مصائب برداشت کئے، سختیاں سہیں، جیل کاٹی، دلوں تک روپوش رہنے پر مجبور ہوئے۔

ؔ یوپی۔

کوتوال بھی رہ چکے تھے۔ جواہرلال کے والد پنڈت موتی لال نہرو ۶ مئی ۱۸۶۱ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ آگرہ میں موتی لال نہرو کے بڑے بھائی وکالت کرتے تھے۔ ہائی کورٹ الہ آباد منتقل ہوا تو اس خاندان کو بھی ترک سکونت کرنا پڑی۔ پنڈت موتی لال نہرو ہندوستان کے کامیاب ترین اور نامی گرامی وکلاء میں سے تھے۔

جواہرلال نہرو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ۱۹۰۵ء میں آپ کے والد نے لندن لے جا کر ہیرو کالج میں داخل کرا دیا ۱۹۰۷ء میں کیمبرج میں داخل ہو گئے۔ یہاں تین سال رہ کر سائنس کی ڈگری حاصل کی اور مزید دو سال قیام کر کے قانون کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اس طرح تقریباً سات سال ملک سے باہر رہ کر تکمیل تعلیم کے بعد اواخر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کئی بار کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے۔ ملک کی آزادی کے بعد سے آخر دم تک ہندوستان کے وزیر اعظم رہے۔

پنڈت جواہرلال نہرو ہندوستان کے عظیم فرزند اور بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔ علمی اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کا شمار دنیا کے چند چوٹی کے انگریزی لکھنے والوں میں ہوتا ہے کئی اعلیٰ درجہ کی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے پنڈت موتی لال نہرو سے بہت گہرے تعلقات تھے اور اسی وجہ سے نہرو خاندان میں مولانا آزادؒ کا ایک بزرگ کی طرح احترام اور عزت کی جاتی تھی۔ پنڈت جواہرلال نہرو سے مولانا کو ایک خاص تعلق خاطر تھا ابتداءً پنڈت جی نے مولانا کو اپنے والد کے دوست اور بزرگ کی حیثیت سے دیکھا لیکن رفتہ رفتہ تعلقات نے دوستی کا روپ دھار لیا لیکن جواہرلال کا عقیدت مندانہ تعلق ہر جگہ نمایاں رہا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

۴۰۔ نثار احمد صدیقی

ڈاکٹر حکیم نثار احمد صدیقی صاحب قصبہ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کا پورا خاندان جوشِ ایمانی میں ممتاز اور آزادی کی جدو جہد میں ہمیشہ پیش پیش رہا اور کبھی کسی قسم کی قربانی دینے سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ حکیم صاحب موصوف بھی اپنی دینداری اور سوشل خدمات کی بنا پر پورے علاقے میں عزت و محبت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ سے ہمیشہ عقیدت و محبت کا تعلق رہا، حضرت مولاناؒ بھی آپ پر شفقت فرماتے تھے۔

۴۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴ ر نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے جد امجد راج کول فارسی اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے فرخ سیر نے ان کی شہرت سُنی تو دلی آنے کی دعوت دی چنانچہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ دلی آئے اور منصب و جاگیر سے سرفراز ہوئے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ اس خاندان کو بھی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ پنڈت نہرو کے پردادا نے کمپنی کی حکومت کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور دادا گنگا دھر ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی کے

بند ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوگیا لیکن بیگم حسرتؒ نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور اسٹور کو جاری رکھا۔ گھریلو ذمہ داریوں کے علاوہ سیاست میں بھی حصہ لیتی تھیں ملک کے چھوٹے بڑے ہر معاملہ پر ان کی نظر رہتی تھی ۱۹۱۹ء سے مولانا حسرتؒ کے ساتھ اور جب وہ جیل میں ہوتے تو تنہا کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا جو اسپیشل اجلاس مولانا آزادؒ کی صدارت میں دہلی میں ہوا تھا اس میں بہ نفس نفیس شرکت کی تھی۔ اس زمانہ میں حسرت موہانیؒ سابرمتی جیل (احمد آباد) میں تھے۔ بیگم حسرت موہانیؒ وہ واحد مسلمان خاتون تھیں جو کئی سال تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کی رکن رہیں۔

سیاسی انہماک کے ساتھ مذہبی ذوق وجذبہ بھی قابلِ رشک تھا۔ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب فرنگی محلیؒ سے بیعت تھیں۔ حضرت غوث پاکؒ سے غایت درجہ عقیدت رکھتی تھیں متعدد بار حج کی سعادت سے مشرف ہوئیں۔ عراق کی سیاحت بھی کی تھی اور سفرنامہ بھی شائع کیا تھا۔

مولانا حسرت موہانیؒ سے بے انتہا محبت تھی۔ مولانا حسرتؒ کی زندگی ہی میں ۸ / اپریل ۱۹۳۷ء کو کانپور میں انتقال فرمایا۔

مولانا حسرت موہانیؒ کو ان کے انتقال سے سخت صدمہ ہوا اس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک غزل میں بھی کیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

عاشقی کا حوصلہ بے کار ہے تیرے بغیر　　آرزو کی زندگی بے کار ہے تیرے بغیر

پوری غزل سوز وغم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس سے صرف ان کی محبت ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ حسرتؒ کے کاروبار شوق کی روح، ان کے وجود اور آرزوئے حیات ہی کا دوسرا نام نشاط النساءؒ تھا۔ ان کے انتقال سے حسرتؒ کے

مئی ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا۔

۴۲۔ نشاط النساء بیگم مرحومہ

نشاط النساء بیگم، برصغیر پاک وہند کے مشہور سیاسی رہنما اور نغز گو شاعر مولانا حسرت موہانیؒ کی اہلیہ تھیں۔ ان کے والد کا نام شبیر حسن تھا جو ملتے چور (حیدرآباد دکن) میں ایک کامیاب وکیل تھے۔ شبیر حسن رشتہ میں حسرت موہانیؒ کے ماموں تھے۔ نشاط النساء ۱۳۰۱-۱۳۰۲ھ (مطابق ۱۸۸۵-۸۶ء) میں پیدا ہوئیں۔

بیگم حسرت ایک زمیندار اور صاحب ثروت باپ کی بیٹی تھیں۔ ناز و نعم میں پرورش پائی تھیں لیکن مولانا حسرتؒ کی پُر مصائب و آلام زندگی میں ایسا ساتھ دیا کہ ماں باپ کے گھر کی عیش و عشرت کی زندگی کو پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ مولانا حسرت کی پُر مصائب اور عسرت و تنگی کی زندگی سے نہ کبھی آزردہ خاطر ہوئیں نہ کبھی حرف شکایت زبان پر لائیں۔ ہر طرح کے مصائب سہے، تکلیفیں اُٹھائیں لیکن اپنی عزت اور خودداری پر کبھی حرف نہ آنے دیا۔ ہمیشہ با تمکنت اور پُر وقار رہیں۔ مولانا حسرتؒ کی قید و بند کے زمانہ میں بڑے بڑے ملکی و سیاسی رہنماؤں، جماعتوں اور حسرتؒ کے دوستوں نے امداد کرنی چاہی لیکن ہمیشہ خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور کبھی کسی امداد کو قبول نہ کیا۔

مولانا حسرت موہانیؒ جیل میں ہوتے تو ان کا کلام اخبارات و رسائل میں بھیجتیں ان کے دیوان شائع کراتیں، مقدمات کی پیروی میں حصہ لیتیں۔ جیل میں مولاناؒ کی ضروریات کی معمولی معمولی چیزوں کا خیال رکھتیں۔ مولانا حسرت موہانیؒ نے علی گڑھ میں ایک سودیشی اسٹور کھولا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں گرفتار ہوئے تو اس کے

۴۳۔ نعمت اللہ خاں

نعمت اللہ خاں ابن علی بہادر خاں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ایک خاص عقیدتمند ہیں۔ مولانا مرحوم پر آپ کے متعدد مفید مضامین ہندوستان و پاکستان کے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ دیگر علمی موضوعات پر بھی آپ وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے ہیں اُردو تو ان کی مادری زبان ہے، فارسی کے عالم اور عربی و انگریزی زبانوں سے بھی واقف ہیں۔ ملک کی مشہور شخصیتوں سے علمی روابط ہیں۔

ابتدا میں شعر گوئی کا شوق بھی تھا لیکن بعد میں آپ نے اس مشغلہ کو ترک کر دیا۔ کئی مفید رسائل بھی آپ نے تحریر فرمائے ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

اس وقت آپ کی عمر تقریباً پچھتر برس کی ہے لیکن تصنیف و تالیف اور مطالعہ کا ذوق جوان بلکہ ترقی پذیر ہے۔ چنانچہ آپ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ کوئی بلند پایہ علمی، ادبی اور مذہبی کتاب آپ کے مطالعہ سے نہ رہ جائے۔

آپ کا مطالعہ وسیع، اخلاق بلند اور مزاج شگفتہ ہے۔ اپنے وطن مالوف قصبہ تھووا ضلع باندہ (یوپی) میں مطالعہ و تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔

۴۴۔ یحییٰ اعظمی

یحییٰ اعظمی صاحب ۱۹۰۷ء میں قصبہ مہاراج گنج ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد ضیاء اللہ تھا۔ مولوی صاحب مرحوم قدیم طرز کے مدرس اور اُردو و فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔

یحییٰ صاحب نے مقامی اسکول سے اُردو مڈل پاس کیا۔ فارسی کی تعلیم والد سے

کاروبارِ شوق کی روح بھی مُردہ ہوگئی اور آرزوئے حیات کی گرم بازاری بھی سرد پڑ گئی۔

ملک کے تمام چوٹی کے لیڈروں سے ان کے تعلقات تھے اکثر سے خط و کتابت تھی۔ مولانا محمدؒ علی جوہرؒ اور مولانا ابوالکلامؒ کے نام ان کے خطوط موجود ہیں۔ مولانا آزادؒ کا خط ان کے نام ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

ابو الکلام کان اللہ لہٗ

دہلی ۲/ جون ۱۹۵۸ء

گوشہ گیری ان کی طینت ہے اور شہرت طلبی اور نام و نمائش ان کی فطرت کے خلاف ہے اور انھوں نے اس کی کوشش بھی نہیں کی لیکن ان کا موثر اور دلنشین کلام ان کے لئے شہرت و تعارف کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اب علمی و ادبی دنیا کی وہ ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں احساس کی تسکین، روح کی تشفی اور قلب کے انبساط کے لئے کہتے ہیں۔ ان کا اپنے بارے میں یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔

"میرے آہنگ قلم اور میری نوائے فطرت میں کوئی تضاد نہیں۔ دوسرے الفاظ میں جو میرا ادب ہے وہی میری زندگی اور جو میری زندگی ہے وہی میرا ادب ہے۔"

یحییٰ صاحب کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے دوسرا مجموعہ "نوائے عصر" کے نام سے ملک کے عصری رجحانات و مسائل اور قوم کی تعمیر و ترقی سے متعلق منتخب منظومات پر مشتمل ہے اور مرتب ہو چکا ہے۔

مولانا ابو الکلام آزادؒ سے ان کو غالباً ۱۹۳۰ء سے عقیدت ہے۔ یحییٰ صاحب فرماتے ہیں:

"امام الہند مولانا آزاد نور اللہ مرقدہٗ سے ایک مدت سے مجھے قلبی شغف اور عقیدت ہے اس کے اظہار سے قلم عاجز ہے حضرت مولاناؒ نے بھی اپنے دورِ حیات میں اس ناچیز کی جو قدر افزائی فرمائی ہے اس کے تشکر کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔"

یحییٰ اعظمی صاحب نے مولانا مرحوم کی حیات میں بھی ان کے مقام بلند، علم و فضل اور ان کی عظیم شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ان کے وفات کے بعد بھی ان کی علمی، ادبی، سیاسی اور دینی خدمات کا اعتراف اور اظہار

حاصل کی۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کی طرف طبیعت کا میلان تھا۔ آپ کے والد کو شعری ذوق و شوق کا پتہ چلا تو زجر و تنبیہ کی بجائے اس ذوق کی تربیت فرمائی۔ ۲۰-۱۹۲۱ء میں جب کہ تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون شباب پر تھی حالات سے متاثر ہوتے اور ان کے فطری مذاق ادب نے قومی و ملّی شاعری کا رنگ اختیار کیا۔

جون ۱۹۲۵ء میں دار المصنّفین سے وابستہ ہوئے اور یہ تعلّق آج تک قائم ہے۔ اسی زمانہ میں انٹرنس کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ دار المصنّفین کے قیام نے آپ کی قومی و ملّی شاعری کے رنگ کو اور بھی نکھار دیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فیضِ نظر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ کا پہلا مجموعہ کلام "نوائے حیات" کے نام سے شائع ہوا تو سید صاحبؒ نے اس پر ایک زوردار اور عالمانہ مقدّمہ تحریر فرمایا۔

یحییٰ صاحب کا ذوق شعر و ادب علّامہ شبلیؒ اور اقبال احمد سہیل سے متاثر ہے۔ مذہبی مسلک اور عقائد میں مولانا حسین احمد مدنی علیہ رحمہ کے معتقد اور سیاسی نظریات میں امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ کے پیرو ہیں۔

یحییٰ صاحب کے شاعرانہ کمال کا اندازہ مولانا آزادؒ کے اس فرمودہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"کچھ لوگ شاعری کرتے ہیں اور کچھ لوگ شاعر ہوتے ہیں۔ صائب نے پہلی صنف کی نسبت کہا تھا "شعر گفتن چہ ضرور؟" اور بالکل صحیح کہا تھا لیکن دوسری صنف کے لئے شعر گفتن نہ صرف ضروری ہوتا ہے بلکہ ناگزیر ہوتا ہے ایسے ہی لوگوں میں یحییٰ اعظمی صاحب ہیں۔ ان کی طبیعت شاعرانہ واقع ہوئی ہے اس لئے جو کچھ کہتے ہیں مؤثر اور دلنشین ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا کلام عام طور پر مقبول ہوگا۔

اشاریہ

عقیدت کیا ہے۔ حضرت مولانا سے متعلق ان کی نظموں کے ایک ایک شعر سے مولانا سے ان کی دلی عقیدت اور اخلاص و محبت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے شاعرانہ انداز میں مولانا کی عظمت کا اعتراف اور مولانا کی وفات پر دل گداز مرثیے نہیں لکھے ہیں بلکہ خونِ دل کی سرخی سے اخلاص و محبت کے نقش ونگار بنائے ہیں اور کاغذ کے صفحات پر دل کے ٹکڑوں سے عقیدت کا محل تعمیر کیا ہے۔

کتبہ محمد یعقوب بلوچ ۱۹۶۵ء

اعلام

ادارے اور تحریکیں

بلاد و اماکن

کتب و رسائل